سن ستّاون کی دلّی

اور

بہادر شاہ ظفر

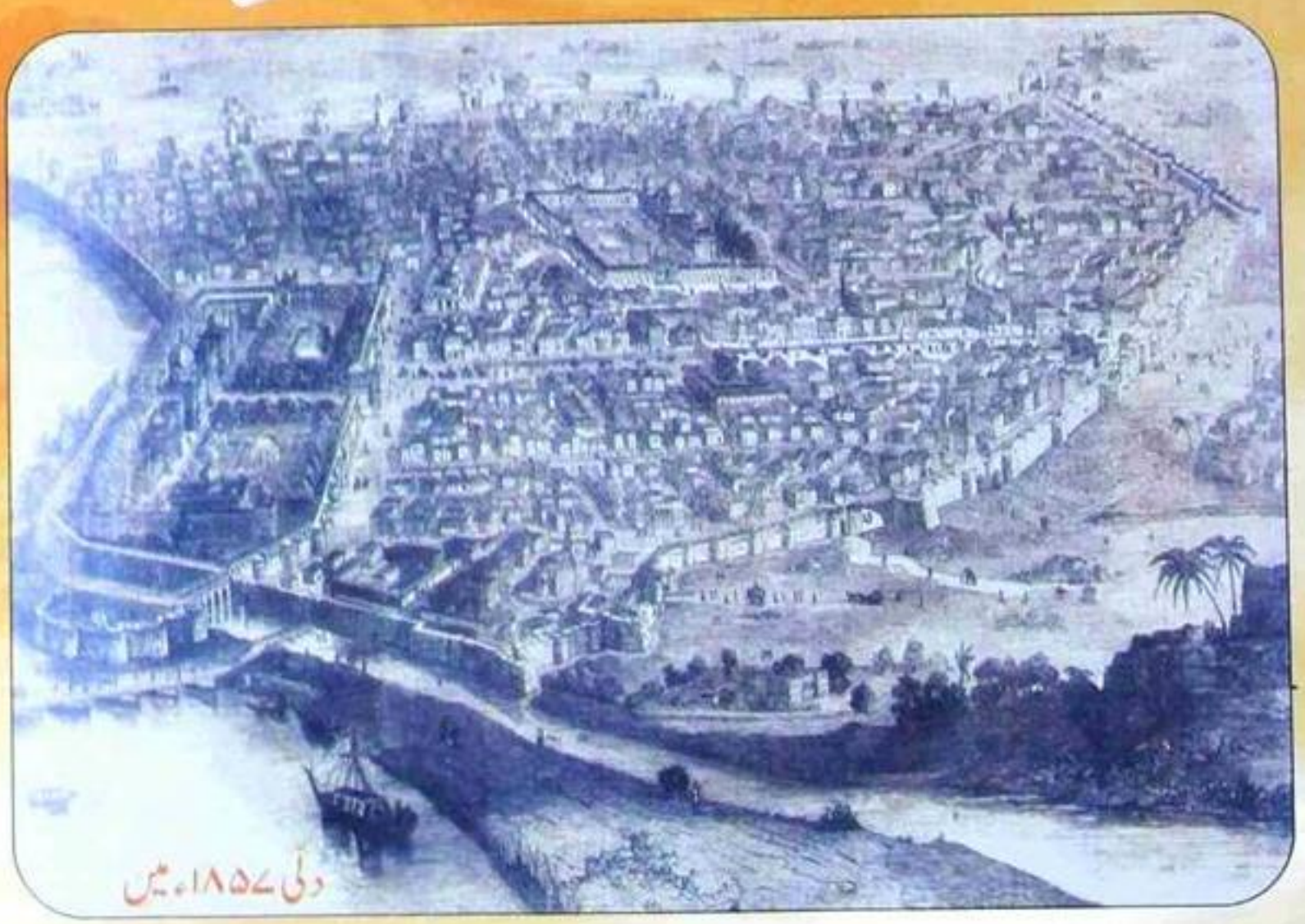

دلی ۱۸۵۷ء میں

مرتّب

اسلم پرویز

سن ستّاون کی دلّی
اور
بہادر شاہ ظفر

مرتّب
اسلم پرویز

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۷۶

© انجمن ترقی اردو (ہند)

سنہِ اشاعت : ۲۰۰۸ء
قیمت : ۱۵۰/ روپے
کمپوزنگ : عبدالرشید
بہ اہتمام : اختر زماں
طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

SAN SATTAWAN KI DILLI
AUR
BAHADUR SHAH ZAFAR

Edited by:
Aslam Parvez

2008
Price : 150/-

ISBN-7160-142-1

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU GHAR, 212-ROUSE AVENUE, NEW DELHI-2
Contact: 23237210, 23236299, Fax: 23239547
http\\www.anjuman-taraqqi-urdu-hind.com
E-mail: anjuman.urdughar@gmail.com

فہرست

حرفِ آغاز	خلیق انجم	۵
دیباچہ	اڈیٹر	۷
بغاوت اور وفاداری ویر بھارت تلواڑ، ہندی سے اردو:	عبدالرشید	۱۷
اسبابِ سرکشیِ ہند	مسلم ضیائی	۷۵
مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا کردار	ظفر احمد صدیقی	۸۷
بہادر شاہ ظفر اور اٹھارہ سو ستاون	اسلم پرویز	۹۵
محاصرۂ دہلی کے خطوط (عکس)	ترجمہ: خواجہ حسن نظامی	۱۳۱
سن ستاون کی دلّی	تبسم کاشمیری	۱۸۳
'داستانِ غدر' کے چند ورق	ظہیر دہلوی	۲۳۷
دلّی کی بربادی کا نوحہ ('فغانِ دہلی' کے چند ورق)	مرتبہ: مرزا قربان علی بیگ	۲۴۷
۱۸۵۷ء کی کہانی بڑے بوڑھوں کی زبانی	آغا حیدر حسن دہلوی	۲۶۳
بخت خاں	نثار احمد فاروقی	۲۷۷
۱۸۵۷ء	غلام رسول مہر	۲۸۷
متفرقات	قاضی عبدالودود	۲۹۵
پیش لفظ (جنگِ آزادی کی تاریخ)	ابوالکلام آزاد	۲۹۹
۱۸۵۷ء کی ادبی اہمیت	محمد حسن	۳۰۳
قومی جدوجہد کے ڈھائی سو سال	اسرار احمد آزاد	۳۱۷
کتابیات (۱۸۵۷ء سے متعلق اردو، انگریزی، ہندی کتابیں)		۳۳۵

حرفِ آغاز

۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں وہ ہنگامہ برپا ہوا جو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ نادر شاہ نے دہلی میں وہ قتل و غارت گری کی تھی، جس کی اس سے پہلے تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں برطانوی حکمرانوں نے بھی اتنے بڑے پیمانے پر تباہی و بربادی کی جو ہندوستان کی تاریخ کا ایک اندوہ ناک باب ہے، ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ نادر شاہ کے ظلم و ستم سے کہیں زیادہ تھا۔

۲۰۰۷ء کا سال ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کی ایک سو پچاسویں سالگرہ کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ اس تعلق سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے، سلطنتِ مغلیہ کے زوال، شہر شہر تباہی و بربادی، برطانوی حکومت کے ظلم و ستم کی داستانوں سے متعلق بڑے پیمانے پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے معزول ہونے سے متعلق مختلف زمانوں میں متعدد کتابوں اور رسالوں کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس سلسلے میں مختلف قسم کے ایسے کلچرل پروگرام بھی منعقد کیے جاتے رہے ہیں۔ جن سے برطانوی حکومت کے ظلم و ستم کو نمایاں کیا گیا ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) چوں کہ ایک ایسا ملک گیر ادارہ ہے جو اردو کے لسانی، ادبی، تہذیبی اور سماجی معاملات و مسائل سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ انجمن بھی ان یادگاری تقاریب میں اپنے انداز سے شریک ہو۔ اسی کے نتیجے میں زیرِ نظر کتاب 'سن ۵۷ء کی دلّی اور بہادر شاہ ظفر' آپ کے سامنے ہے۔ کتاب کا یہ عنوان طے کرتے ہوئے ہمارے پیشِ نظر دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ کتاب میں جن مسائل سے گفتگو کی جائے، اُن کا تعلق زیادہ تر دلّی تک محدود رکھا جائے، جس میں دلّی میں باغی فوج کی آمد سے لے کر سقوطِ دہلی کے معاملات، آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی معزولی اور دلّی پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد اس عظیم شہر کی تباہی و بربادی کا جائزہ لیا جائے۔ ہمارے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کتاب باوجود بہت سے

مشترکہ مواد کے اس نہج پر ہو کہ یہ اس موضوع پر تیار ہونے والی ایسی بہت سی کتابوں سے مختلف ہو، جن میں یکسانیت اور تکرارِ مضامین کی صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہو۔

زیرِ نظر کتاب میں غیر مطبوعہ مضامین تو کم ہی ہیں لیکن جو مطبوعہ مضامین اس میں شامل ہیں، اُن کے انتخاب اور ترتیب میں حتی الامکان سلیقے اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ کتاب کا جو عنوان قائم کیا جائے اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کتاب کے مشمولات سے اس کا معقول جواز پیدا ہو سکے۔ یہاں بالخصوص کتاب میں شامل ایک مضمون 'بغاوت اور وفاداری' کا ذکر ضروری ہے۔ اس مضمون کے مصنف پروفیسر اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئر پرسن ڈاکٹر ویر بھارت تلواڑ ہیں۔ یہ مضمون ہندی اور اردو میں لگ بھگ ساتھ ساتھ ہی شائع ہو رہا ہے۔ ویر بھارت تلواڑ صاحب نے سرسیّد کے رسالے 'اسبابِ بغاوت ہند' کا ایک بڑے ہی اچھوتے زاویے سے بھرپور محاکمہ کیا ہے۔ 'اسبابِ بغاوت ہند' پر ایسا بھرپور، متوازن، جامع اور دوٹوک تجزیہ اردو یا ہندی اور شاید انگریزی میں بھی کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔

تلواڑ صاحب کے اس مضمون کے ساتھ جو دوسرے اور مضامین بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں ان کے ذریعے ہم دراصل اپنے قارئین تک یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کرنے والوں کے علاوہ سرسیّد احمد خاں جیسے عالموں، دانش وروں اور شاعروں اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کا ایک طبقہ وہ بھی تھا جس نے چاہے بظاہر اس بغاوت کی مذمّت نہ کی ہو لیکن انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی باشندوں کی سماجی اور تہذیبی زندگی جس طرح تہ و بالا ہوئی اس کا درد کہیں بالواسطہ اور بلاواسطہ انھیں بھی تھا۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح یہ بغاوت انگریزوں کے خلاف ہر ہندوستانی کی بغاوت تھی ورنہ مثال کے طور پر دلی کی بربادی پر انگریزوں کے 'بہی خواہ' غالبؔ 'دستنبو' میں خون کے آنسو کیوں روتے۔

اس کتاب کے مرتّب ڈاکٹر اسلم پرویز کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی کتاب 'بہادر شاہ ظفر' انجمن سے اکیس برس پہلے شائع ہوئی تھی، اس کی شہرت آج بھی دور دور تک ہے۔ یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ زیرِ نظر کتاب ''سن ستاون کی دلّی اور بہادر شاہ ظفرؔ'' کی پذیرائی بھی خاطر خواہ ہوگی۔

(خلیق انجم)

دیباچہ

1857 کے دور کے برٹش حکمرانوں نے تو 1857 کی شورش کو ہماری زبان میں 'غدر' اور اپنی زبان میں Sepoy Mutiny کا نام دیا ہے لیکن ہندستانیوں کے نزدیک 1857 برطانوی نوآبادیاتی طاقت کے خلاف ہندتان کی پہلی جنگِ آزادی کا دوسرا نام ہے جو دراصل ناکام رہی۔

شاہ عالم ثانی (بہادر شاہ ظفر کے دادا) اور اکبر شاہ ثانی (بہادر شاہ ظفر کے والد) کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک یہ تین مغل بادشاہ اس تاریخی جبر کا شکار تھے جس کا نقطۂ عروج بہادر شاہ ظفر ثابت ہوئے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ شاہ عالم ثانی ایک معذور کی سی اور اکبر شاہ ثانی ایک مجبورِ محض کی سی زندگی گزار کر رخصت ہوئے جب کہ ظفر طوفان میں گھری ہوئی اس شکستہ کشتی کے مسافر تھے جس کے پرخچے اڑ چکے تھے اور اب اس کشتی کا مسافر یعنی بہادر شاہ ظفر طوفان میں ہچکولے کھاتا کبھی طوفانی موجوں کی ایال پکڑ کر ان پر سوار ہونے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی سانس پھول جانے اور دم گھٹ جانے کی کیفیت سے باہر آنے کے لیے ان لہروں کے وجود سے ذہنی طور پر فرار حاصل کرتا اور کبھی بالآخران کی طرف اپنے نحیف ونزار چہرے پر لہراتی ہوئی سفید ریشِ دراز کا پرچمِ صلح ان کے سامنے لہراتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تماشے میں سارا کھیل تاریخی جبر کے اس نقطۂ عروج کا تھا جس کی نوک پر ظفر کی شخصیت رقص کر رہی تھی گویا بقول غالبؔ وہ اس کیفیت سے گزر رہے تھے:

برنگِ شعلہ می رقصم بہ آتش بسانِ موج می بالم بہ طوفاں

ایسے میں بہادر شاہ ظفر کو غدار سمجھنا ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی، ان پر ترس کھانا بھی ان کے ساتھ ایک ظالمانہ ہمدردی ہوگی۔ دراصل ان کی شخصیت ایک تعلقِ خاطر یعنی (Empathy) کے جذبے کے ساتھ دیکھے جانے کی متقاضی ہے۔

بہادر شاہ ظفر چاہے اپنے آپ میں ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک نہ ہوں لیکن وہ جس تاریخی جبر کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے اس نے خود بخود انھیں ایک غیر معمولی شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔ اس شخصیت کا ایک داخلی اور دوسرا خارجی وجود تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی داخلی شخصیت بھی علاحدہ علاحدہ دو وجودوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک ہندوستان کے شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی وہ شخصیت جو شاہ عالم ثانی کے انگریزوں کا پنشن خوار ہونے کے بعد سے خود اپنے زمانۂ ولی عہدی تک اس کتھارسس کو اپنے وجود کے اندر جذب کرتی چلی آرہی تھی جو ان کے دادا اور باپ کا مقدر بن چکا تھا اور جو خود ان کا بھی مقدر تھا۔ اس کتھارسس کے ساتھ وہ اپنی شاعری کے ایک معتد بہ حصے میں نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال
وہ فرنگی زادِ کلکتہ جو سیکھا ناپنا

ان روزوں اس گلی میں جاسوس جابجا ہیں
کہہ دو کوئی ظفرؔ سے واں آج کل نہ جاوے

جہاں میں اور تو ڑ ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفرؔ رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے
تو کیوں پہلو میں کانٹے گل کے ہوتے

کھول دے صیاد تو کھڑکی قفس کی شوق سے
بلبلِ بے بال و پَر ظالم کدھر اڑ جائے گی

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

بہادر شاہ ظفرؔ کا دوسرا داخلی وجود وہ تھا جو ان کی چہیتی نوعمر بیگم نواب زینت محل کے جن کے قبضے میں تھا، داخلی سطح پر اور لاشعوری طور پر اس جن کے ساتھ بھی وہ نبرد آزما تو تھے مگر المیہ یہ تھا کہ یہ نبرد آزمائی حریفانہ نہیں حلیفانہ خطوط پر جاری تھی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کا خارجی وجود مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے راگ رنگ میں ڈوبی ہوئی ان کی وہ شخصیت تھی جسے لال قلعے کی پنشن یافتہ فرصت کی زندگی نے انھیں (ماسوا اکبر) اپنے پیش رووں سے بھی کچھ زیادہ ہی جلا بخش دی تھی ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ ہندوستان کی باغی فوج کے لیے ہندوستان کا دوسرا نام بہادر شاہ ظفرؔ کی شخصیت بن گئی تھی جس کے بینر (Banner) تلے وہ انگریزوں کے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ تو یہ وہ سہ رخی جنگ تھی جس میں بہادر شاہ ظفرؔ ہمیں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے 1857 کی حشر خیزیوں کا سب سے بڑا جھکولا تو ظفرؔ ہی کے حصے میں آیا۔ چناں چہ ان حالات میں انھوں نے کبھی بہادری کے پینترے بدل بدل کر وار کیے تو کبھی بزدلی کی نفسیات اور کبھی مصالحت کی مصلحتوں کے سہارے وار روکنے کی بھی کوشش کی۔ وار کرنے کا عمل ان کے ساتھ کم اور روکنے کا زیادہ رہا۔ ایسی صورت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ 1857 کے ڈرامے کے اس کردار کو ہمارے فکشن کے نقاد ہیرو قرار دیں گے یا اینٹی ہیرو۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ جس ڈرامے میں اینٹی ہیرو ہوتا ہے اس کا کوئی ہیرو سرے سے ہوتا ہی نہیں اس لیے تماشائی اس اینٹی ہیرو ہی کو ہیرو مانتے ہوئے چلتے ہیں۔ اس اعتبار سے 1857 کی جنگِ آزادی کے بڑے سے بڑے جیالے سے پہلے اگر بہادر شاہ ظفرؔ کا نہیں تو کس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ شہر کے تاراج ہونے کے بعد قلعے سے فرار ہو کر ہمایوں کے مقبرے میں روپوش ہونا ایک حکمت عملی بھی تو ہو سکتا ہے اور اس حکمتِ عملی کو آج ہم برناڈ شا کے مشہور پلے ARMS AND THE MAN کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن اُس تاریخی جبر کا کیا کیا جائے جس کا ہرکارہ مرزا الٰہی بخش کے روپ میں وہاں پہنچ کر اس حکمتِ عملی کو ناکام بنا دیتا ہے۔ چناں چہ مرزا الٰہی بخش کی جوابی حکمتِ عملی بہادر شاہ ظفرؔ کے ساتھ وہ کر گئی جو لال قلعے پر برستے ہوئے انگریز کی توپوں کے گولے نہ کر سکے تھے۔ اور اس طرح (انگریزوں کا باغی؟) مغل شہنشاہ انگریزوں کے ہاتھوں غداری کا موردِ الزام قرار دیا گیا۔۔۔۔۔ 'چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد'۔ پھر انگریزوں کے نہیں بلکہ تاریخی جبر کے اس باغی کو ایسی سزا دی گئی جو 1857 کے بڑے سے بڑے باغی کو بھی نہیں ملی تھی۔ اسے دوسرے تمام باغیوں کی طرح گولی سے اڑا کر یا سولی پر چڑھا کر ایک آن میں زندگی کی قید سے آزاد ہونے کا موقع نہیں فراہم کیا گیا بلکہ ملک بدر کر کے جلاوطنی کی کرب ناک زندگی گزارنے کے لیے لے جا کر رنگون کی اجنبی سرزمین پر ڈال دیا گیا:

عدو زندہ سر گشتہ پیرا منت بہ از خونِ او گشتہ بر گردنت

گویا بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد ان کی جان، اس قدر کی پاس داری میں نہیں بخشی گئی کہ ہم دشمن کے قتل کا بھی گناہ اپنی گردن پر کیوں لیں بلکہ انھیں اس لیے زندہ رہنے دیا گیا کہ انگریز بہادر شاہ ظفر کو اپنے ہندوستان، اپنی دلّی اور اپنے لال قلعے سے دور بہت دور رنگون میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے اور ایسا ہی ہوا بھی۔

اٹھارہ سو ستاون کے بعض مورخین کے نزدیک 1857 کی دہلی ایک سلطنت کے زوال کا دوسرا نام ہے لیکن آج ہمارے لیے 1857 کی دہلی پانی پت کا وہ میدان ہے جہاں بہادر شاہ ظفر کے بینر تلے آزادی اور انقلاب کی پہلی (ناکام) جنگ لڑی گئی جس کے ٹھیک نوّے سال بعد اس سے اگلی نسلوں کے ایک فرزند جواہر لال نہرو نے اسی لال قلعے پر بالآخر ہندوستان کی مکمل آزادی کا جھنڈا لہرایا۔

O

اکبر شاہ ثانی کے گیارہ لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں۔ ظفر ان میں سب سے بڑے تھے۔ ظفر سے چھوٹے مرزا بابر اور ان سے چھوٹے مرزا جہاں گیر تھے جن کو اکبر شاہ ثانی ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنا ولی عہد اور جانشیں اس شہزادے کو مقرر کرتے تھے جسے وہ اس کا اہل سمجھتے تھے یا جسے وہ پسند کرتے تھے۔ کسی شہزادے کا محض فرزندِ اکبر ہونا ولی عہدی کی ضمانت نہیں تھا۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے سے جب مغل بادشاہ انگریزوں کے پنشن خوار ہو گئے تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اکبر شاہ ثانی سے ولی عہدی کے انتخاب کا حق بھی چھین لیا۔ چناں چہ اکبر شاہ ثانی کی ایک بیگم ممتاز محل نے، جو مرزا جہاں گیر کی والدہ تھیں، جب مرزا جہاں گیر کو ولی عہد نامزد کرانے کی کوشش کی تو انگریزوں نے ان کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے فرزندِ اکبر مرزا ابو ظفر ہی کو ولی عہدی کا مستحق سمجھتے تھے اور بالآخر وہی ولی عہد نامزد ہوئے۔

بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کا انتقال ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء کو ہوا اور اسی کے ساتھ بہادر شاہ ظفر تخت نشیں ہوئے۔

1857 میں جو خلفشار بپا ہوا اس نے نہ صرف بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا بلکہ پوری مغل سلطنت ہی کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر کی مدت بادشاہت صرف بیس سال رہی۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں لال قلعے کا جو تہذیبی رنگ روپ تھا، جو معمولات شاہی تھے، قلعے کے جو محکمے تے، جو سلسلۂ داد و دہش تھا، جو ٹھاٹ باٹ تھے اس پر لاتعداد مرقعے تالیف ہو چکے ہیں لہٰذا اس تفصیل میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے مغلوں کی ان شاہی رواداریوں کو جو ایک گنگا جمنی مزاج کی حامل تھیں سخت مالی دشواریوں سے گزرتے ہوئے بھی نبھایا۔ انھیں کمپنی کی طرف سے صرف ایک لاکھ روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی جس میں سے ان کی طرف سے مغلیہ خاندان کے ان افراد کے وظیفے بھی مقرر تھے جو لال قلعے کے مکین تھے۔ اس کے علاوہ درباداری کا تزک و احتشام اور شاہی ٹھاٹ باٹ علاحدہ۔ چناں چہ ان

اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھیں طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔ شہر کے مہاجنوں سے قرض لینا، ذاتی اراضیوں کو فرخت کرنا یا رہن رکھنا وغیرہ۔

جب انگریزوں نے شاہ عالم ثانی کو کمپنی کا پنشن خوار بنا کر لال قلعے میں بٹھایا تو گویا انھیں جہاں بانی کے بکھیڑوں سے آزاد کر دیا تھا یا یہ کہیے کہ ایک طرح سے بے دخل کر دیا تھا۔ اب انھیں لال قلعے کی زیبائشی سپاہ کے علاوہ کسی فوجی انتظام وانصرام کی بھی ضرورت نہ رہی تھی اور نہ ان کے مالی وسائل میں اس طرح کے اخراجات اٹھانے کی کوئی طاقت ہی تھی۔ جہاں بانی کے بکھیڑوں سے بے دخلی کی وراثت شاہ عالم سے اکبر شاہ ثانی کو اور پھر بالآخر ظفر کو منتقل ہوئی۔ چناں چہ بہادر شاہ ظفر کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ مغل حکومت کی بقا کے خواب تو دیکھ سکتے تھے لیکن وقت پڑنے پر بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی ان کے پاس اس کی حفاظت اور دفاع کا کوئی معقول سامان نہیں تھا، نہ قوت ارادی کی سطح پر اور مالی حیثیت سے۔

بہادر شاہ ظفر کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے اور یہ اعزاز پوری تحریک میں صرف انھی کے حصے میں آیا کہ ایسے حالات میں جب انگریز ساحل بنگال سے حشر برپا کرتے ہوئے جمنا پار کر کے دہلی تک پہنچ گئے تھے اور اس وقت گویا وہ شہنشاہِ دہلی کے حلق میں انگلیاں ڈالے کھڑے تھے تو بھی میرٹھ کی باغی فوج ۱۱ر مئی 1857 کو لال قلعے کی دیوار کے نیچے بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بقول ظہیر دہلوی (داستان غدر) یہی کہتی ہوئی جمع ہوئی:

> ''حضور بادشاہ سلامت آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں، آپ کو حق تعالیٰ نے بائیس صوبوں کا مالک کیا ہے، تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرماں بردار ہے، ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت میں شمار ہوتی ہے، ہم لوگ آپ کے پاس فریادی ہیں، امیدوارِ انصاف ہیں''۔

لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ جہاں بانی کی ڈور تو ان کے ہاتھ سے کب کی ان کے دادا شاہ عالم ثانی کے زمانے ہی سے چھوٹ چکی تھی ان کے پاس ملکی دفاع کے انتظام وانصرام کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لامحالہ بقول ظہیر دہلوی ان کا پہلا ردعمل اس یورش پر یہی ہونا تھا:

> ''میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا، میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کروں گا، میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھوں گا، میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں مجھ سے کسی طرح توقع استطاعت کی نہ رکھو''۔

O

1857 کے ہنگامے کی ابتدا تو دراصل 26 فروری 1857 کے آس پاس اس وقت ہو چکی تھی جب بیرک پور کی 19 نمبر پلٹن نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 26 مارچ 1857 کو منگل پانڈے کے خون میں جوش آیا اور اس نے میجر ہڈسن کو اور اس کے ساتھ ہی لفٹننٹ واگھ کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ اپریل کے مہینے میں میرٹھ، انبالہ اور لکھنؤ میں بہت سے انگریزوں کے مکان جلا دیے گئے۔ 6 مئی کو میرٹھ میں پھر نوے سپاہیوں کو آزمائش کے طور پر چربی والے کارتوس دیے گئے۔ پچاس سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال

کرنے سے انکار کر دیا جس پر ان کا کورٹ مارشل ہوا۔ اس پر 10 مئی کو میرٹھ میں ہنگامہ برپا ہو گیا، جیل کی دیواریں گرا دی گئیں اور ہندو مسلم سپاہ انگریزوں کا خاتمہ کرنے پر تل گئیں۔ 10 مئی کی رات ہی میرٹھ کے سپاہی علم بغاوت بلند کرتے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور 11 مئی 1857 کو پیر کے روز آٹھ بجے صبح یہ لوگ نعرے لگاتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے۔ 22 فروری سے 11 مئی تک تقریباً ڈھائی مہینے ملک کے مختلف مقامات میں جن میں 11 مئی کے بعد سے دہلی بھی شامل تھی، فوجی بدنظمی اور انگریزوں کے کشت وخون کی وارداتیں ہوتی رہیں لیکن بہادر شاہ ان معاملات سے یا تو بے خبر رہے یا زیادہ باخبر نہیں تھے۔

11 مئی 1857 سے 14 ستمبر 1857 تک جنرل بخت خاں کی قیادت میں دہلی میں انگریزوں سے مقابلہ جاری رہا۔ اس دوران انگریزوں کے جاسوسوں کا جال شہر اور لال قلعے میں پوری طرح پھیل چکا تھا۔ آخر کار 14 ستمبر 1857 کو انگریزوں کی فوجیں دہلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئیں، 19 ستمبر ہفتے کے روز بادشاہ نے بھی قلعہ چھوڑ دیا اور ضعیف العمر بادشاہ اپنی بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ نظام الدین چلے گئے۔ تین روز تک بہادر شاہ ظفر اور ان کا خاندان بے سروسامانی کی حالت میں ہمایوں کے مقبرے میں روپوش رہے۔ بخت خاں، بادشاہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ دہلی ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھی یہ جنگ بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے تلے جاری رکھی جا سکے۔ دوسری طرف انگریز، بادشاہ کے دہلی سے فرار ہونے کے خطرے کے پیش نظر بادشاہ کو جلد سے جلد گرفتار کر لینا چاہتے تھے، انھیں ڈر تھا کہ اگر بادشاہ فرار ہو گئے تو وہ اس ہندوستان گیر تحریک کا مرکز بنے رہیں گے۔ دوسری طرف انگریزوں کے وفادار اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ بادشاہ کو گرفتار کرا کے وہ انگریزوں کے حلقۂ مقربین میں داخل ہو جائیں اور بڑے بڑے انعام اور اعزاز پائیں چناں چہ اس طرح مرزا الٰہی بخش کی معرفت جاں بخشی کی ضمانت پر بادشاہ کو، جو ہر اعتبار سے کمزور ہو چکا تھا، بہ آسانی گرفتار کر لیا گیا۔ جب ہڈسن بادشاہ کو گرفتار کر کے لایا تو لال قلعے کے دروازے پر اس نے انھیں سانڈرس کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید کر دیا گیا۔ دہلی کو خیر باد کہنے تک وہ اسی مکان میں رہے۔

1857 کے ہنگامے سے بھی بہت پہلے بہادر شاہ ظفر اپنے آپ کو جن لاچاریوں میں گھرا ہوا پاتے تھے اس کا منطقی نتیجہ بھی یہی تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے اور مغل سلطنت کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کا، جس کے درپے انگریز کب سے تھے، ایک ہی راستہ تھا کہ وہ 1857 کی یورش میں باغیوں کا ساتھ دیتے جو انھوں نے بالآخر کیا یا انھیں کرنا پڑا۔ اس میں ان کی طرف سے ابتدا میں جو تھوڑی ردوکد ہوئی وہ صرف اس لیے تھی کہ میرٹھ کی باغی فوج کا لال قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچنا انھیں اولاً کوئی مقامی ہنگامہ معلوم ہوا جو انگریزوں کی طاقت کے مقابلے ان کے نزدیک ایک انتہائی نادانی کا اقدام تھا لیکن جلد ہی انھوں نے یہ باور کر لیا کہ یہ تو ایک ملک گیر تحریک تھی جو شاید وہ کام کر سکے جو ان کی معذور بادشاہت نہیں کر سکتی تھی۔ چناں چہ ایسے وقت میں جب انگریز کی تلوار ان کے سر پر لٹک رہی تھی باغی فوج کی قیادت قبول کرنا ظفر جیسے ضعیف العمر، لاچار اور کمزور بادشاہ کے لیے کوئی معمولی اقدام نہیں تھا اور اس اقدام کی سب سے اذیت ناک سزا بھی بالآخر پھر انھی کو ملی۔

1857 کی بغاوت ناکام ہوئی، بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر کے شہر دہلی کے ایک مکان میں قید

کر کے رکھے گئے۔ ان کے پر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام عائد کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ ان کے مقدمے کی کارروائی لال قلعے کے دیوانِ خاص میں عمل میں لائی گئی، یہ کارروائی یورپین فوجی کمیشن کے تحت کرنل ڈیوس کی صدارت میں 27 جنوری 1858 کو شروع ہوئی اور 9 مارچ 1858 کو یہ مقدمہ کمپنی کے حق میں اور بادشاہ کے خلاف فیصل ہوا۔ اس مقدمے میں جس بات پر بار بار زور دیا گیا اور جسے بالآخر ثابت بھی کر دکھایا گیا وہ یہی تھی کہ نہ صرف یہ کہ بادشاہ اس بغاوت میں پوری طرح ملوث تھے بلکہ بغاوت کے عمل میں آنے سے پہلے بھی باغیوں کے ساتھ ان کا ربط وضبط تھا۔ چناں چہ مقدمے کے آخر میں جج نے اپنے بیان میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''ہم بادشاہ کو جو تمھارے کٹہرے میں کھڑے ہیں، ان سے ساز باز کرتا پاتے ہیں۔ وہ پہلا نصب العین جس کی طرف وہ (باغی) پلٹے، وہ پہلا شخص جس سے انھوں نے التجا کی، یہی دہلی کے فرضی بادشاہ ہیں۔ یہ دیکھ کر معمولی عقل والا بھی کہہ سکتا ہے کہ ان میں پچھلا ربط و ضبط تھا کیا ہوا اگر بادشاہ کی شرکت بعد میں ہوئی''۔

انگریز عدالت نے جس بات کو یہاں ان پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے بیان کیا ہے ہم ہندوستانیوں کے لیے جن کا ہندوستان کی آزادی کا یہ خواب 1857 کے پورے نوّے سال بعد 1947 میں پورا ہوا، کسی سپاس نامے سے کم نہیں ہے۔ اس بحث سے قطعہ نظر کہ بہادر شاہ ظفر کی ذات اس سپاس نامے کی کس درجہ مستحق تھی یا نہیں تھی۔

O

بہادر شاہ ظفر 11 مئی 1857 سے 19 ستمبر 1857 (جب بادشاہ نے لال قلعے کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا) کے دوران ہمیں ایک انتہائی اذیت ناک قسم کی نفسیاتی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایک طرف اس یورش میں انھیں مغل شہنشاہ کی حیثیت سے اپنا کھویا ہوا وہ وقار اور اقتدار واپس ملتا ہوا نظر آ رہا تھا جس کے آخری امین کسی نہ کسی طور پر ان کے پردادا عالم گیر ثانی تھے لیکن دوسری طرف یہ جنگ جن نامساعد حالات میں لڑی جا رہی تھی اس میں انھیں شاہ عالم ثانی ثانی کے زمانے سے چلی آ رہی انگریزوں کے پنشن خوار اس نمائشی بادشاہ کا رہا سہا گھروندا بھی اجڑتا ہوا سا نظر آ رہا تھا جس کے آخری وارث خود بہادر شاہ ظفر تھے۔ لہٰذا انقلابی فوج کی قیادت سنبھال لینے کے باوجود ان کی حالت خشوع وخضوع سے محروم اس دنیادار قسم کے نمازی کی سی تھی جس کا دماغ دورانِ نماز خدا کے حضور کھڑا رہنے کے باوجود دنیاوی نفع وضرر کی تشویش میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی خطرۂ نفع وضرر نے انھیں بخت خاں کے ساتھ دلّی سے فرار ہونے سے باز رکھا اور اسی نے انھیں جاں بخشی کی ضمانت کی بنا پر خود کو انگریزوں کے حوالے کر دینے پر آمادہ کیا۔ ان کے اس فیصلے کی ڈور دراصل ان کی بیگم نواب زینت محل کی اس حکمتِ عملی کے ہاتھ میں تھی جو 11 مئی 1857 سے 19 ستمبر 1857 تک لاشعوری طور پر پے بہ پے ان کی اس کمزوری کو تقویت بخشتی رہی تھی۔ چناں چہ ان کی سرشت میں داخل بالآخر اندر ہی اندر پکتا ہوا یہ پھوڑا پھوٹ بہا اور پھر ان کے عزمِ متزلزل کے مقابلے ان کی وہ کمزوری ہی انھیں لے ڈوبی جسے وہ اس عالم کس مپرسی میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ بیٹھے تھے۔

O

۱۹۴۷ء تک بہادر شاہ ظفرؔ اور انقلاب کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ زیادہ تر برٹش حکومت کے نقطۂ نظر سے تھا۔ اس سلسلے میں بعض روزنامچے بھی شائع ہوئے، جن میں جیون لال کا روزنامچہ اور معین الدین حسن کی کتاب 'خدنگِ غدر' اہم ہیں۔ مٹکاف نے ان کا انگریزی میں ترجمہ کرایا تھا۔ ہمارے بعض مورخین نے ان تحریروں کے سہارے اچھی خاصی غلط فہمی پھیلائی ہے، جن میں آر سی مجمدار اس لیے قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی تحقیق کے مطابق ''بہادر شاہ غدار تھے اور آخر تک برٹش حکومت کے وفادار رہے''! یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے پیشِ نظر صرف انگریزوں کی لکھی ہوئی کچھ تاریخیں اور جیون لال کا روزنامچہ ہوگا۔ جیون لال کے روزنامچے سے پتا چلتا ہے کہ وہ جاسوس تھا اور انگریزوں کو قلعے سے متعلق خبریں پہنچاتا تھا۔

بہادر شاہ ظفرؔ اگرچہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے لیکن دہلی کے عوام کے لیے وہ اب تک ہندوستان کے شہنشاہ تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت و عظمت اُسی طرح برقرار تھی۔ عوام ہی نہیں، عالم فاضل لوگ بھی بادشاہ سے یکساں طور پر عقیدت رکھتے تھے۔

ظفرؔ کی زندگی میں اس پیرانہ سالی میں یہ پہلا موقع تھا جب انھیں ایسے ہنگامی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا، چناں چہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، جب باغی سپاہ نے اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور اُن سے تحریک کی قیادت کی درخواست کی تو وہ حیران و پریشان رہ گئے۔ اُدھر شہر میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور غلط قسم کے عناصر موقعے کا فائدہ اٹھا کر لوٹ مار پر تُلے ہوئے تھے، جس سے شہر کا امن برباد تھا اور باشندگانِ شہر عاجز و پریشان تھے۔ بادشاہ کو دہلی اور اہلِ دہلی سے جو بے پناہ محبت تھی، اُس کی وجہ سے وہ دہلی کی بربادی دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا اُن کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ شہر میں امن و امان کس طرح قائم ہو۔ چناں چہ اگلے دن یعنی ۱۲ مئی کو انھوں نے شہر کے عمائدین کی ایک کونسل طلب کی جس میں ان امور پر غور کیا گیا کہ فوج کے لیے غلّے اور قیام کا کیا بندوبست ہو اور اس کے لیے روپیا کہاں سے آئے اور یہ بھی کہ شہر میں نظم و نسق کس طرح برقرار رکھا جائے۔

شہر میں امن و امان برقرار رکھنے کی غرض سے ضعیف العمر بادشاہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کے معائنے کے لیے نکلے۔ بادشاہ نے دکان داروں کو تسلّی دے کر اُن کی دکانیں کھلوائیں، لوگوں کو سمجھایا اور بعض کے گھر جا کر انھیں صبر کی تلقین کی۔ مرزا مغل اس اثنا میں تمام افواج کے کمانڈر انچیف مقرر ہو چکے تھے۔ دوسرے شہزادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دیے جا چکے تھے۔ فوج کے تجربہ کار افسران بادشاہ اور کمانڈر انچیف کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرنے کو تیار تھے۔ شہری اور فوجی بدامنی کو روکنے کے لیے ایک 'کورٹ بنائی گئی' جس کے دس ممبر تھے۔ اُن میں چھ فوجی نظم و نسق کے نمائندے تھے اور چار شہری امور کے۔ کثرتِ رائے کو فیصلہ کُن مانا گیا تھا۔ کمانڈر انچیف مرزا مغل فوج کے سربراہ تھے اور اُن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کورٹ کے کسی بھی فیصلے کو نظرِ ثانی کے لیے واپس بھیج سکتے تھے اور اگر نظرِ ثانی کے بعد بھی کورٹ اپنے سابقہ فیصلے پر قائم رہے تو پھر آخری فیصلے کا اختیار بادشاہ کو تھا کہ وہ جو قدم مناسب سمجھیں، اٹھائیں۔ بادشاہ اور کمانڈر انچیف کو کورٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے کا اختیار

بھی حاصل تھا۔

اگر چہ کمانڈر انچیف کا عہدہ مرزا مغل کو مل گیا اور بعد میں بخت خاں کو بھی گورنر جنرل کے خطاب سے نوازا گیا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ آخر وقت تک بہ ذاتِ خود فوجی انتظام میں دل چسپی لیتے رہے تھے۔ نیشنل آرکائیوز میں ایسی دستاویزیں موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امن وامان قائم رکھنے کے لیے بادشاہ روزانہ خود احکام جاری کیا کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی اس بغاوت کے پیچھے ایک زبردست جوش اور جذبہ کارفرما تھا، اس لیے کہ اس بغاوت کا براہِ راست تعلق ہندوستان کی تہذیبی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی زندگی سے تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے یہ زندگی بُری طرح متاثر تھی۔ ہر شعبۂ زندگی میں ایک بے چینی کی سی کیفیت تھی جسے ذہنی اور جذباتی دونوں سطحوں پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ بدقسمتی سے بغاوت کی تحریک کوئی منظم شکل نہیں اختیار کر سکی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سماج کے مختلف طبقوں میں برٹش راج کو اکھاڑ پھینکنے کے مقاصد جدا جدا تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصہ لینے والوں میں موٹے طور پر تین طرح کے عناصر شامل تھے۔ ایک تو وہ سپاہی جن کے ہاں ایک ایسا والہانہ مذہبی جذبہ تھا جس نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک سیاسی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ دوسرے وہ سپاہی جو وقتی طور پر تو ایک جذبے کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس روایتی لوٹ مار میں بھی حصہ لیتے رہے جو ہندوستان بلکہ پورے ایشیا میں فوجی مہموں کا ایک حصہ رہی ہے۔ تیسرے اس تحریک میں شامل ہونے والے وہ لوگ تھے جن کے ہاں کوئی جذبہ نہیں تھا مگر وہ 'مجاہدین' بن کر باغیوں کے ساتھ صرف اس لیے شریک ہو گئے کہ یا تو لوٹ مار میں ہاتھ رنگ سکیں یا انگریزوں کی جاسوسی کریں اور انعام پائیں۔ یہ تمام مثبت اور منفی کردار پوری تحریک میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ان کی شناخت مشکل تھی۔ انگریزوں کی طاقت سے ٹکر لینا یوں بھی آسان نہیں تھا اور جب خود تحریک میں ہی غدار اور موقع پرست لوگ شامل ہوں تو اس کا انجام معلوم۔ ان حالات میں جب بادشاہ نے تحریک کی قیادت سنبھالی تو ہر طرح کی ذمے داریوں اور پریشانیوں نے انھیں بری طرح آن گھیرا۔ ایک طرف تو انگریزوں کو شکست دینا تھا اور دوسری طرف مقامی فتنہ وفساد پر بھی قابو پانا تھا۔ خزانے میں روپے کا نام ونشان نہ تھا۔ سپاہی تنخواہوں کے لیے واویلا مچا رہے تھے۔ ان حالات میں بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا:

> ''تمام مہاجنوں اور مال دار اشخاص کو گرفتار کر لیا جائے بالخصوص اُن کو جو انگریزوں کے ہوا خواہ ہیں اور ان سے باغیوں کی تنخواہ کے لیے روپیا اینٹھا جائے''۔

حکیم احسن اللہ خاں نے عرض کیا کہ سپاہی شہر میں لوٹ مار کر رہے ہیں اور درخواست کی کہ انھیں شہر بدر کیا جائے۔ چناں چہ اس سلسلے میں فوراً ہی افسرانِ پلاٹن کے نام یہ حکم صادر کیا گیا:

> ''چوں کہ جنگی پلٹن کے شہر میں وارد ہونے کی وجہ سے شہر کی بربادی کا خطرہ ہے اس لیے انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ پلٹن کے افسران اپنے سالار کے ساتھ اپنے خیمے شہر کے باہر نصب کریں اور

یہی احکام برخوردار کامگار مرزا ظہیر الدین کے لیے بھی ہے جو کل فوج کے سپہ سالار ہیں۔
برخوردار کامگار بھی یہ حکم ان تک پہنچا دیں اور تمام فرزندان بھی جو اپنی اپنی پلٹن کے سالار ہیں
اپنے خیمے شہر کے باہر نصب کریں تا کہ بادشاہ سلامت کے حکم کی تعمیل ہو کیوں کہ اسی میں ان کی
خوشنودی ہے۔ ۲۹ رمضان ۱۲ معلاً''۔ (فارسی سے ترجمہ)

حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک میں فوجی تنظیم نام کو نہیں تھی۔ ایک بے پناہ جوش تھا جس کی بدولت انقلاب تو برپا ہو گیا تھا لیکن اس انقلاب کی کامیابی اور استحکام کے لیے کوئی باقاعدہ اور سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان حالات میں سب سے زیادہ مصیبت بادشاہ کو خود اپنی نظر آ رہی تھی، ایسے ہنگامی حالات میں بھی شہزادے بدعنوانیوں سے باز نہیں آ رہے تھے۔ فوج کے لیے شہزادے مہاجنوں اور ساہوکاروں سے روپیا جمع کرتے تھے لیکن اسے خزانے میں داخل نہیں کرتے تھے۔ مجبور ہو کر بادشاہ نے کل اختیارات بخت خاں کو سونپ دیے اور انھیں لارڈ گورنر کا خطاب عطا کیا۔ اگرچہ مرزا مغل کمانڈر انچیف تھے لیکن بات زیادہ بخت خاں ہی کی چلتی تھی۔

جولائی کے مہینے میں تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ شہری امور میں امکان بھر سمجھ بوجھ اور دانش مندی سے کام لینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چناں چہ ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے ۹ رجولائی کو یہ منادی کرائی گئی کہ جو شخص گائے ذبح کرے گا اسے توپ سے اڑا دیا جائے گا لیکن اگر کوئی بکری ذبح کرنے پر اعتراض کرے گا تو اسے بھی سزا دی جائے گی۔ کچھ دن بعد جب بقرعید کا تہوار قریب آ گیا تو ایک بار پھر گائے کے ذبیحے کی بابت منادی کرا دی گئی اور اس سلسلے میں بادشاہ نے ایک شقہ کوتوالِ شہر شاہ مبارک خاں کے نام جاری کیا جو اس طرح تھا:

حضور والا کا خاص شقہ حضور معلاً شجاعت نشان کے دستخطوں کے ساتھ

''مبارک شاہ خاں کوتوالِ شہر کو معلوم ہو کہ کل تمام شہر میں شقہ خاص کے مطابق یہ منادی کرا دی جائے کہ گائے کا ذبیحہ یا قربانی قطعی ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ شہر کے تمام دروازوں پر یہ بندوبست کر دیا جائے کہ کسی بھی جانب سے گائے یا بھینس فروخت کرنے والے آج سے لے کر عید کے تین روز بعد تک گائے یا بھینس شہر میں نہ لائیں۔ جن مسلمانوں نے گائیں پال رکھی ہیں وہ اپنی گائیں کوتوالی میں بندھوا دیں۔ اگر کوئی شخص خفیہ طور پر یا اعلانیہ گائے کی قربانی کرے گا تو اُسے موت کی سزا دی جائے گی''۔ (فارسی سے ترجمہ)

قلعے کی سیاست نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تک انگریزوں کو شکست دینے کے لیے بہادر شاہ ظفر اپنا مال و دولت ہی لٹا رہے تھے لیکن اب انھوں نے اس جنگ کو جیتنے کے لیے اقتدار کی بازی بھی لگا دی۔ چناں چہ جب باغی فوجوں سے کچھ کام بنتا نظر نہیں آیا تو رجواڑوں سے رجوع کیا گیا اور انھیں اس بات کی دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس جنگ میں بادشاہ کا ساتھ دیں گے تو بادشاہ اپنے شاہی اختیارات بھی انھیں سونپ دیں گے۔ اس سلسلے میں جیون لال رقم طراز ہے:

''جے پور، بیکانیر اور الور کے راجگان کے نام بادشاہ کی دستخطی چٹھیاں بھیجی گئی ہیں جن میں لکھا گیا تھا کہ مجھے فوج کی ضرورت ہے اور میں انگریزوں کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہوں لیکن چوں کہ اس وقت میرے پاس سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے قابلِ اعتماد آدمی موجود نہیں ہیں اس لیے میں ریاستوں کی ایک مجلس بنا دینا چاہتا ہوں، اگر وہ ریاستیں جن کے نام خط بھیجے جا رہے ہیں اس غرض کے لیے مجلس بنا لیں گی تو میں نہایت خوشی سے اپنے شاہی اختیارات ان کے ہاتھ میں دے دوں گا''۔

بادشاہی کیمپ میں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی اور ادھر انگریز اپنے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ گوری شنکر کا آخری خط جو نیشنل آرکائیوز میں ملتا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ اس نے شہر دہلی کی ساری صورتِ حال انگریزوں پر واضح کر دی تھی اور انھی معلومات کی بنیاد پر انگریزوں نے شہر پر ایک بھرپور اور کامیاب حملہ کیا۔

بالآخر ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کی فوجیں کچھ ایسے مقامات سے جہاں فصیل شکستہ ہو گئی تھی، شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ ۱۴ر ستمبر سے 19 ستمبر تک پانچ دن لگاتار شہر میں جنگ ہوتی رہی۔ ۱۹ر ستمبر کو انگریزی فوجیں کوتوالی اور جامع مسجد تک پہنچ گئیں۔ باغیوں نے جامع مسجد میں پناہ لی اور وہیں سے مدافعت کرتے رہے۔ انگریزوں کی پیش قدمی کو عارضی طور پر روک دیا گیا اور وہ کشمیری دروازے کی طرف واپس چلے گئے۔

غلام حسین کے قول کے مطابق بادشاہ خود سوار ہو کر لال ڈگی پر تشریف لائے اور تمام افواج و رعایا جمع ہوئی لیکن انگریزوں کی گولیاں لال ڈگی تک پہنچتی تھیں اس لیے افسران نے عرض کیا کہ حضور کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ حضور کو کچھ صدمہ پہنچے۔ بادشاہ ان لوگوں کے کہنے سے قلعے میں چلے آئے۔

19 ستمبر 1857 بروز ہفتہ بادشاہ نے بھی قلعہ چھوڑ دیا اور بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ نظام الدین چلے گئے۔ تین روز تک بہادر شاہ ظفر اور ان کا خاندان ہمایوں کے مقبرے میں بے سروسامانی کی حالت میں پڑے رہے۔ 20 ستمبر کو میجر ہڈسن نے ہمایوں کے مقبرے سے بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح مغل سلطنت اپنے اتمام کو پہنچی۔ اس کے بعد بہادر شاہ ظفر کا کیا انجام ہوا اس کی تفصیل مستند ماخذوں کے حوالے سے کتاب میں موجود ہے۔

میں خاص طور پر شکر گزار ہوں ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کا جنھوں نے اس شمارے کی تیاری کے لیے ذاکر حسین کالج کی لائبریری سے بہت سا قیمتی مواد فوٹو کاپی کرا کے مجھے فراہم کیا۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے بھی اس سلسلے میں بارہا میری مدد کی، میں ان کا بھی ممنون ہوں۔ میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے ریڈر ڈاکٹر گوتم چکرورتی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اپنے ہاتھ کی کھینچی ہوئی دلّی کی تاریخی عمارات کی کچھ تصاویر ہمیں مرحمت فرمائیں۔ یہ تصاویر بھی دیگر تصاویر کے ساتھ کتاب میں شامل ہیں۔

اسلم پرویز
19 ستمبر 2007

ویر بھارت تلواڑ

ہندی سے اردو: عبدالرشید

بغاوت اور وفاداری

۱۸۵۷ء اور سرسیّد

ساری دنیا جانتی ہے کہ سرسیّد احمد خاں انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔ وہ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے، بعد میں برٹش حکومت کے خیرخواہ رہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر انگریزوں کی جان بچائی تھی۔ انگریز حکومت نے انھیں 'سر' کا خطاب دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سوویں برسی پر ایسی شخصیت کو یاد کرنے کا کیا مطلب؟ ۱۸۵۷ء کی فخریہ ثناخوانی کے درمیان یہ بے آہنگی کیوں؟

یہ 'کڑوا' سچ اگلنے میں مجھے کوئی دل چسپی نہیں ہے، لیکن کبھی کبھی ایسا کرنا لازمی ہوجاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اونچے سُروں میں جو کورس گایا جارہا ہے وہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے پوری طرح سے صحیح ہونے کے باوجود کچھ سُر جو ہمیشہ الگ رکھے جاتے ہیں ان کے بھی کچھ معنی ہیں۔ وہ تو کورس کو مکمل کرتے ہیں انھیں ضرور سن لینا چاہیے۔ ان کی سچائی کو پرکھ لینا چاہیے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور سیّد احمد، بے شک دو الگ رنگوں سے بنی دو الگ الگ تصویریں نظر آتی ہیں، اس کے باوجود ان کے درمیان ایک تعلق یا رشتہ ہے، وہ رشتہ کیا ہے؟ اُس میں سچ اور جھوٹ کتنا ہے؟ اس کے اندرونی تناؤ اور تضادات کیا ہیں؟ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں جو کچھ سیّد نے کیا اور کہا وہ بالکل واضح ہے لیکن

تاریخ کے کچھ حصوں پر ہمیشہ دھول کی پرت جمتی رہتی ہے اُسے صاف کرتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ تھوڑی سی سچائی وہاں بھی دبی رہ جاتی ہے۔ تاریخ کی اس تصویر میں تھوڑی ٹریجڈی اور تھوڑی پیچیدگی ہے۔ اسی لیے اِسے اور بھی غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۱۸۵۷ء کے واقعات میں سیّد احمد نہ صرف ایک ملازم کی حیثیت سے شریک تھے بلکہ اس سے بھی پہلے وہ ایک ہندوستانی تھے جنھوں نے اس کے بارے میں لکھا، اس کا تجزیہ کیا۔ تاریخ نگاری میں سیّد کو سنجیدہ اور گہری دل چسپی شروع سے رہی تھی۔ ان کی اہم ترین تاریخی دستاویز 'آثارالصنادید' ۱۸۴۷ء میں چھپی تھی جب سیّد محض بیس برس کے تھے۔ اس میں پہلی بار دلّی کی سینکڑوں تاریخی عمارتوں اور حویلیوں کا آثارِ قدیمہ اور فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس میں دلّی شہر، شہر کے موسم اور زبان کے بارے میں اپنے خیالات کے علاوہ، اس کتاب میں اس زمانے کی دلّی کے ایک سو بیس مشاہیر کا مستند حال درج ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے رائل ایشیاٹک سوسائٹی، برطانیہ نے اس کتاب کی بنا پر انھیں اپنا اعزازی ممبر مقرر کیا۔ اگلے پانچ سال کے اندر ہی 'سلسلۃ الملوک' کے نام سے انھوں نے ایک اور کتاب لکھی جس میں مہاراج یدھشٹر سے ملکہ وکٹوریہ تک دلّی پر حکومت کرنے والے دو سو تین ہندو اور مسلم حکمرانوں کی تاریخی فہرست تیار کی جو ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی۔

۱۸۵۷ء سے متعلق سیّد کی دو تالیفات ملتی ہیں۔ پہلی 'تاریخ سرکشیِ بجنور' ہے جس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک ضلع بجنور میں واقع غدر کے مستند حالات درج ہیں۔ اُس زمانے میں سیّد خود بجنور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر امین کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔ بغاوت کے دوران خود کو خطرے میں ڈال کر انھوں نے نہ صرف وہاں مقیم انگریز خاندانوں کی جان بچائی بلکہ باغیوں کو سنبھالنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ بغاوت پر قابو پانے کے بعد حکومت کی طرف سے باغیوں کو سزا دینے یا نہ دینے کے معاملے میں بھی ان کا رول کافی اہم رہا۔ بغاوت کی افراتفری کے درمیان بھی ان کے اندر کا تاریخ نگار بیدار اور مستعد رہا۔ اپنی کتاب کے لیے ضروری مواد — اپنے نوٹس، سرکاری خط کتابت، باغیوں کے درمیان خط کتابت اور دوسری دستاویزات وغیرہ — بغاوت کے دوران بھی وہ

یہ مواد سنبھال کر رکھتے رہے۔ اس کتاب کا ذکر صرف بجنور کے واقعات اور وہاں سیّد کے کردار کو جاننے کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔

اُن کی دوسری کتاب 'رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند' کی اہمیت صرف علاقائی سطح کی نہیں ہے۔ اس میں نہایت عالمانہ انداز میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب سے بحث کی گئی ہے اور تحقیق و تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس سے بغاوت کے بارے میں سیّد احمد کا نظریہ سامنے آتا ہے۔ سیّد نے اسے ۱۸۵۸ء میں ہی، بجنور سے مرادآباد میں تبادلہ ہونے کے فوراً بعد لکھ لیا تھا۔ سیّد کے اندر کوئی گہری بے چینی رہی ہوگی جس نے اتنی جلدی یہ کتاب ان سے لکھوالی۔ بغاوت ختم ہونے کے فوراً بعد کے ماحول میں جب انگریز، مسلمانوں کے خلاف غصے اور نفرت سے اُبل رہے تھے، ایسی کتاب لکھنے کے لیے کافی ہمت کی ضرورت تھی۔ سیّد میں ایسی ہمت تھی کہ انھوں نے بغاوت کے بارے میں انگریزوں سے الگ اپنی رائے ظاہر کی بلکہ آگے کے لیے انھیں کچھ ایسے مشورے بھی دیے جو سب انگریز حاکموں کو یکساں طور پر ہضم ہونے مشکل تھے۔ اردو میں لکھنے کے بعد سیّد نے کچھ ہی ہفتوں کے اندر آگرے کے مفصل گزٹ پریس سے اس کی پانچ سو کاپیاں چھپوالیں۔ وقت کی نزاکت اور خطرے کو بھانپتے ہوئے ان کے دوستوں نے انھیں یہ کتاب کسی سرکاری حاکم یا دفتر میں بھیجنے سے منع کیا۔ دہلی کالج کے مشہور پروفیسر اور ریاضی داں ماسٹر رام چندر، جنھیں ہندو مذہبی کٹر پسندوں کی تنقید کرنے اور عیسائی مذہب اپنا لینے کی وجہ سے ۱۸۵۷ء میں باغیوں نے قتل کر ڈالا تھا، کے چھوٹے بھائی شنکر (رائے شنکر داس) سیّد احمد کے گہرے دوست تھے اور ان دنوں مرادآباد میں ہی منصف (سب جج) کے عہدے پر فائز تھے، انھوں نے سیّد کو آگاہ کیا کہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بہتر ہے کہ وہ اس کتاب کو جلا ڈالیں (حیاتِ جاوید: الطاف حسین حالی، ص ۴۳، انگریزی سے ترجمہ)۔ لیکن سیّد کو پکا یقین تھا کہ بغاوت کے اسباب کا ذکر کر کے حکومت کو حالات کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے اور اسی کے ساتھ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ اپنی قوم، اپنے ملک اور سرکار کے حق میں اپنی وفاداری کا فرض نبھا رہے ہیں۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے انھوں نے کتاب عام لوگوں کے درمیان تقسیم نہیں کرائی، لیکن اس کی زیادہ سے زیادہ کاپیاں انگلینڈ میں ملکہ کی حکومت کے پاس اور ایک کاپی کلکتے کے وائسرائے لارڈ کیننگ کو بھیج دی، بقیہ کاپیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ انگلینڈ اور ہندوستان کی حکومت میں اس پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا گیا اور انگریزی

میں اس کا ترجمہ کرایا گیا۔ سرکاری حلقوں میں اس کتاب پر خفیہ بحثیں ہوئیں۔ سیّد کے ایک انگریز دوست کرنل گراہم نے آک لینڈ کالون کے ساتھ مل کر اس کا جو انگریزی ترجمہ کیا وہ بغاوت ختم ہونے کے پندرہ برس بعد ۱۸۷۳ء میں میڈیکل ہال پریس، بنارس سے چھپا۔ اس انگریزی ترجمے کے ساتھ مختصر تعارف میں سیّد نے واضح کر دیا کہ ۱۸۵۸ء میں بغاوت کے بارے میں انھوں نے جو خیالات پیش کیے تھے، پندرہ برس بعد بھی وہ اُس میں کسی تبدیلی یا اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس تحریر میں جو مثالیں دی گئی ہیں وہ ۱۸۷۳ء والے اڈیشن سے ہی اخذ کی گئی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے سیاق میں سیّد احمد کے کردار اور تحریروں پر غور کرتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے لیے سیّد پوری طرح سے وفادار تھے اور ان کی وفاداری کوئی سطحی یا وقتی (ابن الوقتی) چیز نہیں تھی۔ سیّد احمد دلّی کے اعلا خاندان کے فرد تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے سترہویں صدی میں مغلوں کے دربار میں بہتر ملازمت پانے کے ارادے سے آئے اور دہلی میں بس گئے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو سیّد احمد پیدا ہوئے، ان کے والد دلّی کے بڑے معزز سنّی مسلم خاندان کے سردار تھے جن کے دادا اورنگ زیب کی فوج میں کمانڈر رہے تھے۔ سیّد احمد کے نانا مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے وزیر تھے۔ حفیظ ملک نے سیّد کے خاندان کی دو ایسی روایتی خصوصیات کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے سیّد کی سیرت اور شخصیت پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ پہلی خصوصیت ان کے والد سیّد محمد متقی کی تھی —— ایک ایسا روحانی جذبہ جو کسی آدمی کو دنیاداری اور دولت کے لالچ سے دور لے جاتا ہے، دوسری خصوصیت ان کے نانا فریدالدین احمد (۱۸۲۸-۱۷۴۷ء) کی تھی جو ان کے والد کے برعکس دنیاوی امور میں کافی ہوشیار تھے۔ ان کے آبا و اجداد کشمیری اون اور سلک کے تاجر تھے لیکن بعد میں سرکاری ملازمت میں آ گئے۔ اس وقت مغلوں کی حکومت کی باگ ڈور ایک ایسے چھوٹے سے طبقے کے ہاتھ میں تھی جس کا اعلا اور مقدم مقصد پوری ایمانداری اور ہنرمندی کے ساتھ اپنے حاکم کی خدمت کرنا تھا —— وہ حاکم خواہ کوئی بھی ہو۔ نانا انھیں اقدار کو ماننے والے انتظامیہ طبقے کے ایک رکن تھے۔ وہ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی میں کام کرتے تھے۔ ان کی قابلیت، ذہانت اور ایمانداری کو دیکھ کر لارڈ ولزلی نے ۱۸۰۳ء میں انھیں کمپنی کا نمائندہ بنا کر ایران بھیج دیا۔ بعد میں کمپنی نے انھیں برما میں اپنا سیاسی افسر مقرر کیا۔ مغل

بادشاہ نے انھیں وزیر اعلا کا عہدہ دیا۔ دراصل یہ عہدہ ان کے والد متقی کو پیش کیا گیا تھا۔ اپنے ترکِ دنیا کے رجحان کی وجہ سے انھوں نے اسے قبول نہ کیا بلکہ اپنے خسر یعنی سیّد کے نانا کو دینے کا مشورہ دیا جو اس وقت کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی نوکری کر رہے تھے۔ وزیر اعلا بننے کے بعد نانا جس ایمانداری سے کمپنی کی خدمات انجام دے رہے تھے اُسی ایمانداری سے اب مغلوں کی خدمت کرنے لگے۔ مغل بادشاہ کمپنی سے ملنے والی اپنی پنشن سے مطمئن نہیں تھا اور کئی طرح کی مالی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا وزیر اعلا انگریزوں سے بات کر کے ان کی پنشن کی رقم کو بڑھوائے لیکن نانا نے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ بادشاہ کی معاشی دشواریوں کی اصل وجہ پنشن کی رقم نہیں بلکہ بادشاہ کے خرچ کا زیادہ ہونا ہے۔ اس بجٹ میں آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ تھا بلکہ فضول خرچی تھی۔ لہٰذا انھوں نے کمال قابلیت اور سختی سے بادشاہ کے بجٹ کو متوازن کیا، ان کے سبھی قرض ادا کیے، فضول خرچی بند کرادی اور اس طرح بادشاہ کو مالی پریشانیوں سے باہر نکالا۔ اس کے نتیجے میں محل اور دربار میں جن لوگوں کے اپنے مفادات اور سہولتوں کو چوٹ پہنچی، انھوں نے بادشاہ کو نانا کے خلاف بھڑکایا۔ نانا نے جب اپنے ساتھ بادشاہ کے برتاؤ میں روکھاپن محسوس کیا تو اپنا استعفیٰ دے کر کمپنی کی نوکری میں کلکتہ چلے گئے۔ ان کے بغیر بادشاہ کی گاڑی پھر اٹکنے لگی۔ انھیں دوبارہ وزیر اعلا کے عہدے پر بلایا گیا۔ واپس آ کر انھوں نے جب بادشاہ کی پنشن اور ان کے خرچ کے درمیان دوبارہ تال میل بٹھانے کی کوشش کی تو ان کی اس کوشش کو کمپنی نے ان کے پرانے تعلق کی وجہ سے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ نانا نے اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کرتے ہوئے تین سال کے اندر ۱۸۲۲ء میں پھر استعفیٰ دے دیا۔ ۱۸۲۸ء میں ان کی وفات ہوگئی تب سیّد گیارہ سال کے تھے۔ حفیظ ملک نے لکھا ہے کہ سیّد پر اپنے والد کے بجائے نانا کا اثر کہیں زیادہ تھا۔ سیّد کی شخصیت پر، بالخصوص ان کی سیرت کی تعمیر میں ان کی ماں کی تعلیم و تربیت کو بڑا دخل ہے جنھوں نے سیّد کو ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے اور زندگی کی اعلا اقدار کی تعلیم دی۔

سیّد احمد کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انھوں نے حساب، الجبرا، جیومیٹری اور طب کا مطالعہ کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں پڑھائی چھوٹ گئی۔ وہ دہلی کالج میں پڑھنے کبھی نہیں گئے لیکن وہاں پڑھنے اور پڑھنے والوں سے ان کے ذاتی اور دوستانہ مراسم تھے۔ بعض وجوہ سے سیّد کی خاندانی جائیداد ان کے ہاتھوں سے کافی حد تک

نکل گئی اور انھیں چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے اپنا گزارہ کرنا پڑا۔ اپنے ایک چچا کی نگرانی میں انھوں نے قوانین و عدالت کی تعلیم پائی اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

بجنور میں

جنوری ۱۸۵۵ء میں سیّد احمد کا تبادلہ بجنور میں صدر امین کے عہدے پر ہوگیا۔ سوا دو سال کے بعد ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی تو سیّد یہیں پر تھے۔ سیّد کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ بجنور کے کلکٹر مسٹر شیکسپیئر، سیّد کو جانتے تھے اور ان پر بھروسا رکھتے تھے۔ جب بغاوت کی آگ بجنور میں بھی بھڑک اٹھی تو شیکسپیئر کا خاندان گھبرا اٹھا، اس وقت تقریباً بیس یوروپین اور یوریشین خاندان بجنور میں تھے۔ افسروں کے لیے فرض کی ادائیگی اور اپنے انسانی جذبات کی وجہ سے سیّد اُن کی حفاظت کے لیے جی جان سے تیار ہوگئے۔ اس خوف اور دہشت کے ماحول میں انھوں نے شیکسپیئر کی بیوی کو بھروسا دلایا کہ جب تک میں زندہ ہوں، آپ کو کچھ ہونے نہیں دوں گا۔ کمپنی کے دوسرے ہندوستانی ملازموں کے ساتھ سیّد مسلح ہوکر ساری رات کلکٹر کے گھر کے سامنے پہرہ دیتے اور گلیوں میں گشت لگاتے۔ شہر کے سبھی یوروپین اور یوریشین خاندان اپنی حفاظت کے لیے کلکٹر کے مکان میں جمع ہوگئے تھے۔ باغی اس مکان کے سامنے جمع ہونے لگے۔ سر پر منڈلاتے خطرے کو بھانپ کر کہ آج کی رات شاید سبھی انگریز خاندان قتل کر دیے جائیں گے، ہمت کر کے سیّد خود باغیوں کے سردار محمود خاں کے پاس گئے اور پوچھا کہ ان تھوڑے سے بے قصور یوروپین کو مار کر انھیں کیا ملے گا؟ بہتر ہوگا کہ تم انھیں شہر سے باہر حفاظت سے نکل جانے دو، پھر شہر کو اپنے قبضے میں کر لینا۔ محمود خاں کے آبا و اجداد بجنور کے نواب رہے تھے۔ اُن کے وارث محمود خاں نے سیّد کی صلاح مان لی۔ یوروپین خاندان بحفاظت رُڑکی پہنچ گئے اور محمود خاں نے شہر کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ انگریز افسروں کے ساتھ مل کر چالاکی سے بنائے گئے منصوبے کے مطابق سیّد نے محمود خاں سے کہا کہ جب تک انگریز، ضلع پر دوبارہ سے حکومت قائم نہیں کر لیتے، وہ خود انگریزوں کی طرف سے اِس پر حکومت چلائے۔ سیّد نے انگریزوں کی طرف سے اس مقصد سے پہلے سے تیار کیا ہوا ایک خط بھی محمود خاں کو دیا۔ اس کے ساتھ ہی محمود خاں کی دلی تمنا کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک کمیٹی بنادی گئی جس کی رضامندی سے

ہی محمود خاں نے حکومت چلانی تھی۔ لیکن محمود خاں نے کمیٹی کی پرواہ نہیں کی۔ سیّد نے کچھ ہندو مسلمان تحصیل داروں کے ذریعے زمینداروں اور کسانوں کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنا لگان براہِ راست نواب کو نہ دیں۔ انگریزوں نے ضلع کے ہندو زمینداروں کو نواب کے خلاف بھڑکانے کی کوشش بھی کی کہ اگر وہ سب مل کر حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو انگریز بھی ان کی حمایت کریں گے۔ چوں کہ محمود خاں کے آبا و اجداد ہی بجنور کے نواب تھے، لہٰذا ہندو زمینداروں نے انگریزوں کے مشورے کو ٹھکرا دیا اور نوابی کے لیے محمود خاں کے دعوے کو واجب قرار دیا (حفیظ ملک، ص ۱۰۴)۔ خود محمود خاں نے سیّد احمد کی اہلیت اور انتظامی امور میں ان کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اپنی حکومت میں انھیں اعلا عہدہ دینے کی پیش کش کی لیکن سیّد نے اسے نامنظور کر دیا اور انگریزوں کی حکومت کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ سیّد نے بڑی صاف گوئی سے نواب سے کہا کہ میں ہر طرح سے آپ کا خیر خواہ رہوں گا جب تک کہ آپ انگریزوں کی طرف سے حکومت چلاتے رہیں گے۔ اگر آپ انگریزوں کو ہرا کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہیں گے تو میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ سیّد سچ مچ اس میں یقین کرتے تھے کہ انگریزوں کی مادی تہذیب اور سیاسی نظام کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کا جاگیردار طبقہ انگریزی حکومت کو اکھاڑ نہیں سکتا اور اگر کسی طرح اکھاڑ بھی دیا، تب بھی وہ حکومت چلانے کے قابل نہیں ہوگا۔ ناراض نواب نے دوبار سیّد کو آدھی رات کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور ان سے نذرانے کی رقم مانگی۔ اس کے بعد اس کے سپاہیوں نے بجنور میں سیّد کے مکان پر قبضہ کرلیا اور ان کا سارا سامان ضبط کرلیا (حالی، ص ۴۷)۔ اس درمیان نگینہ سے چار سو فوجیوں کو ساتھ لے کر ایک باغی سردار منیر خاں آیا۔ اس نے اسلام کے نام پر سیّد کے سامنے انگریزوں کے خلاف جہاد کا مشورہ رکھا۔ سیّد نے اسے یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ اسلام میں ایسا کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

لیکن بجنور میں باغیوں کی حکومت زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی۔ ضلعے کے مسلمان نواب اور ہندو زمینداروں کے درمیان جو پھوٹ انگریز نہیں ڈال سکے وہ ایک دوسری وجہ سے اپنے آپ پڑ گئی۔ ضلعے میں بہت سے ہندو راجپوت زمیندار تھے جن پر کمپنی کی کافی مالگزاری بقایا تھی۔ ان زمینداروں نے مفرور انگریز خاندانوں کا بہت سا قیمتی ساز و سامان بھی اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ نواب محمود خاں نے حکم دیا کہ انگریزوں کے گھروں سے لوٹا ہوا سامان اور کمپنی کی بقایا مالگزاری اُس کے حوالے کردی جائے کیوں کہ حکومت اب اُس کی ہے۔ ہندو

زمینداروں نے اسے نامنظور کردیا۔ محمود خاں نے فوج بھیج کر اُن ہندو زمینداروں سے بقایا مالگزاری جبراً وصول کرلی اور ان کے ساتھ مار پیٹ بھی کی۔ اس سے زمیندار اُس کے خلاف ہوگئے۔ حکومت سنبھالنے سے پہلے محمود خاں ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کو ایک نظر سے دیکھتا تھا لیکن اب معاشی وجوہ سے ہندو زمینداروں سے اس کی دشمنی ہوگئی۔ یہ معاشی اختلاف جلد ہی ہندو مسلم فرقہ وارانہ اختلاف میں بدل گیا۔ ہندور کے ہندو زمینداروں نے مل کر نواب پر حملہ کردیا اور اُسے حکومت سے بے دخل کر کے بھگا دیا۔ اتنا ہی نہیں، انھوں نے نواب کے علاقے میں جا کر گاؤں میں لوٹ مار کی اور کچھ لوگوں کو قتل بھی کردیا۔ مجموعی طور سے حکومت سنبھالنے کے بعد ہندو زمینداروں نے خود کو انگریزوں کی طرف سے حکومت کرنے والا بتایا اور سیّد احمد سے بھی بہتر رشتے بنالیے۔ اُدھر نواب محمود خاں نے دوبارہ سے فوج اکٹھی کر کے بجنور پر دوسری بار حملہ کیا اور ہندو زمینداروں کو بھگا دیا۔ اُس نے بھی ہندور میں جا کر ان زمینداروں کے علاقے میں تباہی مچائی اور ان کے گھر جلا دیے۔

اس طوائف الملوکی کے درمیان سیّد اپنے مددگار رحمت خاں کے ساتھ اپنی جان بچاتے ہوئے پیدل ہی بجنور سے نکل بھاگے۔ پلنہ اور چاندپور میں باغیوں کے خطرے کا سامنا کرتے ہوئے اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتے ہوئے بھوکے پیاسے سیّد نے آخر بچھراؤں پہنچ کر اپنے ایک مولوی دوست کے گھر میں پناہ لی۔ پھر وہاں سے میرٹھ چلے آئے اور انگریز حاکموں کو رپورٹ دی۔

فروری ۱۸۵۸ء تک انگریزوں نے بجنور کو دوبارہ سے اپنے قبضے میں لینے اور باغیوں کو سزا دینے کی تیاری کرلی۔ سوال اٹھا کہ باغی کون ہے؟ ہندو زمیندار یا مسلمان نواب؟ ہندو زمینداروں نے خود کو انگریزوں کا حامی بتایا اور نواب کو باغی ٹھہرایا۔ سیّد نے انگریزوں کے سامنے یہ دلیل پیش کی کہ ہندو زمیندار اور نواب ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے، انگریزوں کے خلاف نہیں، لہٰذا انھیں باغی نہ مانا جائے۔ اب جو انگریزی فوج بجنور پر قبضہ کرنے جائے گی تو جو انگریزوں کے خلاف کھڑا ہو، اُسی کو باغی مانا جائے۔ اس دلیل سے سیّد نے کئی لوگوں کی جان بچائی بالخصوص مسلمانوں کی۔ اس کے باوجود واپس لوٹے ہوئے انگریزوں نے کئی مسلم زمینداروں کو پوری طرح سے تباہ کردیا۔ انگریزوں نے چاندپور کے

دو زمینداروں میر صادق علی اور میر رستم علی کے علاقوں کو ضبط کرلیا اور صادق علی کی ریاست کا ایک بڑا علاقہ انعام کے طور پر سیّد احمد کو پیش کرنا چاہا جسے سیّد نے قبول کرنے سے انکار کردیا (حالی، ص ۸۳)۔

بجنور کے واقعات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے سیّد احمد نے اُس سے چار نتیجے نکالے:

۱- انگریز ہی یہاں ہندو مسلمانوں کے درمیان اعتدال قائم رکھتے ہوئے امن و امان کے ساتھ قانونی حکومت چلا سکتے ہیں۔

۲- ہندو اور مسلمان جب جنگ کے دوران بھی انگریزوں کے خلاف ایک ساتھ نہیں ہو سکے تو پھر وہ امن و امان کی حالت میں ایک ساتھ کیسے ہوں گے؟

۳- ہندو مسلمانوں کے درمیان کے معاشی جھگڑے بھی جلد ہی مذہبی فرقہ وارانہ جھگڑے کی صورت لے لیتے ہیں۔ اور

۴- بجنور میں ہندو اور مسلمان انگریزوں کے خلاف لڑنے کے بجائے آپس میں لڑے۔

حفیظ ملک نے سیّد احمد کی اس تاریخ نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے درست لکھا ہے کہ ایک مورخ ہونے کی وجہ سے سیّد نے بجنور میں ہونے والے واقعات کا بیان بھلے ہی معروضی انداز سے کیا ہو لیکن اس غدر کی جو روح تھی اور جو اس کی ظاہری اور باطنی کیفیات تھیں، اُسے وہ معروضی انداز سے نہیں دیکھ سکے۔ اُسے انھوں نے غالباً اسی نظریے سے دیکھا جس نظریے سے انگریز اس زمانے میں دیکھ رہے تھے لیکن حفیظ ملک نے اس نظریے میں شامل ایک خصوصیت کو جو سیّد کی اپنی خصوصیت تھی، نظر انداز نہیں کیا۔ وہ تھی اپنے ہم وطنوں کی جان، جہاں تک بچائی جا سکے، بچانے کا جذبہ۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب

بجنور کی تاریخ کے مقابلے میں 'اسبابِ بغاوتِ ہند' زیادہ وقیع اور اہم تالیف ہے۔ اس میں کہی گئی کچھ باتیں برٹش نظریے سے میل کھاتی ہیں تو بہت سی باتیں اس کے خلاف جاتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں اس کی وجہ سیّد کی وفاداری ہی ہے۔ مالک کی حمایت میں سچ کو سچ کہنا ہی سچے وفادار کی نشانی ہے۔ سچ اور جھوٹ کا خیال کیے بغیر صرف مالک کی ہاں میں ہاں ملانا چاپلوسی اور جی حضوری ہوتی ہے، وفاداری نہیں۔

لیکن اس کتاب میں انگریزی حکومت سے وفاداری کے علاوہ ایک اور عنصر ہم دیکھتے ہیں جس نے سیّد احمد کی تاریخ نگاری کو متاثر کیا ہے وہ ہے —— ہندوستانیوں سے، خاص طور پر اپنی مسلمان قوم سے وفاداری۔ یہ نیا سروکار، جس نے ان کے خیالات اور تحریروں کو اتنا متاثر کیا، حالاں کہ ان میں پہلے بھی موجود تھا لیکن اب اور زیادہ اہم ہوگیا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ اسے ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ بہرحال 'اسبابِ بغاوتِ ہند' میں سیّد کو اس وقت کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ ان کی دونوں وفاداریاں، اپنی قوم سے اور انگریزوں سے، کئی جگہ آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اس ٹکراؤ کو کیسے حل کیا جائے؟ ان کے درمیان تال میل بٹھانے میں کئی جگہوں پر سیّد ناکام رہے ہیں۔ لہٰذا ایسی جگہوں پر ان کا تجزیہ متضاد اور کمزور ہوگیا ہے۔ ان دونوں وفاداریوں کے درمیان گہرا اختلاف ہونے کی وجہ ہی سے سیّد کے تجزیے میں یہ خلا نظر آتا ہے کہ ایک طرف وہ بغاوت کے پیچھے کئی شکایتوں اور اسباب کو بالکل واجب سمجھتے ہیں، دوسری طرف کسی بھی صورت میں بغاوت کی حمایت نہیں کرتے۔

یہ عجیب بات ہے کہ سیّد پر لکھنے والے بعض اہم علما نے، جیسے نکولس بی. ڈرک نے ۱۸۵۷ء سے متعلق سیّد کی تاریخ نگاری کے بارے میں یہ کہا ہے کہ سیّد نے بغاوت شروع ہونے کی وجہ سے بحث کرتے ہوئے سارا زور چربی لگے ہوئے کارتوسوں والے واقعے پر دیا ہے جس نے سپاہیوں کے مذہبی عقائد کو چوٹ پہنچائی تھی اور اس طرح سیّد نے اُن انگریز مصنفین کو مطمئن کیا جو اس بغاوت کو صرف سپاہیوں کے ردِعمل اور ان کے مذہبی عقائد سے جوڑتے تھے (ڈرک، ص۷۲)۔ اصل میں سیّد نے اپنی کتاب 'اسبابِ بغاوتِ ہند' میں ایسا کہیں نہیں لکھا ہے جو بات ڈرک کر رہے ہیں۔ وہ بات دراصل کتاب لکھے جانے کے گیارہ سال بعد ۱۸۶۹ء میں سیّد نے سرجان کے (Kaye) کو ایک خط میں لکھی تھی۔ یہ جانکاری بھی ہمیں خود ڈرک سے ہی ملتی ہے حالاں کہ انھوں نے خط کی اُن سطروں کو پوری طرح نقل نہیں کیا ہے۔ اتنے عرصے کے بعد سیّد نے جان کے کو ایسی بات کیوں لکھی جسے اپنی کتاب میں انھوں نے لکھا ہی نہیں۔ اس بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ڈرک یہ وضاحت سیّد کی کتاب 'اسبابِ بغاوتِ ہند' کے سیاق میں کرتے ہیں لیکن حاشیے میں حوالہ انھوں نے کتاب کا نہیں بلکہ درج بالا خط کا دیا ہے۔ ڈرک سے بہت پہلے سیّد کے سوانح نگار الطاف حسین حالیؔ نے بھی اپنی کتاب 'حیاتِ جاوید' میں لکھا تھا کہ سیّد کے مطابق یہ بغاوت صرف لاعلم اور توہم پرست سپاہیوں کی حکم عدولی کی

وجہ سے ہوئی (ص۹۲)۔ اس طرح یہ مشتبہ تصور اور بھی پہلے سے چلا آرہا تھا۔ خود حالی کی کتاب میں اس تصور کے خلاف یہ سچی بات بھی درج ہے کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق انگریزوں کی تحقیق سے سیّد بالکل متفق نہیں تھے اور انھوں نے نہایت جرأت کے ساتھ سرکار کے خلاف لوگوں کی شکایتوں کو سامنے رکھا (ص۹۳)۔ درج بالا مشتبہ تصور کے پھیلنے کا سرچشمہ خواہ کچھ بھی ہو، میں یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ سیّد کی کتاب 'اسبابِ بغاوتِ ہند' کا اس تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اپنی کتاب میں سپاہیوں کے ردِعمل یا مذہبی عقائد کو بغاوت کے لیے ذمّے دار ٹھہرانے کے بجائے بہت صاف لفظوں میں سیّد نے کہا کہ اس بغاوت کے پیچھے کوئی ایک یا علاقائی وجہ نہیں بلکہ کئی طرح کی شکایتیں تھیں جو مدتِ طویل سے لوگوں کے دلوں میں سلگتی رہی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہی چنگاریاں بارود کے ڈھیر میں بدل گئیں اور اس کے دھماکے کے لیے صرف ماچس کی ایک تیلی کی ضرورت تھی جو باغی سپاہیوں نے استعمال کی۔

"AS REGARDS THE REBELLION OF 1857, THE FACT IS, THAT FOR A LONG PERIOD, MANY GRIEVANCES HAD BEEN RANKING IN THE HEARTS OF THE PEOPLE. IN COURSE OF TIME, A VAST STORE OF EXPLOSIVE MATERIAL HAD BEEN COLLECTED. IT WANTED THE APPLICATION OF A MATCH TO LIGHT IT, AND THAT MATCH WAS APPLIED BY MUTINEERS ARMY."

(The Causes of the Indian Revolt. P. 3)

اس لیے یہ کہنا کہ سیّد نے بغاوت کو ہندوستانی سپاہیوں کے مذہبی عقائد کا نتیجہ بتا کر انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملائی تھی یا بغاوت سے متعلق انگریزوں کے اخذ کردہ نتائج کی حمایت کی تھی، بالکل بے بنیاد اور سراسر غلط بات ہوگی۔ یہ سیّد کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی ہوگی۔

لیکن ایک بات جو اس کتاب کے بارے میں قبولِ عام ہے اور عام طور پر کہی جاتی ہے بالکل سچ ہے کہ اس کتاب کا ایک بڑا مقصد مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان دشمنی کو کم کرنا، انگریزوں کی نظر میں مسلمانوں کو بے قصور ثابت کرنا اور انگریزی حکومت کے طور طریقوں میں مسلمانوں کی جانب سدھار لانا تھا۔ یہاں مسلمانوں پر زور دینے کا مطلب یہ

نہیں ہے کہ سیّد ہندوؤں کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔ سیّد نے عام طور پر سارے ہندوستانیوں کی بات کی ہے لیکن انھیں مسلمانوں کی فکر زیادہ تھی، یہ فطری تھا اور ۱۸۵۷ء کے سیاق میں اس کے کچھ خاص اسباب بھی تھے جنھیں ہم آگے بیان کریں گے۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جو کچھ ہوا، اُسے کیا کہا جائے؟ انگریز اسے میوٹنی (غدر، فساد، بلوہ) کہتے تھے۔ سیّد نے 'بغاوت' (ریوولٹ) کہا۔ بے شک سیّد اسے ہندوستان کی جنگِ آزادی نہیں مان سکتے تھے (حالاں کہ اس بغاوت میں انھوں نے سرکار کو بدلنے کی کوششیں دیکھیں)۔ اُس زمانے میں کسی نے بھی اُسے جنگ آزادی نہیں کہا۔ یہ تو بیسویں صدی کے تعلیم یافتہ قوم پرست تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کو نئے سرے سے سمجھتے ہوئے اس کی دوبارہ سے تصویر بناتے ہوئے (Reconstruct کرتے ہوئے) اسے ہندوستان کی جنگِ آزادی کا نام دیا۔ اس طرح اپنی قیادت میں چلنے والی قوم پرست تحریک کو انھوں نے ایک شاندار ماضی کی بنیاد فراہم کی۔ بے شک، انگلینڈ میں بیٹھے کارل مارکس نے ہی پہلی بار اُسے ہندوستان کی جنگِ آزادی کی صورت میں دیکھا تھا۔ لیکن اُن کے اِن خیالات سے واقفیت ہندوستانیوں کو پوری ایک صدی کے بعد جا کر تب ملی جب ۱۸۵۷ء سے متعلق مارکس کی تحریروں کے ایک انتخاب کا انگریزی ترجمہ پہلی بار ۱۸۵۹ء میں ماسکو سے چھپ کر آیا۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کو انگریزوں نے میوٹنی (غدر) اور سیّد نے بغاوت کہا۔ غدر کے ایک معنی بغاوت بھی ہوتے ہیں۔ دونوں لفظوں کے درمیان بنیادی فرق ان کی جامعیت اور مقصد کی وجہ سے ہے۔ غدر ایک محدود علاقے میں واقع بغاوت یا حکم عدولی کرنے کو کہتے ہیں۔ عام طور پر اس کا استعمال فوج میں ماتحتوں کا اپنے افسروں کا حکم نہ ماننے کے معنی میں ہوتا ہے۔ بغاوت زیادہ جامع لفظ ہے جس کا استعمال عام طور پر سرکار کے حکم کو نہ ماننے اور اسے اکھاڑ پھینکنے کی کوششوں کے معنی میں ہوتا ہے۔ شروع میں ہی سیّد نے بغاوت کی اصطلاح پیش کرتے ہوئے اس کے پانچ مقاصد واضح کیے ہیں:

۱- سرکاری ملزموں کا مخالفت کرنا، ان کے خلاف لڑنا۔
۲- حکم عدولی کر کے سرکاری اقتدار و اختیار کی مخالفت کرنا۔
۳- سرکار کے خلاف جنگ کرنے والوں کا ساتھ دینا۔

۴- سرکار کے خلاف بے اطمینانی کے بیج بونا تاکہ غیر قانونی فساد بھڑکیں۔
۵- لوگوں کے دل سے سرکار کے لیے عزت اور وفاداری کے جذبے کو ختم کر دینا تاکہ سرکار کے خلاف لوگوں سے عملی مدد حاصل کی جا سکے۔

۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا، سیّد نے اُسے کمپنی کی حکومت کے خلاف ایک ایسی بغاوت مانا جسے سپاہیوں نے شروع کیا تھا پھر اس میں نواب، راجا، تعلقہ دار، زمیندار اور عام لوگ بھی شامل ہو گئے۔ یہاں یہ بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ سیّد کی اصطلاح کے مُطابق بغاوت ایک غیر قانونی عمل ہے۔ سرکار کے خلاف ایک غیر قانونی کارروائی —— پھر اس کے اسباب خواہ کتنے بھی جائز کیوں نہ ہوں۔ اُن اسباب پر دھیان دے کر بغاوت کو سمجھا تو جا سکتا ہے، اس سے سبق سیکھا جا سکتا ہے لیکن اُسے جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا، اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔

سیّد نے اُن اسباب پر خیال آرائی کی ہے جن کی وجہ سے ۱۸۵۷ء میں کمپنی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے انھوں نے ایسے کئی اسباب کو خارج کیا ہے جنھیں اس زمانے میں کئی لوگ بغاوت کے ساتھ جوڑ رہے تھے جیسے سیّد نے یہ ماننے سے انکار کیا کہ ضلعے ضلعے میں جو چپاتیاں بھیجی جا رہی تھیں وہ بغاوت کا پیغام پھیلانے کے لیے تھیں۔ انھوں نے اس سے بھی انکار کیا کہ بغاوت کے پیچھے روس یا ایران کا ہاتھ تھا۔ بغاوت کے اسباب میں یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ دلّی کے بادشاہ نے ایران کے بادشاہ کو ایک فرمان بھیجا تھا۔ سیّد نے لکھا کہ دلّی کے اس بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کو اپنی غیبی طاقت کے بارے میں جس طرح کی خوش فہمی رہی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے بے شک اُس نے ایسا کوئی فرمان بھیجا ہوگا۔ لیکن اس کے فرمان کی بنیاد پر کسی بغاوت کا وقوع میں آنا بالکل ناممکن ہے۔ اودھ کو ہڑپا جانا بھی اس بغاوت کی وجہ نہیں ہو سکتا۔ اودھ کے ہڑپے جانے سے سب سے زیادہ خوف دوسرے راجاؤں، نوابوں کو ہونا چاہیے تھا کیوں کہ مستقبل میں ان کی ریاستیں بھی انگریز ہڑپ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے بغاوت کرنے کے بجائے اس کے بالکل برعکس یعنی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ دلّی کے بادشاہ کو بحال کرنے کے لیے ہی بغاوت کی گئی تھی۔ سیّد نے، جو کہ بچپن سے مغل بادشاہوں کو قریب سے دیکھتے سنتے آئے تھے اور اس لیے اُن کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے اچھی طرح واقف

تھے، لکھا کہ دلّی سے باہر کے لوگ اس مغل بادشاہ کو چاہے جو سمجھتے رہے ہوں، خود دلّی والوں کو اس بارے میں کوئی مغالطہ نہیں ہے اور وہ اس بادشاہ کی اصلیت اور بے وقوفیوں سے خوب واقف ہیں۔ اس لیے ایسے بادشاہ کے ہٹائے جانے سے انھیں کیوں افسوس ہوگا؟ نہ ہی فوج کے اندر بغاوت کی کوئی سازش رچی گئی تھی۔ باغی فوجیوں نے دلّی پہنچ کر بادشاہ کو بحال کیا تو اس کی وجہ فوجیوں کے دل میں بادشاہ کے لیے کسی طرح کا احترام کا جذبہ نہیں تھا بلکہ سرکار کے خلاف بغاوت کر دینے کے بعد بادشاہ کے اردگرد جمع ہونے کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

سیّد نے خصوصاً زیادہ انکار اس بات سے کیا کہ ہندوستانی مسلمان طویل مدت سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا منصوبہ بناتے آرہے تھے اور باغی سپاہی جب دلّی میں داخل ہوئے تو دلّی کے بڑے مولویوں نے فتویٰ جاری کر کے باقاعدہ جہاد کا اعلان کر دیا۔ سیّد نے زور دے کر کہا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے مذہب میں کبھی کوئی دخل نہیں دیا، لہٰذا مسلمان ان کے خلاف جہاد کیوں کرتے؟ پینتیس سال پہلے محمد اسماعیل نے جہاد کی بات کہی تھی لیکن انھوں نے ہی یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان کے لوگ برٹش حکومت میں رہتے ہوئے جہاد نہیں کر سکتے، لہٰذا مجاہد سرحد کے پار چلے گئے جہاں انھوں نے سکھوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ دلّی میں سپاہیوں کے داخل ہونے کے بعد جو فتویٰ جاری ہوا، سیّد کے مطابق وہ جعلی تھا جو کسی شرپسند نے سپاہیوں کو اکسانے کے لیے جاری کیا تھا۔ وہ فتویٰ جو سب سے پہلے جاری ہوا تھا اس کی اصل صورت کہیں ملتی نہیں ہے اور جو دوسرا فتویٰ ملتا ہے وہ جعلی ہے۔ اس کے علاوہ دلّی کے بڑے مولوی بہادر شاہ کو ایک صحیح مذہبی شخصیت ہی نہیں مانتے۔ یہ مولوی تو اُس مسجد میں نماز تک نہیں پڑھتے تھے جس میں بہادر شاہ نماز پڑھنے جاتے تھے۔ مولوی پہلے بھی بہادر شاہ کے خلاف اپنا اختلافِ رائے ظاہر کر چکے تھے۔ ایسے بادشاہ کی قیادت میں جہاد کرنے کے لیے بھلا وہ کیوں کہتے؟ سیّد کے مطابق ۱۸۵۷ء میں جہاد کا نعرہ جن لوگوں نے بلند کیا تھا وہ پھٹے حال اور شرابی قسم کے بے روزگار لوگ تھے۔ انھیں مذہب کا علم ہی کیا تھا؟ وہ تو صرف سرکاری خزانہ لوٹنا جانتے تھے۔ لیکن کسی سے نمک حرامی کرنا مذہب کی رو سے پہلا جرم ہے!

بغاوت بپا ہونے کے پیچھے سیّد نے پانچ اسباب بتائے اور ان کی بالتفصیل تشریح کی:

۱- بغاوت کا پہلا سبب، سیّد کے خیال میں، حکومت کے ارادوں کے بارے میں لوگوں کا شک تھا اور سب سے بڑا شک مذہب کو لے کر تھا۔ لوگوں میں یہ شک پھیل گیا تھا کہ یہ حکومت ہندو اور اسلام مذہب کے ماننے والوں پر عیسائی مذہب اور بدیسی طور طریقے تھوپنا چاہتی ہے، ہر شخص کو یہ یقین ہوگیا تھا —— چاہے وہ اَن پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ۔ یہی بغاوت کا ایک بڑا سبب بنا۔ ایسے کئی واقعات بھی رونما ہوئے جن سے لوگوں کا یہ شک یقین میں بدل گیا۔ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ یہ حکومت گھما پھرا کر انھیں غریب اور کمزور بنا کر عیسائیت کی طرف دھکیلنا چاہتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۸۳۷ء میں شمال مغربی علاقے میں قحط کے دوران جو بچے یتیم ہوگئے تھے، انھیں حکومت نے اپنے قبضے میں لے کر عیسائی مشنریوں کے سپرد کردیا، بھلے ہی وہ یتیم بچے ہندو یا مسلمان خاندانوں سے رہے ہوں۔ لوگوں کو یہ بھی یقین ہوگیا تھا کہ مشنریوں کو سرکار نے ہی تعینات کیا ہے اور ان کا خرچ بھی وہی اٹھاتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ایسے خیال کیوں نہ پیدا ہوتے جب کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ سرکاری اور فوجی افسر اپنے ہندوستانی ماتحتوں سے ان کے مذہب کے بارے میں پوچھ تاچھ اور بحث کرتے تھے اور نوکروں چاکروں تک کو پادریوں کا وعظ سننے کے لیے اپنے گھروں میں بلاتے تھے۔ عیسائی مشنری سوال جواب کی صورت میں چھپی ہوئی اپنی اُن چھوٹی چھوٹی کتابوں کو کھلے عام بیچتے تھے جن میں دوسرے مذہب والوں کے خلاف بہت سی چڑانے والی باتیں جارحانہ انداز میں لکھی ہوتی ہیں۔ مشنری ان میلوں اور ہاٹ بازاروں میں پہنچ کر، جہاں سبھی مذاہب کے لوگ جمع ہوتے ہیں، عیسائی مذہب کی کھل کر تبلیغ کرتے۔ یہ صرف اپنے مذہب کی تبلیغ تک محدود نہ رہتے بلکہ دیگر مذاہب اور ان کے مقدس مقامات کے خلاف مذمت آمیز تقریریں بھی کرتے۔ اس سے ان مذہبی لوگوں کے جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچتی ہوگی اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مشنریوں کی ایسی تبلیغ کے دوران تھانے کے پولیس افسر بھی ان کی حفاظت میں ساتھ کھڑے رہتے۔ ان سب باتوں کے علاوہ حکومت نے اسکول کے نصاب سے نہ صرف سنسکرت اور عربی زبانوں کو خارج کردیا تاکہ لوگ اپنی مذہبی کتب کو نہ پڑھ سکیں۔ بلکہ اسکولوں میں عیسائی مذہب کے عقائد کو پڑھایا جانے لگا اور امتحان میں عیسائی مذہب کے بارے میں سوال پوچھے جاتے جن کے جواب عیسائی مذہب سے واقفیت کے بغیر نہیں دیے جاسکتے۔ ان سرکاری اسکولوں میں بچّوں کو داخل کرانے کے لیے جب محکمۂ تعلیم کے ڈپٹی انسپکٹر دیہاتوں میں جاتے تو

لوگ انھیں دیسی پادری کے نام سے پکارتے۔ سرکاری نوکری بھی صرف انھیں اسکول کالجوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو ملتی۔ اس سے یہ شک پختہ ہوتا ہے کہ عیسائی مذہب کی تعلیم دینے والے اسکولوں، کالجوں سے دور رہنے والوں کو یہ حکومت ملازمت دینا نہیں چاہتی تاکہ وہ لوگ غریب ہوتے چلے جائیں اور آخرکار مجبور ہوکر عیسائیت قبول کرلیں۔ جب اپنے مذہب کی وجہ سے لوگوں کے دل و دماغ انھیں شک وشبہات سے بے چین تھے اسی دوران حکومت نے کچھ ضلعے کی جیلوں میں ہندو اور مسلمان، دونوں مذاہب کے قیدیوں کے لیے ایک ہی باورچی کے ہاتھ کا کھانا بنوانے کا حکم جاری کردیا۔ یہ ذات پات کے مطابق ہندو قیدیوں کے لیے نہایت قابلِ اعتراض بات تھی اور مسلمان قیدیوں نے بھی اسے سخت ناپسند کیا۔ اور ان سب سے اہم بات یہ کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہونے سے کچھ پہلے ۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے مسٹر ایڈمنڈ نے سبھی سرکاری محکموں کو ایک خط بھیجا جس میں یہ کہا گیا کہ اب سارا ہندوستان ایک ہی حکومت کے تحت آگیا ہے، بجلی کے تاروں نے بھی پورے ہندوستان کو ایک کردیا ہے، لہٰذا سبھی ہندوستانیوں کا مذہب بھی اب ایک ہی ہوجانا چاہیے۔ وہ ایک مذہب عیسائی مذہب ہی ہوسکتا ہے کیوں کہ وہی دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور سائنسی تہذیب کا نمائندہ ہے۔ اس خط کو پڑھ کر سرکاری محکموں کے دیسی افسروں کے پیروں تلے کی زمین ہی کھسک گئی۔

۲- سیّد کے مطابق بغاوت کا دوسرا سبب کمپنی کی حکومت سے جاری ایسے قوانین اصولوں اور ضابطوں کو لاگو کرنا تھا جو نہ صرف ہندوستان کی مروّجہ روایات اور طور طریقوں کے خلاف تھے بلکہ جن کا اطلاق بھی قابلِ اعتراض تھا۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۰ء میں پاس کیا گیا ایکٹ ۲۱، جو ہندوستان میں مختلف مذاہب کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کرتا ہے۔ تبدیلیِ مذہب سے متعلق یہ قانون ہندوؤں کے کسی کام کا نہیں ہے کیوں کہ ہندوؤں میں مذہب کی تبدیلی ہوتی ہی نہیں۔ اسلام مذہب اپنانے والوں کو یہ قانون اپنے آبا واجداد کی جائیداد سے محروم کرتا ہے جب کہ عیسائی مذہب قبول کرنے والوں کو کئی فائدے پہنچا کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسی طرح ۱۸۵۶ء کا ایکٹ ۱۵، اپنے سرپرست کی رضامندی کے بغیر بھی بیوہ ہندو عورت کو دوبارہ شادی کرنے کا حق دیتا ہے اور فوجداری عدالت میں ایک شادی شدہ عورت کو، بغیر کسی سرپرست کی موجودگی کے، ایک آزاد شخص کی حیثیت سے گواہی دینے کا حق دیتا ہے۔ ان دونوں قانونوں کو سیّد نے ہندوستانیوں کے مذہب اور

سماجی رسم و رواج کے خلاف مانا۔

۱۸۱۹ء میں پاس کیے گئے ریگولیشن-۶ کی سیّد نے سخت نکتہ چینی کی۔ اس ریگولیشن کے مطابق پہلے جو معافی والی زمین تھی یعنی جس پر لگان معاف تھا، اُس پر دوبارہ سے لگان وصول کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ اِسے بغاوت کا ایک اہم سبب مانتے ہوئے سیّد نے لکھا کہ سرکار کے اس اقدام سے لوگ بے زمین ہو کر فقیر ہو گئے اور غصے سے بھر گئے کہ اس سرکار نے ان کے فائدے کے لیے تو کچھ نہیں کیا بلکہ پچھلی سرکار نے جو کیا تھا اُسے بھی الٹ دیا۔ باغیوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کمپنی کی دھوکے بازی اور زیادتیوں کے جو اشتہار لگائے، اُس میں انھوں نے انھیں مسئلوں کا ذکر کیا (پہلا، مذہب میں دخل اندازی؛ دوسرا، معافی والی زمین پر دوبارہ سے مالگزاری کی وصولیابی)۔ اس ریگولیشن کے شکار یوں تو سبھی ہندوستانی تھے لیکن مسلمان بالخصوص اس کا شکار ہوئے۔

بقایا مالگزاری کے لیے علاقے یا زمینداری کا بک جانا سیّد کے مطابق بغاوت کا ایک بڑا سبب تھا۔ زمینداری کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانا پہلے بھی ہوتا تھا لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا اور جہاں بھی ہوتا تھا دونوں فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوتا تھا لیکن انگریزی حکومت میں بنے قانونوں سے ان زمینداروں کی زمینداریاں دھڑلے سے بکنے لگیں جن پر سرکاری مالگزاری تھوڑی سی بھی باقی رہ گئی تھی۔ اس سے زمیندار طبقے کی بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ اس قانون سے بنیوں اور مہاجنوں کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ اپنے قرض کی وصولی کے لیے وہ زمیندار یا کسان کی زمین جائیداد اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں، بکوا دیں یا نیلام کرا دیں۔ اس قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنیوں اور مہاجنوں نے دیوانی عدالت میں زمینداروں کے خلاف ہزاروں سچّے جھوٹے مقدمے دائر کر دیے اور کئی جگہ پرانے زمینداروں کو بے دخل کر کے خود زمین کے مالک بن گئے۔ سیّد نے لکھا کہ جب سے اس ملک میں انگریزی حکومت قائم ہوئی ہے، ایک بھی گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں اس قانون سے زمین کی ملکیت میں الٹ پھیر نہ ہوا ہو۔ اسی طرح لوگوں کو تباہ کرنے والی دوسری وجہ مالگزاری کی رقم کا بہت زیادہ ہونا تھا۔ یہ اضافہ شدہ رقم بھی مستقل طور پر متعین کر دی جاتی اور اس کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا کہ فصل اچھی ہوئی ہے یا خراب۔ ہر حالت میں کسان کو لگان اور زمیندار کو مالگزاری دینی ہی ہوتی۔ ایسی سختی سے مالگزاری ادا کرنے

کے لیے کسان اور زمیندار، دونوں کو اکثر قرض لینا پڑتا تھا۔ قرض ادا نہ کر سکنے کی صورت میں دوبارہ سے زمین ان کے ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی حکومت کے زمینی بند و بست میں کئی اچھائیاں ہونے کے باوجود کسان اور زمیندار مغل دور کے پرانے دنوں کو یاد کرتے جب ان کی ایسی تباہی نہیں ہوئی تھی۔

سیّد احمد کو زراعتی معاشیات اور مالگزاری کے نظام، دونوں سے گہری واقفیت تھی۔ بغاوت کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے انگریزوں کی لگان کی پالیسی پر سوال اٹھایا اور اسے ہندوستانی روایات کے خلاف بتایا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انگریز حکام لگان کو جس معنی میں لیتے ہیں، اس معنی میں لگان ہندوستان میں کبھی نہیں رہا۔ ہندوستانی روایات میں لگان پیداوار کے ایک حصے کو کہتے ہیں۔ کسان کی پیداوار یا فصل میں راجا کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ وہ حصہ کہیں ایک تہائی، کہیں ایک چوتھائی اور کہیں چھٹا حصہ ہوتا تھا۔ فصل زیادہ ہوتی تھی تو وہ حصہ بھی خود بخود زیادہ ہو جاتا تھا۔ فصل کم ہوتی تھی تو وہ حصہ بھی کم ہو جاتا تھا۔ ہندوستان میں لگان اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا اور مغلوں نے بھی اسی ہندوستانی روایت کو برقرار رکھا۔ لیکن انگریزوں نے ہندوستان میں آکر لگان کے ایک بالکل نئے اور اجنبی تصور کا اطلاق کیا۔ ان کے نظریے کے مطابق لگان، فصل کا حصہ نہ ہونے کے بجائے زمین کا کرایہ ہو گیا۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ اصول نہ صرف اجنبی بلکہ غیر منصفانہ بھی تھا۔ کیوں کہ اس میں لگان کا تعلق فصل سے نہیں تھا۔ زمین کے سالانہ کرایے کی شکل میں لگان کی رقم مستقل طور پر بندھ گئی جو ہر حال میں کسان کو ادا کرنی ہوتی تھی، کھیت میں فصل ہوئی ہو یا نہیں۔ اسی کرایے کو زمیندار اور سرکار اپنی مرضی سے بڑھانے کا حق بھی رکھتے تھے۔

اودھ میں تعلقہ داری کے حقوق کو ختم کرنا بھی بغاوت کا ایک اہم سبب بنا۔ یہ سچ ہے کہ تعلقہ داروں میں کئی برائیاں تھیں اور رعیت کو اُن کے استحصال سے بچانے کا سوال بھی اہم تھا اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے حقوق کو اچانک چھین لینے سے وہ بے چین ہو اٹھے اور سرکار کے خلاف باغیوں کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔

انگریزوں کے لاگو کیے گئے نئے قانونی طور طریقوں میں سیّد نے عدالتوں میں اسٹیمپ پیپر کی یوروپی رسم کو ہندوستان میں لاگو کرنا بھی بغاوت کا ایک سبب بتلایا۔ انھوں نے لکھا کہ ۱۸۲۹ء کے ریگولیشن-۱۰ کے تحت لاگو کیا گیا اسٹیمپ پیپر نظام غریب ہندوستانیوں کے لیے

نہ صرف بہت مہنگا ہے بلکہ انصاف حاصل کرنے کی راہ میں یہ ایک رکاوٹ بھی ہے۔ انصاف کے لیے ٹیکس کی بھاری رقم مانگنا (اسٹیمپ پیپر کی شکل میں) خود انصاف کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنا ہے۔ سیّد کے مطابق اس نظام کی جو برائیاں یوروپ میں گنائی جاتی ہیں، وہ ہندوستان میں اس سے دس گنا زیادہ ہوکر لاگو ہوتی ہیں۔

۳- بغاوت کا تیسرا سبب حکومت اور عوام کے درمیان کسی بھی طرح کے باہمی رابطے کی کمی تھی۔ موجودہ سرکار اپنی رعایا کے دکھ درد اور اس کے جذبات اور خواہشات سے انجان رہی ہے۔ رعایا کے پاس بھی اپنی آواز سرکار تک پہنچانے کا کوئی وسیلہ یا قانونی راستہ نہیں ہے۔ سرکار کو اپنے ماتحت افسروں سے عام لوگوں کی حالت کے بارے میں رپورٹ ضرور ملتی ہے لیکن یہ افسر خود عوام کی اصل حالت اور اس کے خیالات سے انجانے رہتے ہیں کیوں کہ انھیں جاننے کا اُن کے پاس کوئی طریقہ نہیں ہوتا۔ سرکاری حکام عام لوگوں کے ساتھ متکبرانہ رویہ رکھتے ہیں، اس کے بارے میں کون نہیں جانتا؟ اس حکومت کی اپنی رعایا سے مکمل طور پر علاحدگی رہی ہے۔ عوام کے حقوق کے لیے کھڑا ہونے اور انھیں انصاف دلانے والا ان کا کوئی نمائندہ سرکار میں شامل نہیں رہا ہے۔ سرکاری انتظامی طرزِ عمل کی وجہ سے ہی ہندوستان کے لوگ آج غریب ہیں اور تکلیفوں میں زندگی گزار رہے ہیں، خاص طور پر یہاں کے مسلمان۔ ہندو اس ملک کے اصلی باشندے ہیں اور ہمیشہ سے اپنا روزگار طبقاتی درجہ بندی کے تحت چلاتے آئے ہیں۔ ہندوؤں میں صرف کائستھ ہی ملازمت پر انحصار کرتے ہیں لیکن مسلمان اس ملک کے اصل باشندے نہیں ہیں۔ وہ باہر سے آئے ہیں اور اپنی گزر بسر کے لیے پوری طرح سے سرکاری نوکریوں پر منحصر رہے ہیں۔ انگریزی حکومت میں وہ اب بڑی تعداد میں بے روزگار ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب باغیوں نے عام لوگوں سے اپنی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کہا تو ہزاروں لوگ ایک ڈیڑھ آنے کی یومیہ مزدوری پر بھی ان کی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے ویسے ہی ٹوٹ پڑے جیسے قحط میں بھوکے لوگ کھانے پر ٹوٹتے ہیں۔ انگریزوں سے پہلے کی سابقہ سرکاروں نے کئی طرح کی خدمات کے بدلے لوگوں کو عطیے کی شکل میں زمینیں دے رکھی تھیں۔ کمپنی سرکار نے نہ صرف ان روایات و اقدار کو ختم کردیا بلکہ پچھلی سرکاروں کی طرف سے دیے گئے عطیوں کو بھی واپس لے کر لوگوں کو بڑے پیمانے پر بے روزگار کردیا اور اس طرح انھیں اپنے خلاف کھڑا کرلیا۔ صرف امیر ہی نہیں، غریب بھی انگریزی حکومت میں بے روزگار ہوئے۔

انگلینڈ کے ساتھ تجارت شروع ہونے سے اس ملک میں چھوٹے چھوٹے کاریگروں کو بھی تباہی کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ وہ مشینوں سے بنے سامان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مشینوں سے بنے انگلینڈ کے سامان نے ہندوستان کے بازاروں میں اس قدر اپنا قبضہ جمایا کہ آج یہاں دیسی دھاگا یا دیا سلائی تک کوئی نہیں خریدتا۔ دیس کے بنکر برباد ہوگئے۔ برٹش حکومت نے تباہ و برباد لوگوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ یہ لوگ بھی باغیوں کی حمایت میں جا کھڑے ہوئے۔

سیّد نے بڑے صاف لفظوں میں کہا کہ پچھلی سرکار کے زیر پناہ جو ثروت مند اور طاقت ور تھے، کمپنی سرکار نے انھیں غربت کی حالت میں دھکیل دیا۔ یہ بغاوت کا ایک بڑا سبب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے انگریزی حکومت کو ہٹانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگریزوں نے افغانستان کو فتح کیا تو ان لوگوں کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ جب گوالیار اور پنجاب پر فتح حاصل کی گئی اور اودھ کو ہڑپ لیا گیا تو ان لوگوں کے دلوں میں سرکار کے خلاف شک اور اختلاف کا جذبہ مزید گہرا ہوگیا کیوں کہ ان دیسی ریاستوں کی حکومتوں میں یہی دیسی لوگ اعلا عہدوں پر فائز تھے۔ سیّد نے لکھا کہ بے شک کمپنی سرکار نے کئی اچھے کام بھی کیے ہیں، اس لیے میں کمپنی کی حکومت کو پوری طرح سے خارج نہیں کرتا لیکن ان اچھے کاموں کے باوجود درج بالا اسباب سے لوگوں میں حکومت کے خلاف بے اطمینانی کا احساس گھر کر گیا تھا۔

۴۔ چوتھا سبب: کئی سنجیدہ اور نازک معاملوں میں اس سرکار نے لاپروائی اور بے اعتنائی کا برتاؤ کیا ہے جب کہ اُسے ان کے بارے میں غور و خوض کرنا چاہیے تھا۔ اس سرکار نے اپنی رعایا کا یقین جیتنے، اس کی حمایت حاصل کرنے اور اُس سے دوستانہ رشتے بنانے کا اپنا فرض پورا نہیں کیا۔ سیّد نے دوٹوک ڈھنگ سے لکھا —— یہ رعایا کا کام نہیں ہے کہ وہ سرکار سے دوستانہ برتاؤ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ سرکار کا کام ہے کہ وہ اپنی رعایا سے دوستانہ مراسم کرنے کی سعی کرے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اگر یہ سرکار اب بھی یہی سمجھ رہی ہے کہ ''میں (سیّد) جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ درست نہیں ہے اور حکومت نے لوگوں کی محبت حاصل کرنے کی واقعتاً کوشش کی تھی لیکن لوگوں نے اُس کا بدلہ دشمنی سے چکایا —— تو میں اتنا ہی کہوں گا کہ اس سرکار نے سچ مچ یہ کام ڈھنگ سے کیا ہوتا تو اس کی

حمایت میں کھڑے ہونے کے بجائے لوگوں نے آج اُس کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے ہوتے۔'' (ص ۴۰)

سیّد کے مطابق، یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ انگریزوں سے پہلے اس ملک کو فتح کرنے والے مسلمانوں کا خون یہاں کے اصل باشندوں سے الگ تھا۔ ان کے سماجی رسم و رواج، تہذیب و اخلاق اور مذہب بھی آپس میں میل نہیں کھاتے تھے۔ دل کی گہرائیوں سے وہ ایک دوسرے کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان کے درمیان میل جول بھی بہت کم، بلکہ نہیں کے برابر تھا۔ لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ حاکم اور محکوم کی صورت میں ان کی دوستی قائم ہوتی چلی گئی۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ ایک دن میں نہیں ہوا۔ ان کی دوستی دراصل مغل بادشاہوں کی، بالخصوص اکبر کی اُن غیر جانب دارانہ پالیسیوں کی بدولت ہوئی جو شاہ جہاں کے دور تک جاری رہیں۔ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں دوستی کا یہ جذبہ ختم ہوگیا کیوں کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ دوستی کے بجائے سخت گیری کا رویہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے حاکموں کو سب کے ساتھ سختی سے پیش آنے اور ہر حال میں خراج وصول کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اس سے لوگوں میں بے اطمینانی پیدا ہوئی اور اس کے خلاف بغاوت ہونے لگی۔ ''اب انگریز سرکار پچھلی ایک صدی سے یہاں قائم ہے لیکن آج تک وہ اپنی رعایا کی خوشنودی اور محبت حاصل نہیں کر پائی'' (ص ۴۱)۔ سیّد نے لکھا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریز افسروں کا برتاؤ ذلّت آمیز رہا ہے۔ جب انگریز شروع شروع میں ہندوستان آئے تھے تب ان کا رویہ ایسا نہیں تھا اور ہندوستانی بھی اُن کے خلاف نہیں تھے جیسے اب ہوگئے ہیں۔ حکومت کے بارے میں لوگوں کا نظریہ سرکار کے افسروں کے برتاؤ اور طور طریقوں کو دیکھ کر طے نہیں ہوتا)۔ انگریز افسر کسی بھی ہندوستانی کو 'شریف' سمجھتے ہی نہیں۔ ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا رویہ پچھلے کچھ برسوں سے اور خراب ہوتا جارہا تھا۔ عیسائی مذہب تو دوسروں کو اپنا بھائی سمجھ کر ان سے نرم دلی اور بھلائی کا برتاؤ کرنے کی تعلیم دیتا ہے لیکن بدقسمتی سے یہاں اس کے برعکس ہے۔ ہندوستانی لوگ انگریزوں کو اتنی خوف زدہ نگاہوں سے کبھی نہ دیکھتے، اگر انگریز افسر ہندوستانیوں کے ساتھ اپنے غرور اور اپنے توہین آمیز برتاؤ کا وہ مظاہرہ نہ کرتے کہ جیسے ہندوستان ان کی نگاہ میں کوئی چیز ہی نہیں! ہندوستان کا کوئی بھی دولت مند اور اعلا طبقے کا فرد ان افسروں کے سامنے گھبراہٹ محسوس کرتا ہے۔ ان افسروں کے ماتحت کام کرنے والے کئی اچھے گھروں کے ہندوستانی بھی اکثر و بیشتر یہ کہتے ہیں کہ

کاش میرے پاس کوئی دوسرا روزگار ہوتا! ان کی نوکری کرنے سے تو گھاس کاٹ کر زندگی بسر کرلینا بہتر ہے۔ انگریز افسروں کا جارحانہ رویہ ویسے تو سبھی ہندوستانیوں کے لیے توہین آمیز ہے لیکن مسلمانوں کو ایسا خاص طور پر محسوس ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں مسلمان پچھلی کئی صدیوں سے اعلا عہدوں پر فائز رہے ہیں لہٰذا ایسی بدسلوکی کو ہضم کرلینا ان کے لیے ممکن نہیں۔ اس بدسلوکی سے انھیں سخت تکلیف ہوتی ہے اور اسی لیے وہ دل سے چاہتے ہیں کہ یہ سرکار بدل جائے۔ جب بھی کوئی اس سرکار کے خلاف کچھ بولتا یا کرتا ہے تو انھیں خوشی ہوتی ہے۔'' (ص ۴۴)

سرکار کے خلاف ہندوستانیوں کی، خصوصاً مسلمانوں کی، بے اطمینانی کا اہم سبب اعلا عہدوں سے انھیں دور رکھنا ہے۔ ابھی کچھ ہی برسوں پہلے تک یہاں کے لوگوں کی اپنی حکومت تھی اور اس میں ان کا معزز ترین عہدوں پر تقرر ہوتا تھا۔ وہ اب بھی یہی چاہتے ہیں لیکن انگریزی حکومت میں اپنے رتبے کو بڑھانے کا ان کے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔

حکومت پر سیّد یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ بغاوت کو دبانے کے بعد اس نے انتقامی جذبے سے کام کیا۔ اس نے غصے میں آکر بغاوت میں شامل سبھی طرح کے لوگوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جو صحیح نہیں تھا۔ بغاوت سے نمٹنے کے سلسلے میں حکومت کو پہلے اس پر غور کرنا چاہیے تھا کہ بغاوت کیوں ہوئی، کب ہوئی، کن حالات میں ہوئی اور اس انتہا تک کیسے پہنچی؟ سرکار کو یہ دھیان رکھنا چاہیے تھا کہ پچھلی کچھ صدیوں سے ہندوستان کے حالات غیر یقینی سے رہے ہیں۔ اُسے یہ بھی خیال رکھنا چاہیے تھا کہ جب کوئی طاقت ور راجا کسی علاقے پر فتح حاصل کرتا ہے تو اُس علاقے کے لوگ عام طور پر پہلے بادشاہ کو چھوڑ کر نئے بادشاہ کی پناہ میں آجاتے ہیں اور اس کی خدمت بجالانے میں کچھ بھی برائی نہیں سمجھتے۔ اسی لیے ہندوستان میں جب ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو مغلوب کرتا ہے تو مغلوب بادشاہ کے خدمت گزاروں کو، وہ چاہے فوجی ہوں یا شہری، کبھی سزا نہیں دیتا اور یہ ملازم بھی اپنے نئے بادشاہ کے تابع ہوکر اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ اس کو غلط بھی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب فاتح باغیوں نے لوگوں کو اپنی فوج میں شامل ہونے کے لیے کہا تو ہزاروں لوگ انھیں فاتح مان کر ان کے ساتھ ہوگئے۔ انھیں اُن کی نوکری بجا لانے میں کچھ بھی غلط نہیں لگا۔ بہت سے لوگوں نے یہی سمجھا کہ اب انگریزی حکومت

ہندوستان سے ختم ہوگئی ہے، اس لیے وہ بھی باغیوں کے جھنڈے تلے آ گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے بغاوت کے دوران انگریزوں کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن انگریزی حکومت دوبارہ قائم ہونے پر ان سب کے ساتھ حکومت نے ایک ہی جیسا برتاؤ کیا جو جائز نہیں ہے۔

بغاوت کا پانچواں سبب ہندوستانی فوج کے جذبات تھے۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے فوجی ڈھانچے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی عیب رہا ہے۔ اس کا ایک نقص یہ بھی تھا کہ فوج میں خود انگریزوں کی تعداد بہت کم رہی۔ ایک اور کمی بھی تھی — نادر شاہ نے جب فارس اور افغانستان کو فتح کیا تھا تو اس نے یکساں تعداد میں دو فوجیں رکھیں — ایک ایرانیوں کی فوج، دوسری افغانوں کی۔ ایک کے سر اٹھانے پر دوسرے کو اس کے خلاف کام میں لاتا تھا۔ انگریزوں سے غلطی یہ ہوئی کہ ہندوستان میں انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے مخالفت کا جذبہ رکھنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی رجمنٹ (Regiment) میں رکھ دیا۔ لگاتار ساتھ ساتھ رہتے ہوئے فطری ہے کہ ان میں اتحاد کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اگر دونوں کی رجمنٹ الگ الگ ہوتی تو ان میں ایسا اتحاد کا جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا جیسا بغاوت میں دیکھنے کو ملا۔ تب کم سے کم مسلم فوجی نئے کارتوسوں کے استعمال سے اس طرح انکار نہ کرتے جیسے ہندو فوجیوں نے کیا۔ اس کے علاوہ فوج میں گوروں کی تعداد بہت کم ہونے کی وجہ سے ہندوستانی فوجیوں نے ان کی طاقت کو کچھ بھی نہیں سمجھا اور مختلف لڑائیوں میں جو فتح حاصل ہوئی، اس کا سہرا بھی انھوں نے اپنے ہی سر باندھ لیا۔ فوج میں یہ کہاوت عام ہوگئی کہ برما سے کابل تک ہندوستان کو ہندوستانی فوجیوں نے ہی جیت کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اپنی اہمیت کا احساس اور ان کا غرور اتنا بڑھ گیا کہ فوج میں وہ جس چیز کو بھی ناپسند کرتے، اس پر اعتراض کرنے لگتے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ سرکار کا کام ان کے بغیر نہیں چل سکتا۔ بالکل اسی زمانے میں نئے کارتوس آئے جن کے بارے میں فوج کا یقین تھا کہ ان پر ایسی چربی لگی ہوئی ہے جس سے ان کے مذہبی عقائد کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے ان کارتوسوں کو منہ سے کاٹنے سے انکار کر دیا۔ ان کے اس انکار پر جب بیرک پور چھاؤنی کی رجمنٹ کو معطل کر دیا گیا اور اسی طرح کے حکم دوسری رجمنٹوں کو بھی دے دیے گئے تو سپاہی بے چین ہو اٹھے کیوں کہ انھیں لگا کہ کارتوس لینے سے انکار کر کے انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے اور ان کی رجمنٹ کو معطل کرنا

سراسر ناانصافی ہے۔ انھوں نے سوچا کہ اپنا خون بہا کر انگریزوں کو اتنے ممالک فتح کرائے اور اس کے بدلے میں ان کے مذہبی عقائد کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی گئی اور اپنے حق کے لیے کھڑے ہونے والے سپاہیوں کو سزا دی گئی! ان سب وجوہ سے انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ ہر حال میں کارتوس تو وہ استعمال نہیں کریں گے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں جب میرٹھ کے سپاہیوں کے سامنے سرکار نے یہ انتہا کردی کہ یا تو کارتوس لے کر منہ سے کاٹو یا پھر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو — تو مایوس ہوکر سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کردیا کیوں کہ اس کے علاوہ ان کے سامنے کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ دلّی میں آئے ہوئے بہت سے فوجیوں نے یہ کہا کہ ہم اور کیا کرتے جب ہم پر سرکار کا یقین ہی نہیں رہا اور وہ ہر حال میں ہمیں سزا دینے پر تُلی ہوئی تھی؟ جو باغی نہیں تھے اور سرکار کے وفادار رہنا چاہتے تھے، وہ بھی اکثریت کا ساتھ دینے کے لیے بغاوت میں شامل ہوگئے۔ دیہات اور شہروں کے عام لوگ بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ سرکار ہندوستانی فوج کی طاقت پر ہی چلتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے ہندوستانی سپاہیوں کو بغاوت کرتے دیکھا تو انھیں یقین ہوگیا کہ انگریزی حکومت اب یہاں قائم نہیں رہ سکتی۔ ان کے دلوں سے حکومت کا ڈر ختم ہوگیا اور وہ بھی بغاوت میں شامل ہوگئے۔

درج بالا پانچ اسباب کا تفصیل سے تجزیہ کرتے ہوئے سیّد نے بغاوت کا اہم ترین سبب لیجسلیٹو کاؤنسل (Legislative Council) میں کسی بھی ہندوستانی نمائندے کی عدم شمولیت ٹھہرایا۔ سیّد نے لکھا کہ باقی سبھی اسباب کی اصل وجہ یہی تھی۔ کیوں کہ کاؤنسل میں کسی ہندوستانی نمائندے کے نہ ہونے سے سرکار ملک کے مسائل سے بالکل بے خبر تھی اور اس کے برے نتیجے نکلے۔ ہندوستانی نمائندے کی غیر موجودگی سے سرکار یہ کبھی معلوم نہیں کر پائی کہ اُس کے منظور شدہ قوانین کا عوام پر کیا اثر پڑا اور عوام نے اُن قوانین کو کس نظر سے دیکھا۔ اپنے قوانین اور طرزِ حکومت کے بارے میں عوام کی ناپسندیدگی، ناراضگی اور مخالفت کے جذبے کو سرکار کبھی نہ جان سکی۔ موجودہ طرزِ حکومت میں عوام کے پاس اپنی آواز سرکار تک پہنچانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس سرکار اور عوام کو جوڑنے والا کوئی پُل نہیں ہے۔ اس سے دونوں فریقین کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جنھیں اور کئی باتوں سے مضبوطی ملتی گئی۔ ان سب کا نتیجہ بغاوت کی صورت میں سامنے آیا۔

تحقیق اور اخذ نتائج

سیّد نے بغاوت کے جو اسباب بیان کیے اور جنھیں اسباب ماننے سے انکار کیا، ان پر غور و خوض کریں تو سیّد کی تحقیق کی خوبیاں، خامیاں اور تضادات سبھی واضح ہوجاتے ہیں۔ ان کا یہ تضاد نہایت آسانی سے نظر آجاتا ہے کہ ایک طرف تو وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب اور مقدس مقامات کے خلاف عیسائی مشنریوں کی گمراہ کن یا غلط تبلیغ اور جارحانہ رویوں کی کئی مثالیں پیش کرتے ہیں، دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے مذہب کے معاملات میں مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ان کی تحقیق کی یہ کمزوری بھی نہایت آسانی سے نظر آجاتی ہے جسے سیّد بغاوت کا اہم ترین اور اصل سبب ٹھہراتے ہیں وہ درحقیقت نہ تو اہم ترین سبب تھا نہ ہی اصل سبب تھا۔ لیجسلیٹو کاؤنسل میں ہندوستانی نمائندے کی موجودگی سے کچھ فائدے ہوسکتے تھے اور یہ دلیل سمجھ میں آتی ہے۔ ایسا نہ ہونے سے جو مسائل پیدا ہوتے رہے وہ بھی سمجھ میں آتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ اسی کی وجہ سے باقی اسباب پیدا ہوئے اور یہی بغاوت کا اہم ترین سبب تھا — یہاں انگریزوں کو اتنا نیک، انصاف پسند اور رعایا کا خیرخواہ مان لیا گیا ہے جو اپنے معاشی اور سیاسی مقاصد کی پروا نہ کرتے ہوئے لیجسلیٹو کاؤنسل میں ہندوستانی نمائندے کی آواز سن کر ان کے دلائل سے متاثر ہوجائیں گے اور اُسی کی بنیاد پر قانون بنائیں گے یا قوانین کو بدل دیں گے۔

لیکن سیّد احمد کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے سپاہیوں کی حکم عدولی کو سامنے نہ رکھا بلکہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کو ایک وسیع تناظر میں دیکھا اور اس تناظر کے سماجی، تہذیبی اور معاشی پہلوؤں کو بھی سامنے لے آئے۔ یہ اُن حالات میں انگریزوں کے زاویۂ نظر سے بہت الگ اور وسیع تر غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ اس زمانے میں مروّجہ کچھ نظریوں سے ان کا انکار کرنا بھی صحیح لگتا ہے جیسے بغاوت کے پیچھے فارس یا روس کا کردار اور دلّی کے بادشاہ کی طرف سے فارس کے بادشاہ کو بھیجے گئے نام نہاد فرمان کو بغاوت کا سبب ماننے سے انکار کرنا۔ ان کا یہ کہنا بھی جزوی طور پر صحیح ہوسکتا ہے کہ بغاوت کسی سازش کا نتیجہ نہیں تھی اور اس میں جہاد کا نعرہ لگانے والے کئی لوگ بے روزگار اور شرابی قسم کے لوگ تھے جو صرف لوٹ مار کے لیے اُس میں شامل ہوگئے تھے۔ لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں لگتا کہ ہندوستان کے لوگوں نے برٹش

حکومت کے قیام کے خلاف کبھی کوئی بغاوت نہیں کی۔ اٹھارہویں، انیسویں صدی میں انگریزوں کے خلاف، خاص طور پر، مشرقی ہندوستان میں (جہاں انگریز سب سے پہلے آئے) ایسی ایک نہیں، کئی بغاوتیں ہوچکی تھیں۔ یہ علاقائی بغاوتیں تھیں جو مسلح تصادم کی صورت میں علاقائی سرداروں، زمینداروں یا راجاؤں کی قیادت میں ہوئی تھیں۔ ۱۸۲۰ء کی لُرکی بغاوت، ۱۸۳۲ء کی کول بغاوت، ۱۸۵۶ء کی سنتھال ہول، ۱۸۶۰ء کی سرداری لڑائی اور ۱۸۹۰ء کی برسا تحریک —— یہ سبھی بغاوتیں انگریزوں کے خلاف انیسویں صدی میں ہوئی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اسی طرح کی مسلح بغاوتوں کی سب سے بڑی اور آخری کڑی تھی۔

سیّد کا یہ کہنا بھی درست نہیں لگتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے پیچھے مسلمانوں میں طویل مدت سے سلگتا ہوا جہاد کا جذبہ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں سیّد نے مشہور زمانہ مولوی محمد اسماعیل کا ذکر کیا ہے جنھوں نے جہاد کا اعلان کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ جہاد کے لیے برٹش حکومت کی سرحدوں کے پار جانا ہوگا۔ اس اعلان کے مطابق ہی شاہ سیّد احمد بریلوی کی قیادت میں اس زمانے میں مجاہدوں کی فوج برٹش حکومت کی سرحدوں کے پار افغان قبیلوں کے علاقوں میں بھی گئی لیکن سیّد کی اس آخری دلیل سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جہاد کا خیال نہیں تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں نہ صرف فرنگیوں کے خلاف جہاد کا جذبہ موجود تھا بلکہ انھوں نے سرحد پار پہنچے ہوئے مجاہدوں کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے ایک نیٹ ورک بھی قائم کرلیا تھا۔ دراصل سیّد احمد خود ایک زمانے میں شاہ ولی اللہ اور ان کے نظریات سے متاثر وہابی تحریک میں حصہ لینے والوں (جہاد کے قائدین) سے کافی متاثر تھے۔ اسی اثر کے تحت ۱۸۵۰ء میں انھوں نے 'راہ سنت و ردِّ بدعت' کے عنوان سے کتاب لکھی تھی (حالی، ص ۵۶)۔ سیّد میں اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے کنور محمد اشرف نے لکھا ہے کہ ۱۸۴۶ء سے پہلے سیّد خود جہاد کا اعلان کرنے والے قائدین کے لیے نہایت احترام کا جذبہ رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر دلّی پر لکھی جانے والی اپنی کتاب 'آثار الصنادید' کے پہلے اڈیشن میں انھوں نے شاہ سیّد احمد بریلوی اور شاہ عبدالعزیز کو نہایت اعلا مقام پر رکھا ہے اور کمال احترام سے ان کا ذکر کیا ہے۔ مولوی محمد اسماعیل انھیں قائدین کے مددگار تھے (ربیلین ۱۸۵۷ء: مرتبہ کنور محمد اشرف، پی. سی. جوشی، ص ۸۶)۔ اشرف نے اپنے اہم ترین مضمون Muslim Revivalist and the Revolt of 1857

میں اٹھارویں صدی سے ہندوستانی مسلمانوں کے اعلا طبقے میں ظہور پذیر احیا پسند نظریے کی ترقی اور وسعت اجرا کی پُراثر تفصیل پیش کی ہے اور واضح کیا ہے کہ کیسے اسی نظریے کی تبدیلی ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہوئی تھی (اور بغاوت کے بعد بھی کئی الگ الگ واقعات میں ہوتی رہی)۔ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ واقع ہوا، اسے سمجھنے کے لیے اُس سے پیشتر رونما ہونے والے تین واقعات کافی اہم ہیں — دلّی میں شاہ ولی اللہ کے احیا پسند نظریے کی تبلیغ، کرناٹک میں ٹیپو سلطان کا تصادم اور بنگال میں شریعت اللہ کی فرائضی تحریک۔ ان تینوں بڑے واقعات میں دو اہم ترین مماثلتیں تھیں — پہلی، ان میں پوشیدہ برٹش کے لیے مخالفت کا جذبہ اور دوسرا ان سب میں موجود ایک انتہا پسند سماجی اور معاشی پروگرام۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد سیاسی اقتدار کمزور پڑ جانے سے معاشرے میں علما کا اثر بڑھا اور ان کا رول نہایت اہم ہوگیا۔ اُسی دور میں دلّی میں شاہ ولی اللہ کی شخصیت نہایت بااثر تھی جنھوں نے مسلم معاشرے کے زوال کو روکنے کے لیے اور مسلم حکومت و اقتدار کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے اسلام کی بنیادی باتوں کے احیا کی تحریک شروع کی تھی۔ انھوں نے سرمائے کے کسی ایک خاندان میں سمٹ جانے اور معاشی عدم مساوات کے پھیلنے کو معاشرتی زوال اور طوائف الملوکی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے کسانوں، تاجروں اور کاریگروں پر ٹیکس کے بھاری بوجھ کو مغل حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب بتایا۔ ان کے نظریات کا سلسلہ طویل مدت تک جاری رہا اور اس نے کئی طرح کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تحریکوں کو جنم دیا جن میں وہابی سمیت برٹش مخالف تحریکیں شامل تھیں۔

اشرف کے مطابق ۱۸۰۶ء میں ٹیپو سلطان کی قیادت میں واقع ویلور کی بغاوت دراصل ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے تلخیص شدہ اڈیشن کی مماثل تھی۔ فرانسیسی انقلاب سے متاثر ٹیپو سلطان نے فرانسیسیوں کی مدد سے جدید فوجی اصولوں کی بنیاد پر اپنی فوج کی تنظیم کی تھی اور ہندوستان میں برٹش حکومت کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنی ریاست میں شاہی نشانات کو ختم کر کے سبھی شہریوں میں برابری کو اپنا آدرش بنایا اور ریاست کے سبھی مسلمان شہریوں کو نوکری اور روزگار مہیا کرنے کی پالیسی لاگو کی۔

بنگال میں انگریزوں کی معاشی لوٹ اور زمین جائیداد سے متعلق نئے انصرام و انتظام سے پرانے مسلم زمیندار تباہ ہوگئے تھے۔ کسان اور کاریگر بھی برباد ہوگئے تھے۔ ڈھاکہ کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے اجڑ کر محض بیس ہزار رہ گئی تھی۔ اسی دوران وہاں فرید پور ضلعے کے حاجی

شریعت اللہ نے ۱۸۰۴ء میں فرائضی تحریک شروع کی جس میں زمینداروں کے استحصال کے خلاف کسانوں کو منظم کیا گیا۔ وہ برٹش حکومت کے بھی خلاف تھے۔ ان کے بعد قیادت سنبھالنے والے ان کے صاحبزادے دوُ دوُ میاں نے کھل کر برٹش کے خلاف آواز اٹھائی۔ اُس نے شاہ ولی اللہ کے افکار کے زیر اثر وہابی رہنما شاہ سید احمد بریلوی کی تحریک کی بھی مدد کی۔ فرائضی تحریک میں اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ ساری زمین خدا کی بنائی ہوئی ہے لہٰذا کسی بھی حاکم کو اس پر ٹیکس لگانے کا حق نہیں ہے۔ غریب محنت کش طبقوں سے تعلق رکھنے والے اسّی ہزار فرائضی تحریک میں حصہ لینے والے کسی بھی مذہبی تفریق کے بغیر ہندو اور مسلمان، دونوں زمینداروں کے خلاف سنگھرش کرتے رہے۔

کنور محمد اشرف کے مطابق درج بالا تینوں ہی تحریکوں (شاہ ولی اللہ، ٹیپو سلطان اور فرائضی) کے بنیاد پرست معاشی اور سماجی پروگرام اور برٹش مخالف نظریات کی روایت ہی پہلے وہابیوں میں پھر ان کے ذریعے ۱۸۵۷ء کی بغاوت تک پہنچی تھی۔ حالاں کہ وہابیوں کے بنیاد پرست سماجی معاشی پروگرام مذہبی قوانین (شریعت) کی بنیاد پر تھے اور ان کے پاس جاگیردارانہ یا نوآبادیاتی ڈھانچے کا کوئی جمہوری متبادل نہیں تھا۔ اس کے باوجود اپنی بنیاد پرست تقریروں سے انھوں نے مسلم معاشرے کے دانش وروں اور عام لوگوں، سبھی کو جگایا۔ اس سے برٹش حکومت کے خلاف سنگھرش کو تقویت ملی۔ اور مذہبی اصلاحوں کی سرگرمیوں میں پیش رفت ہوئی۔ اشرف کے مطابق وہابیوں نے ہندوستان میں بالخصوص شمالی ہندوستان میں جو وسیع نیٹ ورک قائم کیا، تنظیم بنائی، پیسوں کا انتظام کیا؛ پیسہ، ہتھیار اور خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ حفاظت بھیجنے کے لیے جس نظام کو ترقی دی ان سب کا فائدہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو ملا۔ ۱۸۵۷ء میں وہابیوں نے دلّی اور لکھنؤ کے باغیوں کے ساتھ مل کر بغاوت کو منظم کرنے، اسے پھیلانے اور آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ فوج کے اندر جو کمیٹیاں بنیں اور لال قلعے کے اندر جو فوجی تنظیم قائم ہوئی اس کے پیچھے وہابیوں کے نظریات اور تنظیم کی طاقت دکھائی دیتی ہے۔ دلّی میں باغیوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد وہابیوں کی قیادت میں ہی نمک اور شکر پر ٹیکس اور جمع خوری ختم کرنے کے قانون پاس ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے باغیوں میں جو مذہبی کٹر پن اور نئی مذہبی اور سماجی اصلاحوں کے لیے مخالفت کا جو جذبہ تھا اس کا بھی ایک اہم سبب وہابی ہی تھے۔ اشرف کی تحقیق سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہابیوں اور مجاہدوں کا کردار صاف جھلکتا ہے اور سیّد احمد کا اس سے انکار

کرنا مسلمانوں کو معصوم یا بے گناہ ثابت کرنے کے ان کے سیاسی اعتبار کی وجہ سے ہے۔ بغاوت سے متعلق اپنی تحقیق میں سیّد نے انگریزوں کی نظر میں مسلمانوں کو پاک صاف دکھانے، انھیں بے گناہ یا کم قصوروار ٹھہرانے کی کوشش کی ہے۔ اس نظریے سے انھوں نے انگریزی حکومت کی اچھائیوں اور نیک ارادوں سے مسلمانوں کے انجان رہ جانے پر زور دیا ہے تاکہ مسلمانوں کے لیے انگریزوں کا غصہ اور نفرت کچھ کم ہو سکے۔

بغاوت کے اسباب کی تحقیق میں سیّد کا اشرافیہ نظریہ بھی صاف دکھائی دیتا ہے جب وہ سابق حکام کی روایت کے برخلاف کمپنی سرکار کے دربار نہ لگانے اور منتخب شخصیات کو تمغے، خطابات، جاگیریں اور دیگر عطیات نہ دینے کی شکایت کرتے ہیں تو وہ طرزِ حکومت کے بارے میں اپنے اشرافیہ نظریے کو ہی ظاہر کرتے ہیں (ص ۴۶)۔ سامراج کے حق میں لوگوں کو وفادار بنانے کے مقصد سے وہ ان پرانی جاگیردارانہ اقدار کو جاری رکھنے کی وکالت کرتے ہیں جو انگریز بنیوں کو پہلی نظر میں فضول خرچی لگتی تھی۔ یہ سیّد کا اشرافیہ نظریہ ہی تھا کہ وہ اسکولوں، کالجوں میں لیاقت اور اہلیت کی سند دیتے وقت امیدواروں کے خاندان اور ان کے خاندانی رتبے کے خیال پر زور دیتے ہیں اسی طبقاتی نظریے کی وجہ سے وہ انگریزوں کی فوج میں اعلا طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو اعلا عہدے دینے کے بجائے انھیں معمولی گھروں کے سپاہیوں کے ساتھ رکھنے کی پالیسی کو بھی واجب نہیں سمجھتے (ص ۳۵)۔

اس تحقیق میں سیّد کی جو بات ہمیں چونکاتی ہے وہ فوج میں ہندو مسلم سپاہیوں کو الگ الگ رکھنے کا ان کا مشورہ ہے۔ ایک طرح سے تو ان کی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک ہی رجمنٹ میں ایک ساتھ رہنے والے ہندو مسلمان سپاہیوں میں اتحاد کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا جو بغاوت میں سودمند ثابت ہوا لیکن اس سے آگے بڑھ کر انگریزوں کو یہ صلاح دینا کہ ان دونوں کو الگ الگ رکھا جائے اور ضرورت پڑنے پر انھیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے — یہ بالکل چانکیہ یا میکیاولی جیسا پیش کردہ ایک مشورہ ہے۔ یہاں سیّد بالکل پروفیشنل وفادار نظر آتے ہیں جن کا قوم یا ملک کے جذبے سے کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔ یہ بات کچھ عجیب اور متضاد اس لیے لگتی ہے کیوں کہ اپنی پوری تحقیق میں سیّد نے بغاوت رونما ہونے کے بارے میں جو طرح طرح کی صفائیاں دے رکھی ہیں، ان سب کے پیچھے ایک بڑا سبب انگریزوں کے غصے سے اپنے زیادہ سے زیادہ ہم وطنوں کی جان بچانے کا جذبہ رہا

ہے۔ان کے اس جذبے میں فوج کے لیے مندرجہ بالا مشوروں میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔

مجموعی طور پر سیّد کی تحقیق سے جو بات ابھر کر آتی ہے جسے انھوں نے خود اپنے الفاظ میں نہیں لکھا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک بالکل پرائے اور اجنبی سماجی، معاشی اور سیاسی نظام رکھنے والے انگریزوں نے ہندوستان کے مروّجہ انصرام و انتظام اور سماجی طبقوں کو نہایت غور و فکر کے بغیر جس تیزی کے ساتھ اور جس بے رحمی سے تہس نہس کیا، ۱۸۵۷ء کی بغاوت اُسی کا نتیجہ ہے۔ اس تحقیق میں سیّد کا یہ مشورہ پوشیدہ ہے کہ انگریزوں کو چاہیے کہ وہ ہندوستان کے مروّجہ آئین کو یکبارگی پوری طرح سے نہ توڑیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ یہاں کے آئین سے تال میل رکھتے ہوئے اور پرانے پُر اثر سماجی اعلا طبقے کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے چلیں تبھی وہ بھی مغلوں کی طرح یہاں اپنی ایک مستقل حکومت قائم کر سکیں گے۔ اپنے اسی نظریے سے سیّد نے بغاوت کا سب سے بڑا سبب لیجسلیٹو کاؤنسل میں کسی ہندوستانی کی عدم موجودگی بتایا تھا۔

اس بغاوت کا اہم ترین سبب بتا کر سیّد نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی نہایت محدود اور تنگ غیر ملکی بنیاد کی طرف توجہ دلائی تھی۔ لیجسلیٹو کاؤنسل میں ہندوستانی نمائندے کی موجودگی پر زور دے کر دراصل سیّد یہ سیاسی مشورہ دیتے رہے تھے کہ اس حکومت کے استقلال کے لیے اس میں ہندوستانیوں کی ساجھے داری ضروری ہے۔ حفیظ ملک نے اِسے سیّد کی Theory of Participatory Role کہتے ہوئے اس کی تشریح کی ہے کہ سیّد چاہتے تھے کہ انگریز اپنی طرزِ حکومت میں سیاسی سدھار لائیں اور اپنی رعایا کے اعلا طبقے (اشرافیہ) کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت کی طبقاتی بنیاد کی توسیع کریں جیسا کہ مغلوں نے اپنی کامیاب حکومت میں کیا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیّد کسی بھی صورت میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے حامی نہیں تھے۔ بغاوت کی تحقیق میں انھوں نے انگریزی حکومت کی جو نکتہ چینی کی ہے اُس کا مقصد اپنی اصل غلطیوں سے سبق لے کر، اپنی حکومت میں سدھار لانے کے لیے انگریزوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا تاکہ ہندوستان میں ان کی حکومت مستقبل میں اطمینان سے، بغیر کسی خطرے کے چل سکے۔

حقیقت میں مستقبل میں انگریزوں نے آہستہ آہستہ ایسا ہی کرنے کی کوشش بھی کی۔ سیّد کی

بغاوت سے متعلق تحقیق اور اس میں پوشیدہ مشوروں کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے انگریزوں نے اپنی حکومت کی کچھ پرانی پالیسیوں کو بدلنا شروع کر دیا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کے مذہبی اور سماجی معاملات میں دخل نہ دینے کی پالیسی اپنائی۔ تعلقہ داروں اور زمینداروں کے مروّجہ حقوق کو نہ صرف بحال کیا بلکہ انھیں کچھ نئے حقوق بھی دے ڈالے جو پہلے نہیں تھے۔ اس کے ساتھ ہی لیجسلیٹو کاؤنسل میں ہندوستانی نمائندوں کو مقرر کرنے کا انتظام شروع کیا۔ پی. سی. جوشی نے اس آخری قدم کو نوآبادیاتی ہندوستان میں سیاسی اور حکومت کے آئینی (دستور ساز) اصلاحات کا آغاز کرنے والا ایک اہم قدم تسلیم کیا ہے۔ لیکن ہندوستان میں نوآبادیاتی حکومت کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ بالکل واضح ہے کہ انگریزوں نے سیاسی اصلاح کے لیے جو بھی قدم اٹھائے وہ بادلِ نخواستہ، نہایت مجبور ہو کر اٹھائے اور ضروریات کے لحاظ سے وہ اقدام بالکل ناکافی تھے۔ نوآبادیاتی مقاصد اور نوآبادیاتی ذہنیت ان کی سب سے بڑی حد تھی اور اس لیے وہ اور کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ آخرکار انھیں ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔ خود سید احمد، جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی تحقیق کرتے ہوئے پہلی بار سیاسی اصلاحات کی ترغیب دی، اگلے اٹھائیس تیس برسوں کے بعد بدل جاتے ہیں۔ ۱۸۸۵ء کے بعد جب نیشنل کانگریس سیاسی اصلاحات کی مانگ کرنے والی سب سے بڑی تنظیم کی صورت میں ابھر کر آئی ہے، تب سید خود اُن اصلاحات کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انگریزی حکومت سے شکایتیں کرنے اور اس کی تھوڑی بہت نکتہ چینی کرنے والی کانگریس کو وہ باغی تنظیم مان لیتے ہیں اور انگریزی حکومت کی حمایت میں کانگریس کے خلاف اپنی لوکل پیٹریاٹک انڈین ایسوسی ایشن قائم کرتے ہیں۔ کانگریس کی تنقید سے انگریزی حکومت کو بچانے کے لیے وہ اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمان دونوں میں یکساں طور پر ہردلعزیز سید احمد، کانگریس کو ہندو تنظیم بتاتے ہوئے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ راہ پر چلنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ حقیقت میں سید احمد حاکم طبقے کی خدمت کرنے والے جس روایتی طبقے سے آئے تھے اور انھوں نے اپنے زمانے اور حلقے سے حاکم کی ایمانداری سے خدمت انجام دینے کی جن روایتی اقدار کو گلے لگایا تھا، وہ بدلتے ہوئے زمانے میں پرانی اور باسی ہو گئی تھیں لیکن سید اپنی پرانی حدود کو توڑ کر آگے نہیں نکل سکے اور اسی لیے نوآبادیت کے خلاف نئے خیالات اور تحریکوں کے ابھرنے کے ساتھ ہی سید زمانے اور سماج کے لیے آؤٹ ڈیٹ ہوتے چلے گئے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب سے متعلق سیّد احمد کی تحقیق پر غور کرتے ہوئے یہ دھیان میں رکھنا چاہیے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ ایک سمندر کی طرح وسیع اور اتھاہ تھی۔ اس کے پیچھے ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں طرح کے اسباب تھے جن میں سے کچھ نہایت پیچیدہ بھی تھے۔ کچھ جگہوں پر بالکل علاقائی اسباب تھے تو کچھ جگہوں پر معمولی اور وسیع۔ وہ جنگ کسی ایک سطح پر نہیں بلکہ کئی سطحوں پر اور کئی شکلوں میں لڑی جارہی تھی جس میں سماج کے مختلف طبقوں کے بے شمار لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ اُس جنگ میں حصہ لینے والوں کی ذاتی، مجموعی یا طبقاتی اغراض، سب ایک ساتھ کام کررہی تھیں۔ پچھلے ڈیڑھ سو برسوں سے سینکڑوں ماہرین اور محققین اُس جنگِ عظیم کو مختلف نظریوں سے جانچنے، پرکھنے اور اس کے نامعلوم پہلوؤں کو کھوج نکالنے کا کام کرتے آرہے ہیں۔ آج بھی اُس جنگ عظیم کے اسباب، سنگھرش کی سبھی سطحوں اور اُس میں حصہ لینے والے سبھی لوگوں کے بارے میں پوری واقفیت حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ ان سب پہلوؤں پر آج بھی تحقیق جاری ہے جس سے ۱۸۵۷ء کے باغیوں کے ذہن کی مختلف سطحوں اور مآخذ کے بارے میں نئی نئی معلومات سامنے آرہی ہیں اور مستقبل میں بھی اس طرح کی تحقیق کے امکانات ہیں۔ ۱۸۵۷ء پر تحقیق کی اتنی پرانی روایت کو دیکھتے ہوئے، اس کے مقابلے میں بغاوت رونما ہونے کے محض ایک برس کے اندر کی گئی سیّد کی تحقیق کی حدود اور کوتاہیوں کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بارے میں آج ہمارے پاس جو وسیع معلومات ہیں اُس کے مقابلے میں سیّد اُس کے بہت سے سرچشموں اور اسباب کو اگر واضح نہیں کرپائے تو اس میں کوئی تعجب بھی نہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اپنی ان مشکلات کے باوجود انھوں نے جو تحقیق کی وہ آج بھی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو جاننے سمجھنے کا ایک بنیادی حوالہ ہے۔ اُس کی کئی خصوصیات آج بھی قابلِ غور ہیں۔ سیّد احمد پہلے شخص تھے جنھوں نے اُس بغاوت کو انگریزوں کے زاویۂ نظر سے علاحدہ ہوکر اس کو وسیع تناظر میں دیکھا اور اس بغاوت کے لیے ہندوستانیوں کو قصوروار ٹھہرانے کے بجائے انگریزی حکومت کی پالیسیوں کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ بغاوت کے پیچھے مذہب کے سوال کو ایک بڑا سوال مانتے ہوئے بھی انھوں نے بغاوت کو صرف مذہبی اسباب تک محدود نہیں مانا بلکہ بغاوت کے معاشی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی پہلوؤں پر بھی اُتنا ہی زور دیا۔ بغاوت کے پیچھے انھوں نے انگریزوں کی طرف سے اگو کیا گیا نیا معاشی نظام، مالگزاری کے نئے بندوبست اور عدالتی انتظام میں درآئے اجنبی عناصر پر بھی توجہ دی۔ انگریزی

حکومت کا ہندوستانی معاشرے کے روایتی ڈھانچے میں توڑ پھوڑ کرنے اور کئی روایتی سماجی اداروں کو تہس نہس کرنے کے تکلیف دہ پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ انھوں نے انگریزوں کی نوآبادیاتی تہذیب کے سیاہ پہلوؤں کو، ہندوستانیوں کے ساتھ ذلت آمیز، جارحانہ رویے اور نوکریوں میں نسلی تفریق کے بارے میں کھل کر لکھا۔ بغاوت واقع ہونے کے فوراً بعد اُس کے اِتنے سارے پہلوؤں کو دیکھ پانا اور اس کی بدصورت سچائی کو بلاخوف وخطر سامنے لانا ان کی گہری اور بیدار نگاہ کا مظہر تھا اور ان کی جرأت مندی کا بھی۔ شاید سیّد احمد پہلے ہندوستانی تھے جن میں ہمیں ایسا شعور نظر آتا ہے۔

سیّد کی تحقیق کی ایک بڑی خصوصیت ان کی یہی جرأت مندی اور صاف گوئی ہے۔ وہ برٹش راج کے وفادار تھے، اُسے دیکھتے ہوئے ان کی یہ خصوصیت اور بھی اہم ہوجاتی ہے۔ بغاوت کے جو بھی اسباب انھوں نے بتلائے، بالکل صاف لفظوں میں بتلائے۔ ان پر کسی طرح کی لیپا پوتی نہیں کی۔ نہ انھیں واضح انداز میں پیش کرنے میں کسی طرح کی جھجک محسوس کی۔ اُن اسباب کو انھوں نے کسی جھوٹی تعریف کی آڑ میں یا کسی شاعرانہ اسلوب کے پردے میں بھی پیش نہیں کیا۔ جو کچھ دکھایا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دکھایا۔ جو کچھ کہا، دوٹوک کہا۔ چاہے انگریزی حکومت میں عیسائی مشنریوں کا ہتک آمیز طریقوں سے عیسائی مذہب کی تبلیغ اور اُسے انگریز حاکموں کی سرپرستی یا تحفظ دینے کا معاملہ ہو یا ہندوستانیوں کے ساتھ ان کے غرور اور متکبرانہ برتاؤ کا سوال ہو اور چاہے نئی معاشی پالیسیوں سے سماجی طبقوں میں زبردست الٹ پھیر کا معاملہ — ہر جگہ سیّد نے صاف لفظوں میں انگریزی حکومت کی پالیسیوں کو قصوروار ٹھہرایا اور انھیں بغاوت کا سبب بتلایا۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے لیے سیّد نے انگریزی حکومت کو کھل کر ذمے دار ٹھہرایا۔ نہایت تلخ حقائق کو بھی انھوں نے کھل کر بیان کیا۔ مثال کے طور پر انھوں نے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کیا کہ باغی اپنی بغاوت کے ذریعے اس سرکار کو بدلنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس سچائی پر کوئی لیپا پوتی نہیں کی کہ جن معزز اور بااقتدار خاندانوں اور طبقوں کو انگریزوں نے تباہ و برباد کیا اور غربت کی حالت میں پہنچا دیا تھا، انھوں نے ہی بغاوت کے ذریعے ہندوستان کی حکومت کو بدلنے کی کوشش کی۔ (They were inclined for a change of rules. p.37)

انگریزی حکومت کے مداح ہونے کے باوجود سیّد نے اپنے زاویۂ نظر سے بالکل مختلف اس سچائی کو بھی واضح الفاظ میں پیش کیا کہ انگریزی حکومت کے تحت ہندوستان کے لوگ

روز بروز اور غریب ہوتے گئے ہیں (ص ۳۱)۔ سیّد نے انگریزی حکومت کی غلطیوں کی ذمہ داری چھوٹے موٹے حاکموں پر ڈال کر بڑے حاکموں کو بچانے کی کوشش نہیں کی جیسا کہ انگریزوں کے بہت سے وفادار کیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس مذہبی کٹر پسندی کے معاملے میں انھوں نے براہِ راست وائسرائے کے تحت کام کرنے والی اعلا جماعت لیجسلیٹو کاؤنسل تک کو واضح انداز میں قصوروار ٹھہرایا:

> The Legislative Council is not free from the charge of having meddled with religious matters. (p.24)

ہندوستانیوں کے ساتھ انگریز حاکموں کے فرق و امتیاز کے جذبے اور بدسلوکی کے سیاق میں سیّد کی صاف گوئی کافی تیکھی اور جذباتی ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ مسئلہ انھیں اتنا بے چین کرتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اس سچائی کو سامنے لانا چاہتے تھے:

> I feel it most necessary to say that which is in my heart and which I believe to be true even at the risk of its being distasteful to many of the ruling race. (p.38)

اس باب میں سیّد کھل کر کہتے ہیں کہ انگریزی سرکار نے اپنے فرائض کو پورا نہیں کیا جنھیں اسے پورا کرنا چاہیے تھا۔ اپنی بدسلوکی سے اس نے ایسے لوگوں کو بھی اپنا دشمن بنالیا جو اس کا ساتھ دے سکتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب کے بارے میں سیّد کی تحقیق مجموعی طور پر انگریزی حکومت کے بارے میں سیّد کی تنقید میں بدل جاتی ہے۔ اسے انگریزی حکومت کے لیے ان کی condemnation تک کہا جا سکتا ہے۔ ان کا ایک جملہ قابلِ غور ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

> The English Government, had, however, many good points. I do not condemn it entirely.

اس کے بعد انھوں نے انگریزی حکومت کے اُن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جنھیں وہ اچھا سمجھتے ہیں جیسے عوام کا تحفظ اور آزادی، اچھی سڑکیں، لمبے راستوں پر ڈاکوؤں، ٹھگوں، چوروں کی گرفتاری، مسافروں اور امیر غریب سب کو ایک جیسا قانونی تحفظ وغیرہ۔ سوامی دیانند سرسوتی نے 'ستیارتھ پرکاش' کے پہلے اڈیشن میں بھی انگریزی حکومت کے ایسے ہی پہلوؤں کی تعریف کی ہے۔ لیکن درج بالا جملے کا یہ حصہ کہ: " I do not condemn it

"entirely انجانے میں ہی یہ ظاہر کردیتا ہے کہ بغاوت کے اسباب کی تحقیق کرتے ہوئے سیّد دراصل انگریزی حکومت کی پہلے تنقید، پھر مذمت کی حد تک چلے گئے تھے۔ I do not condemn it entirely میں یہ پوشیدہ ہے بھلے ہی پوری طرح نہیں، وہ اس کی مذمت بھی ضرور کررہے تھے۔

یہ سچ ہے کہ سیّد کی تحقیق سے ۱۸۵۷ء کی جنگ عظیم کی وہ تصویر سامنے نہیں آتی جو بعد میں قومی تحریک کے دوران سامنے آئی اور جس کو آج اس کی اصل شکل مان لیا گیا ہے (حالاں کہ اب اُسے بھی کئی نظریوں سے چنوتیاں ملنے لگی ہیں)۔ سیّد کے بتائے گئے اسباب میں جو کوتاہیاں اور کمزوریاں ہیں، ان پر ہم پہلے ہی غور کرچکے ہیں، ان سب کے بعد بھی سیّد کی تحقیق میں جو کچھ باقی رہتا ہے وہ آج بھی اتنا ہی مستند ہے جتنا وہ اپنے زمانے میں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے مطالعے کی ڈیڑھ سو سالہ پرانی روایت میں بعد کے معروف علماء، محققین اور ماہرین نے چاہے وہ دائیں بازو کے حامی ہوں یا بائیں بازو کے، قوم پرست ہوں یا مارکسی — بغاوت کی تحقیق کرتے ہوئے سیّد کے بتائے ہوئے اسباب کی مجموعی طور سے تائید کی ہے۔ مثال کے طور پر آر. سی. مجمدار ہندوستانی تاریخ نگاری میں دائیں بازو کے حامی اور ایک حد تک مسلم مخالف مورخ مانے جاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو وہ کئی اسباب سے ہندوستان کی جنگ آزادی نہیں مانتے۔ لیکن اس بغاوت کے اسباب کی تحقیق کرتے ہوئے اپنی کتاب (Sepoy Mutiny) میں انھوں نے بھی سیّد احمد کے ہی بتائے ہوئے اسباب کی تائید کی ہے۔ بغاوت کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے سیّد احمد کو مستند تسلیم کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ ۱۷۸۰ء میں سیّد غلام حسین کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے انگریزوں کی طرزِ حکومت کو بغاوت کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا اور لکھا کہ اس نئی طرزِ حکومت کی خامیوں کو ۱۸۶۰ء میں سیّد احمد نے اور بھی پُراثر انداز میں اجاگر کیا ہے۔ اس نظام میں اعلا عہدوں پر ہندوستانیوں کا تقرر نہ کرنا، ہندوستانیوں کے لیے انگریزوں کا ذلت آمیز رویہ، عدالتی طریقہ، ٹیکس، اسٹیمپ پیپر وغیرہ کی نکتہ چینی شامل ہے (ص ۲۹)۔ مجمدار نے تبدیلیِ مذہب کے خوف کو بغاوت کا ایک اہم سبب تسلیم کرتے وقت بھی سیّد احمد کو نقل کیا ہے۔ اس سیاق میں انھوں نے تفصیل سے سیّد کی تحقیق سے کئی حوالوں کو سامنے رکھ کر جیسے مندروں اور مسجدوں کے پاس عیسائی مشنریوں کی مذہبی تبلیغ کرنے، انھیں پولیس کی مدد ملنے اور کمپنی حکومت کا تبدیلیِ

مذہب کو بڑھاوا دینے والے قانون بنانے وغیرہ کو دُہرایا ہے۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کی تحقیق کرنے والے قوم پرست اور بائیں بازو کے مصنفین نے بھی سیّد کے بتائے ہوئے اسباب کی تائید کی ہے جیسے صحافی ستیندر سنگھ اور پی. سی. جوشی نے ۱۸۵۷ء پر تفصیل سے انگریزوں کی لاگو کی گئی نئی ریونیو پالیسی اور اس کی برائیاں جیسے بقایا مالگزاری اور قرض کی وصولی کے لیے علاقے اور زمین کی بکری، فصل کے حصے کی جگہ زمین کی بنیاد پر متعین لگان کا فیصلہ اور لگان کا بہت زیادہ ہونا اور پرانے زمیندار طبقے کو تباہ و برباد کرنا وغیرہ کی تائید کی ہے۔ ان کی تائید مجمدار نے بھی کی ہے۔ رجنی پام دت نے بھی اپنی کتاب 'آج کا بھارت' مترجم: آنند سروپ ورما، میک ملن، ۱۹۷۷ء) میں مندرجہ بالا اسباب کو انیسویں صدی میں ہونے والی عوام کی بے اطمینانی کا سبب بتایا ہے (ص ۴۷-۲۴۴)۔ پی. سی. جوشی ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر تھے تو رجنی پام دت برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر۔ یہ بات واقعی بہت دل چسپ اور اہم ہے کہ برطانوی حکومت کے ایک وفادار کی تحقیق کو اس کے ستر اسّی سال بعد آنے والے کمیونسٹ بھی مستند مانتے ہیں۔ ان بائیں بازو کے حامیوں نے سیّد احمد کی صرف تائید ہی نہیں کی بلکہ انھیں اپنی تحقیق کا اہم مآخذ بناتے ہوئے نقل بھی کیا ہے۔ ستیندر سنگھ نے سیّد کا حوالہ دیا کہ برٹش حکومت کے شروع کے دنوں میں کئی زمینیں بک گئیں جس سے ہندوستانی سماج میں ہلچل مچ گئی (ص ۱۹)۔ جوشی نے بغاوت کے اسباب کی تحقیق کرتے ہوئے اعلا عہدوں سے ہندوستانیوں کو دور رکھنے، ان کے مذہبی معاملوں میں دخل اندازی کرنے، مذہبی نقطۂ نظر سے تفریق آمیز قوانین لاگو کرنے، مشنریوں کی مذہبی تبلیغ کو سرکاری سرپرستی دینے اور کبھی ہندوستانیوں پر عیسائی مذہب تھوپنے سے متعلق ایڈمنڈ کا خط، ان کبھی موضوعات پر سند کے طور پر سیّد احمد کو ہی نقل کیا ہے۔ قوم پرستوں اور مارکس وادیوں کے درمیان سیّد احمد کی تحقیق کا استناد و اعتبار اور قبولیت گواہی دیتی ہے کہ ایک مورخ کے طور پر سیّد کافی معتبر تھے اور برٹش حکومت کے لیے ان کی وفاداری نے ان کی تاریخ نگاری کو مسخ نہیں کیا۔ اس کے برعکس اپنی وفاداری اور کمال ایمانداری کی وجہ سے ہی وہ انگریزوں کو ان کے خلاف بغاوت کے سچے اسباب سے متعارف کرا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران انگریزوں کے ساتھ ہونے کے باوجود سیّد کو کوئی غدار نہیں کہتا۔ ان کی وفاداری کے باوجود ۱۸۵۷ء کے سیاق میں ان کی بے خوفی اور صاف گوئی کو احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اور ان کی تحقیق کو تاریخ

نگاری کا ایک مستند اور معتبر مآخذ سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے سیاق میں یہ سیّد کا ایک پہلو ہے۔ اس باب میں ان کا ایک پہلو اور بھی تھا جو اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی اہم ضرور ہے۔ عام طور پر لوگ اس کا ذکر ۱۸۵۷ء کے سیاق میں نہیں کرتے لیکن اس کی جڑیں وہیں پر ہیں۔ یہ پہلو ہے ہندوستانیوں کے لیے ان کی وفاداری کا، بالخصوص مسلم قوم کے حق میں۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کوئی عام بغاوت نہیں تھی۔ برٹش سامراج کی تاریخ میں یہ ایسی غیر معمولی بغاوت تھی جس کا تلخ ذائقہ انگریز آج تک نہیں بھولے ہیں۔ کالے بھورے لوگوں پر ظلم و تشدد کرنے، ان کے بیوی بچوں کو مارنے کا تجربہ، انگریزوں کے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن کالے لوگوں کے ہاتھوں اپنے بیوی بچوں کا مارا جانا ان کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ ہندوستان میں ان کی حکومت کے سو برسوں میں پہلی بار ہوا۔ انگریز غصے سے پاگل ہو اٹھے۔ بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے انھوں نے ہندوستانیوں پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے اور قتلِ عام کیا، خاص طور پر لکھنؤ اور دلّی میں، جو برٹش ہندوستان کی تاریخ کا سب سے سیاہ باب ہے۔ تشدد اور ظلم کے یہ واقعات سیّد کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سیّد کے لیے صرف ایک عوامی واقعہ نہیں تھی۔ اس سے اُن کا تعلق بہت انفرادی سطح پر بھی تھا۔ وہ بغاوت کے صرف چشم دید گواہ ہی نہیں تھے بلکہ دو متضاد رول میں اس سے گہرائی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ہندوستانیوں کا، خاص طور پر مسلمانوں کا انگریزوں کے خلاف وحشیانہ تشدد تھا اور بے رحمی تھی جس کا خوب پرچار کیا گیا اور انگلینڈ میں بیٹھے مارکس تک نے انتہائی غم و غصہ کے ساتھ اس کی مذمت کی۔ غم و غصہ اس لیے کہ اس میں نہ صرف انگریز فوجیوں اور حاکموں کو مارا گیا تھا بلکہ ان کے گھروں کی بے قصور عورتوں اور معصوم بچوں تک کو بے رحمی سے قتل کیا گیا تھا۔ (بغاوت کے اس پہلو پر ۱۸۵۷ء کے ایک اہم محقق رُدرانشو مکرجی نے ۱۱ر نومبر ۲۰۰۶ء کے دَیلی ٹیلی گراف، کلکتہ میں شائع شدہ اپنے مضمون میں کافی اطلاعات دی ہیں)۔ باغیوں کا انگریز عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کی خبریں بھی پھیلی تھیں، حالاں کہ ان کا استناد متنازعہ فیہ ہے۔ سیّد نے بھی ان خبروں کو سچ نہیں مانا۔ دوسری طرف باغیوں کے اس تشدد سے بھی کئی گنا زیادہ ظلم و تشدد انگریزوں نے بغاوت کو کچلنے میں کیا۔ انھوں نے ہندوستانیوں پر ناقابلِ تصور ظلم ڈھائے، بالخصوص مسلمانوں پر۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں دونوں فریقین کی طرف سے ہوئے اس

تشدد اور تباہی نے سیّد کو پس و پیش میں ڈال دیا۔ ایک طرف انگریز تھے، دوسری طرف ان کی اپنی قوم۔ وہ کس کے خلاف ہوں، کس کا ساتھ دیں؟ وہ انگریزوں کے ماتحت تھے۔ وفاداری ان کے خون میں تھی۔ بغاوت کے دوران اُس وفاداری کی پرکھ ہو چکی تھی۔ اس میں وہ کھرے اترے تھے لیکن اپنی قوم کے حق میں ان کی وفاداری؟ اُن کا فرض؟

انگریزوں نے لکھنؤ میں بھی ظلم و تشدد کم نہیں کیا تھا۔ اپنی تہذیب، شان و شوکت اور خوب صورت عمارتوں کے لیے لکھنؤ مشہور تھا اور ہندوستان کا بغداد کہلاتا تھا۔ یہ شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا شہر تھا جس کی آبادی اس وقت چار لاکھ تھی۔ بغاوت کو کچلنے اور پھر انتقام لینے کے لیے انگریزوں نے اِسے اتنی بری طرح اجاڑا کہ اس کی آبادی، بغاوت کو کچلنے کے پندرہ سال بعد بھی دو لاکھ اسّی ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکی (فرانسس روبنسن، ص ۱۹۴)۔ لیکن دلّی میں انگریزوں نے لکھنؤ کے مقابلے میں زیادہ تباہی مچائی۔ لکھنؤ کے مقابلے میں دلّی اس زمانے میں ایک چھوٹا شہر تھا، حالاں کہ علمی و ادبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے اہم ترین تھا۔ سیّد کا تعلق اسی دلّی سے تھا۔ یہاں انھوں نے بچپن گزارا تھا، ان کے لڑکپن کی کھٹّی میٹھی یادیں بسی ہوئی تھیں۔ یہاں کی محفلوں اور رنگینیوں میں انھوں نے اپنی جوانی کے شوق پورے کیے تھے اور یہیں ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی۔ یہاں ان کا گھر تھا، ماں، چچا اور رشتہ دار رہتے تھے، ان کے سبھی نوجوان دوست رہتے تھے۔ یہی دلّی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے انتقام اور وحشی پن کا خاص نشانہ بنی۔ اس انتقام کی ہلکی سی جھلک اپنے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھے گئے غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم سماج اور سیاست کے اہم محقق فرانسس روبنسن نے اپنے ایک مضمون The Muslims of India and the Shock of the Mutiny میں مختصراً اس انتقام اور تباہی کی حیرت انگیز مستند اور مصدقہ تفصیل پیش کی ہے۔ روبنسن لکھتے ہیں کہ دلّی شہر میں انگریزوں نے بغیر کسی تفریق کے تقریباً تیس ہزار لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ انھوں نے مغل بادشاہ کو گرفتار کر لیا اور ان کے دو بڑے بیٹوں کو قتل کر دیا۔ بادشاہ کے باقی بیٹے اور ان کے خاندان جان بچانے کی خاطر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور زندگی بھر در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ شہر میں جو لوگ زندہ بچ گئے، انھیں شہر سے باہر نکال دیا گیا اور مشکل سے ایک ہزار لوگوں کو چھوڑ کر تقریباً پورا شہر خالی کرا لیا گیا۔ سات آٹھ مہینے بعد جون ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کو شہر کے اندر واپس آنے دیا گیا لیکن مسلمانوں کو اس سے کافی عرصہ گزر جانے کے بعد جولائی ۱۸۵۹ء تک واپس

آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ۱۸۵۷ء میں دلّی اِس طرح اجڑی کہ اگلے چالیس برسوں تک (۱۹۰۰ء تک) بھی اس کی آبادی ۱۸۵۷ء کی حد تک نہیں پہنچ سکی۔ جو لوگ شہر سے باہر نکال دیے گئے تھے ان کی زمین جائیداد انگریزوں نے اپنے مخبروں اور ایجنٹوں کو نیلام کردی۔ شہر پر اپنا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے خالی کرائے گئے شہر میں اتنی توڑ پھوڑ کی گئی کہ اس کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دلّی کے لیے انگریزوں کا انتقام کا جذبہ اتنا خوفناک تھا کہ ایک وقت میں انھوں نے پورے شہر کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کردینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مگر آپس میں اختلافِ رائے کی وجہ سے، پھر دوسرے طریقوں سے اس کو برباد کیا۔ شہر کے سب سے بڑے اور مقدس مقام جامع مسجد کو اگلے پانچ برسوں تک کے لیے سکھ سپاہیوں کی بیٹھک بنادیا گیا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی مسجد فتح پوری کو ایک ہندو کے ہاتھوں بیچ دیا گیا یعنی وہ مسجد نہیں، کباڑی کی دکان ہے۔ اگلے بیس برسوں تک مسجد اُسی کے قبضے میں رہی۔ شہر کی سب سے خوب صورت عمارت زینت المساجد بسکٹ اور پاؤروٹی بنانے کے کارخانے میں بدل دی گئی اور اگلے پچاس سال تک وہاں یہ کارخانہ ہی چلتا رہا۔ لال قلعے کے اندر جو الگ الگ شاہی عمارات بنی ہوئی تھیں ان سب کو ڈھادیا گیا۔ دربارِ عام کو فوجی اسپتال میں اور دربارِ خاص کو فوجیوں کی بیرک میں بدل دیا گیا۔ باہر قلعے سے لے کر جامع مسجد تک جو محلّہ آباد تھا اُس میں دلّی کے اعلا طبقے کے معزز ترین اور مشہور خاندان آباد تھے۔ انھیں سزا دینے کے لیے اُس پورے محلے کو نیست و نابود کرکے ہموار میدان بنادیا گیا۔ وہاں آج تک یہی میدان ہے، پرانے محلے کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اُسی محلے سے ملحق خاص بازار اور اردو بازار جیسے پُررونق بازاروں کا نشان بھی ہمیشہ کے لیے مٹا دیا گیا۔ غالب نے لکھا ہے کہ وہاں کے باشندے جب شہر میں لوٹ کر آئے تو ان جگہوں کو پہچان نہیں سکے جہاں کبھی ان کے مکان اور دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ جو مسلمان خود کو بے قصور ثابت نہیں کرپائے ان کی زمین جائیداد ضبط کرلی گئی اور وہ ہندو مہاجنوں کے قبضے میں چلی گئی۔ اب دلّی مغلوں کی دلّی نہیں رہی، ہندوؤں کی دلّی میں تبدیل ہوگئی۔ شہر کی پوری آبادی کے لیے شناختی کارڈ (جسے ٹکٹ کہا جاتا تھا) رکھنا ضرور کردیا گیا۔ شناختی کارڈ کے بغیر کوئی بھی نہ شہر سے باہر جاسکتا تھا، نہ اندر آسکتا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت قائم ہوئی اور لوگوں کو عام معافی دے دی گئی تب جاکر شہر سے مفرور مسلمانوں کو واپس آنے دیا گیا۔ جب وہ واپس آئے تو وہ دلّی کہیں نہیں تھی جسے وہ

چھوڑ کر گئے تھے۔ دلّی کی تاریخ لکھتے ہوئے سیّد احمد نے جن تاریخی مقامات اور عمارتوں کا ذکر کیا تھا، ان میں سے بہت سی عمارتوں کا کہیں کوئی پتا نہیں ہے۔ ان بڑی لائبریریوں کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں جن میں عربی، فارسی کی اہم اور نادر کتابیں تھیں۔ ان علما و فضلا کا بھی کہیں پتا نہیں تھا جن کے نام سے دلّی جانی جاتی تھی۔ وہ سبھی یا تو دلّی سے نکال دیے گئے یا مار ڈالے گئے۔ سیّد احمد کے خاص دوست مولوی ذکاء اللہ جب کوچہ چیلان گئے جہاں سب سے زیادہ علما و فضلا رہتے تھے تو یہ دیکھ کر کانپ اٹھے کہ وہاں ان میں سے اب کوئی نہیں بچا ہے۔ صرف ایک محلے (کوچہ چیلان) میں انگریزوں نے چودہ سو لوگوں کو قتل کر ڈالا تھا (فرانسس روبنسن، ص ۹۳-۱۹۲)۔ غالب نے اپنے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو ۵/دسمبر ۱۸۵۷ء کو خط میں لکھا: ''واللہ! ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔'' مرزا غالب بچ گئے کیوں کہ ان کے مکان مالک مہاراجہ پٹیالہ کے خاص حکیم تھے۔ مہاراجہ کی فوج انگریزوں کے ساتھ مل کر بغاوت کو کچل رہی تھی۔ حکیم صاحب نے حفاظت کے لیے مہاراجہ سے کہہ کر اپنے اور کرائے داروں کے مکانوں پر سپاہیوں کا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ غالب نے لکھا: ''چناں چہ بعدِ فتح راجا کے سپاہی آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے جو رہ رہے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنسن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ... میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں... یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کو آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں'' (ص ۳۹، ۴۰)۔ اس کے پورے تین مہینے بعد غالب نے پھر لکھا: ''مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بنا ٹکٹ پھر نہیں سکتا۔ ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا'' (ص ۴۳)۔ اسی مہینے ایک اور خط میں لکھا: ''وہ عزت اور وہ ربط ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں؟ روٹی کا ٹکڑا ہی مل

جائے تو غنیمت ہے'' (ص ۴۵)۔ پھر تین مہینے بعد جون ۱۸۵۸ء میں لکھا کہ میری شاعری کا حال یہ ہے کہ شعر کہنے کا ڈھنگ اور پہلے کہی گئی شاعری، سب بھول گیا ہوں:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں غالب کے کئی شناسا، دوست اور شاگرد یا تو باغیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا انگریزوں کے ظلم وستم کے دوران جان سے گئے۔ درج بالا خط میں غالبؔ نے آگے لکھا ہے:

''یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو 'روسیاہ کالوں' کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو؟ ہائے، اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔'' (ص ۵۴)

ستمبر ۱۸۵۷ء میں دلّی پر قبضے کے بعد غصے اور نفرت سے اندھے ہوکر انگریزوں نے اس قدر اندھا دھند ظلم ڈھائے کہ ان کے ظلم وستم سے انگریز جتنے خلاف ہوئے، اتنے ہی وہ لوگ بھی ہوئے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا تھا، بلکہ ان میں بہت سے انگریزوں سے بہتر تعلق رکھنا چاہتے تھے اور کچھ لوگوں نے تو ان کی مدد بھی کی تھی۔ دہلی کالج ۱۸۳۰ء سے جدید علوم اور سائنس کی تعلیم اور نئی فکر کا اہم ترین مرکز تھا۔ یہاں پڑھنے والے مولوی اور ذہین نوجوان انگریزوں سے دشمنی کا جذبہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ اپنے انگریز پرنسپل سے ان کا بڑا اچھا تعلق تھا۔ مغربی علوم، سائنس اور عقلی نقطۂ نظر کو اپنانے میں ان کی گہری دل چسپی تھی۔ ذکاء اللہ خاں، الطاف حسین حالیؔ اور محمد حسین آزاد، دہلی کالج سے تعلیم حاصل کرنے والے ایسے ہی ذہین نوجوان تھے جنھوں نے اپنے دائرۂ کار میں نمایاں

خدمات انجام دیں۔ بغاوت کے دوران اور بغاوت کے بعد ان پر اور ان کے خاندان والوں پر کیا گزری؟ اردو ادب کے پہلے تاریخ نگار محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر کا ادب کے علما و فضلا میں شمار تھا۔ انھوں نے ہی دلّی سے اردو کا پہلا اہم اخبار 'دہلی اردو اخبار' جاری کیا تھا۔ خود محمد حسین آزاد اردو کے مشہور شاعر ذوقؔ کے شاگرد تھے، یہ وہی ذوقؔ تھے جن کے ایک شاگرد خود بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھے۔ دلّی پر قبضہ کر لینے کے بعد انگریزی اور سکھ فوج نے جو قتلِ عام کیا، اس میں محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر بھی مارے گئے، باوجود اس کے کہ انھوں نے دہلی کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر ٹیلر کی جان بچانے کے لیے انھیں اپنے گھر میں پناہ دینے کی کوشش کی تھی۔ ان کا قتل کرنے کے بعد ان کی حویلی اور جائیداد بھی انگریزوں نے ضبط کر لی۔ آزاد کو اپنا گھر بار اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جان بچانے کے لیے بھیس بدل کر دلّی سے بھاگنا پڑا۔ وہ صرف ایک چیز اپنے ساتھ لے جا سکے — اپنے استاد ذوقؔ کی غیر مطبوعہ غزلوں کا دیوان۔ بغاوت کے بعد جو قہر ٹوٹا، اُس نے آگے چل کر آزادؔ کو ذہنی طور پر مریض بنا دیا اور ۱۸۹۰ء میں ان کو جنون ہو گیا۔ (روبنسن، ص ۱۸۶)

الطاف حسین حالیؔ، سیّد احمد کے اچھے دوست اور عقیدت مند تھے۔ ۱۸۵۷ء کے دوران وہ دلّی کے پاس حصار کے سرکاری دفتر میں کام کرتے تھے۔ بغاوت ہونے پر انھیں حصار چھوڑ کر اپنے گھر پانی پت واپس آنا پڑا۔ ان کا سب کچھ چھن گیا — صرف حمائل شریف ان کے پاس تھی۔ بغاوت کی دہشت اور خون خرابے کے نظاروں اور خود جھیلی ہوئی تکلیفوں نے انھیں بیمار بنا دیا۔ کئی مہینوں تک وہ اس صدمے سے باہر نہیں آ سکے۔ اگلے کئی برسوں تک وہ کچھ کام بھی نہیں کر سکے۔ (روبنسن، ص ۱۸۵)

سیّد احمد کے قریب ترین دوستوں میں ایک ذکاء اللہ خاں انیسویں صدی کے اہم علما میں سے تھے۔ انھوں نے اردو میں حساب، فزکس، تاریخ اور جغرافیہ جیسے جدید موضوعات پر کتابیں لکھی تھیں۔ ان کے آبا و اجداد مغل بادشاہوں کے اتالیق رہے تھے۔ دہلی کالج سے پڑھائی ختم کرنے کے بعد ذکاء اللہ آگرہ کالج اور میور کالج الہ آباد میں پڑھاتے رہے۔ پھر وہ دلّی آ کر نارمل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ بغاوت کے دوران ان دہشت ناک واقعات کی تفصیل برسوں بعد انھوں نے اپنے دوست سی. ایف. اینڈریوز کو بتائی (اینڈریوز نے ذکاء اللہ کی سوانح لکھی ہے)۔ جدید علوم اور ہر چیز کو عقل و بصیرت سے جانچنے کا ایک

نیا زاویۂ نظر رکھنے والے دیگر اعلا طبقے کے نوجوانوں کی ہی طرح ذکاء اللہ کے لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک خوفناک صدمے جیسی تھی۔ اس صدمے نے ان اعلا طبقے کے تعلیم یافتہ شہری نوجوانوں کی زندگی کے سبھی خوابوں اور مستقبل کے منصوبوں کو چکنا چور کردیا۔ ان کی زندگی بری طرح بکھر گئی۔ باغیوں نے ان نوجوانوں کے نہایت ہر دل عزیز اور محترم پرنسپل مسٹر ٹیلر کو قتل کردیا تھا۔ کالج کے سب سے ذہین اور لائق پروفیسر رام چندر کا بھی قتل کردیا گیا۔ پروفیسر رام چندر، ہندو مذہب کے رسم و رواج اور توہم پرستی کی سخت تنقید کرتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے انھوں نے ہندو مذہب چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ اپنے بے حد عزیز پروفیسروں کے قتل سے ذکاء اللہ اور ان کے دوست بے چین ہو اٹھے۔ ذکاء اللہ نے اپنے سوانح نگار اینڈریوز کو بتایا کہ بغاوت کے دوران وہ سبھی نوجوان گہرے تذبذب میں پڑ گئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کریں، کس طرف جائیں؟ باغیوں کے اور اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف جانا ان کے لیے ناممکن تھا، یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دہلی کالج سے فارغ التحصیل ایک بھی طالب علم اُس بغاوت میں شامل نہیں ہوا۔ جب باغیوں نے شہر پر قبضہ کرلیا تو دہلی کالج ٹوٹ گیا کیوں کہ کالج کا انگریزوں سے اچھا تعلق تھا۔ کالج کے پروفیسر اور طلبہ، باغیوں کے شک کے گھیرے میں آ گئے۔ ذکاء اللہ نے بتایا کہ اس افراتفری اور گہرے صدمے کے دور میں وہ اپنے گھر میں بند ہو کر رہنے لگے۔ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ خون خرابے کا ماحول ختم ہو جانے کا انتظار کرتے رہے۔ برسات کا موسم ختم ہونے سے پہلے ہی ستمبر ۱۸۵۷ء میں شہر پر انگریزوں نے دوبارہ سے قبضہ جمالیا۔ پھر سارا شہر انگریز اور سکھ فوجیوں کے وحشیانہ تشدد اور لوٹ مار کا شکار بن گیا۔ ایک بھی گھر ان کی لوٹ سے بچ نہ سکا۔ غصے اور نفرت سے پاگل انگریزوں نے کسی بھی مسلمان کو نہیں بخشا۔ شہر میں کئی دنوں تک کھلے عام خون خرابہ چلتا رہا اور بے حد حساس طبیعت کے ذکاء اللہ اُس خون خرابے کے خاموش گواہ بننے پر مجبور تھے۔ اس دہشت انگیز دور کی یادیں ان کے دل و دماغ سے کبھی محو نہیں ہوئیں۔ اپنے کالج کے جس ایک پروفیسر کو وہ سب سے زیادہ چاہتے تھے — وہ تھے مولوی امام بخش صہبائی، جو نہایت صوفی منش تھے اور جن کا تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات پر سب سے زیادہ اثر پڑا تھا — ان کو سرکاری فوج نے قتل کردیا۔ انگریز سرکار نے جامع مسجد سے لے کر لال قلعے تک ہر مکان کو خاک میں ملا دینے کا فرمان جاری کیا تو ذکاء اللہ کی خاندانی حویلی بھی اس کی زد میں آ گئی۔ کسی کو بھی معاوضہ نہیں

دیا گیا۔ خاندانی جائیداد اور حویلی سے محروم ذکاء اللہ کے بوڑھے والدین اور خاندان کے افراد کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ بے گھر اور ایک ایک دانے کے محتاج ناچار ان کو حضرت نظام الدین اولیا کے مقبرے میں پناہ لینی پڑی اور رات کھلے آسمان کے نیچے کاٹی۔ بھوک پیاس، خوف اور دہشت کی ان دنوں کی یادیں چھیالیس سال بعد ذکاء اللہ نے پہلی بار مسٹر اینڈریوز کو بتائیں۔ (سی.ایف.اینڈریوز، ص ۶۵-۶۲)

جن دنوں یہ تباہی دلّی میں ہو رہی تھی، انھیں دنوں بجنور میں نواب محمود خاں کے حکم پر سیّد احمد کا مکان باغیوں نے لوٹ لیا اور اس پر اپنا قبضہ جمالیا۔ سیّد وہاں سے پیدل چل کر بھوکے پیاسے کسی طرح میرٹھ پہنچے اور وہاں چار پانچ مہینوں تک رہے۔ یہیں پر انھیں دلّی میں سرکاری فوج کے ہاتھوں ہونے والے قتل عام کی خبر ملی۔ یہیں انھیں اپنے دوستوں اور جاننے والوں کے خاندانوں کی تباہی کا پتا چلا۔ انھیں معلوم ہوا کہ خود ان کے رشتہ داروں کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ ان کا پشتینی مکان چھین لیا گیا ہے۔ یہ سب سن کر سیّد اپنی والدہ کا حال جاننے اور ان سے ملنے کے لیے بے چین ہو اٹھے۔ انھیں اپنی والدہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا دلّی میں اور کوئی نہیں بچا تھا۔ نانا اور والد کی موت بہت پہلے ہو چکی تھی۔ حالی اور حفیظ ملک، دونوں نے سیّد کے دلّی جانے اور اپنی والدہ سے ملاقات کا نہایت جذباتی انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق سیّد جب دلّی پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ دلّی پر قبضے کے بعد سرکاری فوجوں نے ان کے مکان کو پوری طرح لوٹ لیا تھا۔ ان کے دونوں چچا اور چچیرے بھائیوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور ان کے باقی خاندان کے رشتہ داروں کو دیگر مسلمانوں کے ساتھ شہر سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ اس افراتفری میں ان کی والدہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ ایک خالی پڑی ہوئی جھونپڑی میں رہ رہی تھیں جہاں ایک غریب بیوہ عورت 'زیبُن' ان کی خدمت کر رہی تھی۔ ان کی ماں اور خالہ کو تین دن سے کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب سیّد وہاں پہنچے تو انھیں دیکھ کر یہ عورتیں چونک اٹھیں۔ خوف اور دہشت کے عالم میں انھوں نے سیّد کو وہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو سرکاری فوج کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ جب سیّد نے انھیں بھروسا دلایا اور بتایا کہ وہ سرکاری اجازت سے وہاں آئے ہیں تو انھیں کچھ اطمینان ہوا۔ کئی دنوں سے بھوکی پیاسی ماں نے اپنے بیٹے سے پینے کا پانی مانگا۔ اس جھونپڑی میں نہ پانی تھا نہ پانی لانے کے لیے کوئی برتن۔ کافی دیر تک پانی کی تلاش میں لگے رہنے کے بعد آخرکار

سرکار کا قابلِ اعتماد یہ ملازم لال قلعے میں گیا اور وہاں سے پانی لے آیا۔ راستے میں سیّد کو بدحال زینت ملی۔ سیّد نے اس کے مٹی کے ٹوٹے سکورے میں پانی ڈالا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ جھونپڑی میں مالکن پیاسی پڑی ہوئی ہیں۔ سیّد نے آکر ماں کو پانی پلایا۔ باہر راستے پر زینت کی اسی وقت موت ہوگئی۔ ماں اور خالہ کو اپنے ساتھ لے کر سیّد نے میرٹھ چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن انگریزوں کے ظلم و ستم سے تباہ و برباد دلّی میں کوئی گاڑی نہیں ملی۔ سرکاری حاکموں سے کہہ سن کر آخرکار انھیں میرٹھ جانے والی ایک ڈاک گاڑی میں جگہ مل گئی۔ میرٹھ میں انھوں نے اپنی والدہ کی خوب دیکھ بھال کی لیکن پہلے باغیوں کے، پھر انگریزوں کے خون خرابے کے درمیان رہتے ان کی ماں نے اتنی تکلیفیں جھیلی تھیں کہ اب وہ نہ دوا ہضم کر پاتی تھیں نہ کھانا۔ کچھ دنوں میں ان کی موت ہوگئی۔ اس کے تین سال کے اندر ۱۸۶۱ء میں ان کی بیگم کا بھی انتقال ہوگیا۔ اپنے دو چھوٹے چھوٹے بیٹوں اور ایک بیٹی کی دیکھ بھال کرنے کے لیے سیّد اکیلے رہ گئے۔

سیّد کی زندگی میں یہ سب سے نازک دور تھا۔ دلّی کی تباہی اور اپنے عزیزوں، رشتے داروں کی موت نے ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ انھیں باغی ہندوستانیوں سے انگریزوں کا بدلہ لینا اور قتل و غارت گری کرنے والے باغیوں کو سزا دینا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن غصے میں اندھے ہوکر اتنے بڑے پیمانے پر تباہی مچانا، بے قصور لوگوں کو قتل کرنا، عزت دار شریف خاندانوں کو — جس میں خود سیّد کے خاندان کے افراد بھی شامل تھے — بے گھر کر دینا اور پورے شہر کو اجاڑ کر خاک میں ملا دینا، سمجھ میں نہیں آیا۔ انگریزوں کے اس وحشیانہ انتقام نے ان کے دل کو گہرے دکھ اور افسوس سے بھر دیا کیوں کہ وہ خود انگریزوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ انگریزی حکومت اور اپنی قوم کے درمیان وہ ایک گہرے تناؤ سے گھر گئے۔ اپنی قوم کی تباہی اور بربادی کو دیکھ کر ان کے دل میں احساسِ ندامت پیدا ہوگیا۔ ان جذبات نے انھیں بے چین کر دیا۔

بغاوت کے تقریباً تیس برس بعد اپنی قائم کردہ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو یاد کیا۔ انسان دوست جذبات سے متاثر ہوکر انگریزوں کی جان بچانے کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اپنی قوم کی تباہی کو بھی یاد کیا۔ انھوں نے کہا:

''بغاوت کے دوران انگریز خاندانوں نے جو ذلت برداشت کی اور

خود ہماری قوم کی جو تباہی ہوئی، کئی معزز خاندان خاک میں مل گئے، ان سب کو یاد کر کے آج بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ بغاوت کے ختم ہو جانے کے بعد مجھے اپنی جائیداد کھونے اور اپنی حویلی لوٹے جانے کا اتنا غم نہیں ہوا جتنا اپنی قوم کی تباہی کو اور ہندوستانیوں کے ہاتھوں انگریزوں کی تکلیفوں کو دیکھ کر ہوا۔ جب میرے دوست مسٹر شیکسپیئر نے، جنھوں نے مصیبتوں کے درمیان میرا ساتھ دیا، برٹش فائدوں کے لیے میری وفاداری کے انعام میں مجھے جہاں آباد کے سیدوں کا تعلقہ دینے کی پیش کش کی، جس کی مالگزاری اس وقت ایک لاکھ روپے سالانہ کی تھی، تو میں گہرے درد و غم سے بھر گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا — اس تباہی کے دور میں سب سے زیادہ تباہ تو میں خود ہو گیا ہوں۔ میری قوم کو اتنی تکلیفیں جھیلنی پڑیں اور اس کی قیمت پر مجھے تعلقہ دار بنایا جا رہا ہے۔ میں نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور مسٹر شیکسپیئر سے کہا کہ میں اب ہندوستان میں رہنا نہیں چاہتا۔

> اس وقت مجھے لگا تھا کہ ہماری قوم اب پھر کبھی اٹھ نہیں سکے گی اور نہ پہلے جیسی عزت حاصل کر سکے گی۔ اپنی قوم کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی کئی دن تک میں گہری مایوسی میں ڈوبا رہا۔ یقین کریں، اس درد نے مجھے وقت سے پہلے ہی بوڑھا بنا دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔'' (حفیظ ملک، ص ۷۷)

اِن سطور میں اس دور کے سید کا ذہن جھلکتا ہے۔ پرانے اعلا طبقے کا یہ فرد اپنے طبقے اور اپنی قوم کی تباہی پر بہت اداس اور رنجیدہ تھا۔ وہ کمال افسوس اور ملامت کے جذبے سے بھرے ہوئے تھے۔ انھیں لگ رہا ہوگا کہ اپنی قوم کی اس بدحالی کے لیے وہ بھی کہیں نہ کہیں ذمہ دار ہیں! انگریزوں کے ساتھ رہ کر بھی وہ اپنی قوم کو اس تباہی سے بچا نہیں سکے۔ کیا یہ لعنت اور شرم کی بات نہیں ہے؟ اب وہ کیا کریں؟ انھیں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ ان کے سامنے صرف شرم اور اندھیرا تھا۔ وہ اس حالت کا سامنا نہیں کر پا رہے تھے۔ اس شرم اور اندھیرے سے بچنے کے لیے وہ ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر مصر چلے جانے کی بات سوچنے لگے تھے۔ یہ شاید ان پر اپنے والد کی شخصیت کا اثر تھا جو اپنے درویشانہ مزاج کی وجہ سے دنیاوی

جھمیلوں سے دور رہنا چاہتے تھے اور اپنی ذمہ داریوں سے بچتے تھے۔

لیکن اسی مایوسی، ندامت اور درد و غم سے ایک نئے سیّد کا جنم ہوا۔ والد کی جگہ ایک بار پھر نانا کی شخصیت نے انھیں متاثر کیا اور یہی اثر فیصلہ کن ثابت ہوا۔ سیّد نے ہندوستان سے جانے کا ارادہ چھوڑ دیا اور یہیں رہ کر اپنے ملک اور قوم کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کا فیصلہ کیا۔ اپنی اسی تقریر میں انھوں نے کہا:

> ''۱۸۵۸ء میں میرا تبادلہ مرادآباد میں ہوگیا۔ یہاں آکر میں نے پورے شہر کو ایسے ماتم خانے میں تبدیل پایا جہاں اپنی قوم کی بربادی اور معزز خاندانوں کی موت کا سیاپا کیا جارہا تھا۔ اس نظارے نے میرے درد کو اور گہرا کردیا۔ اُسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اپنے امن چین کے لیے کسی محفوظ جگہ میں بھاگ جانے کا میرا ارادہ اپنی مردانگی کے اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کے خلاف ہوگا۔ مجھے اپنی قوم کی تکلیفوں میں حصہ بٹانا چاہیے۔ مجھے چاہے جتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اپنی قوم کی تکلیفوں کو کم کرنے میں مددگار ہونا میرا فرض ہے۔ اُسی دم میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ملک چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا اور قوم کی بھلائی میں اپنی زندگی لگادوں گا۔'' (ایضاً ص ۷۶)

بغاوت کے تین سال بعد ۱۸۶۱ء میں جب ان کی بیگم کا انتقال ہوا، سیّد چونتیس سال کے تھے۔ ایک لڑکی کے علاوہ دس گیارہ سال کے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔ اپنی زندگی کو قوم کی بھلائی میں وقف کردینے کا ان کا جذبہ ہی ہوگا کہ بھری جوانی میں بھی انھوں نے پھر دوبارہ شادی نہیں کی۔

قوم کی بھلائی کا عہد کرنے کے بعد سیّد کے سامنے ایک ساتھ دو بڑے مسئلے تھے — انگریزوں کے دل و دماغ سے مسلمانوں کے خلاف نفرت کو کیسے دور کریں؟ اور کیسے انگریزی حکومت اور علوم جدیدہ کے خلاف مسلمانوں کے رخ کو موڑ کر، ملک کے بدلے ہوئے سیاسی، معاشی حالات میں، انھیں جدید علوم اپنانے کے لیے تیار کریں؟ سیّد کا مقصد تھا کہ انگریزوں اور اعلا طبقے کے مسلمانوں کے درمیان دشمنی ختم ہوجائے اور جدید علوم سے

آراستہ ہوکر اعلا ذات کے مسلمان سرکاری عہدوں پر پہنچ کر دوبارہ سے اپنی اعلا سماجی حیثیت حاصل کرلیں۔ یہ کام کافی مشکل تھا۔ اپنے زمانے اور تاریخ کے رخ کو بدلنے کا تھا۔ سیّد نے یہ بیڑا اٹھالیا۔ وہ انگریزوں اور مسلمانوں دونوں کے ایک دوسرے کے لیے نظریے کو بدلنے کے کام میں لگ گئے۔ یہ کام انھوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور اپنی تنظیم کے ذریعے کرنا شروع کیا۔ انگریزوں کے غصے کے پیچھے ان کا یہ یقین تھا کہ ان کے خلاف جنگ کرتے رہنا مسلمان اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ جب باغیوں کی گرفتاری اور سزا دینے کا دور شروع ہوا تو کئی ہندو بھی بغاوت کا اصل ملزم مسلمانوں کو ٹھہرانے لگے (یہ کام بھارتیندو تک نے کیا)۔ سرکار کے سامنے خود کو بے قصور اور وفادار دکھانے کا سب سے آسان راستہ بھی یہی تھا کیوں کہ سرکار خود بھی بغاوت کا اصل ذمہ دار مسلمانوں کو ہی مانتی تھی۔ اسی سلسلے میں حالی نے لکھا ہے کہ بغاوت کا الزام مسلمانوں پر منڈھنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا مسلمان ہونا ہی انھیں ملزم ٹھہرانے کے لیے کافی تھا اور کوئی بھی مسلمان سرکار سے ہمدردی نہیں کرسکتا تھا:

> "To incriminate a muslim. there was no need for any proof. His merely being a Muslim was enough to establish his guilt and no Muslim could expect any sympathy from the Government." (Hali, P.91)

اس دور میں یعنی ۱۸۶۰ء کی دہائی میں بغاوت کے بارے میں جتنی بھی کتابیں شائع ہوئیں، رسائل اور اخبارات میں تحریریں آئیں، سب میں بغاوت کے لیے بالخصوص مسلمانوں کو ملزم ٹھہرایا جارہا تھا۔ سیّد اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے نفرت انگیز ماحول میں اس ملک میں مسلمان اپنی حالت کو کبھی بہتر نہیں بنا سکیں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے انھوں نے اس بغاوت کی ہی تحقیق کی اور انگریزوں کو خود اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کیا۔ 'اسبابِ بغاوتِ ہند' کے بعد سیّد نے ایک کتاب اور لکھی: 'The Loyal Mohammadans of India'، اس میں انگریزوں کی نظر میں مسلمانوں کی جو تصویر بدلنے کے لیے سیّد نے ٹھوس مثالیں دے کر بتایا کہ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے بغاوت کے دوران انگریزوں کی جان بچانے میں سب سے آگے بڑھ کر اپنا فرض نبھایا تھا۔ کافی چھان بین کرکے، حقائق کو جمع کرکے، سیّد نے ثابت کیا کہ کسی بھی قوم کے مقابلے میں مسلمانوں نے انگریزوں کی سب سے زیادہ مدد کی۔ ان

کے بیوی بچوں کی جان بچائی اور انھیں بحفاظت باہر نکالا۔ اس طرح سیّد اس بغاوت کی تصویر کا دوسرا، پوشیدہ پہلو سامنے لے کر آئے۔ دوسری طرف سیّد نے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے دل میں بیٹھے کچھ تصورات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے سیاق میں انھوں نے جہاد کے تصور کو غلط ٹھہرایا اور اس پر زور دیا کہ انگریزی حکومت کے باوجود ہندوستان، اسلام کے دشمنوں کا ملک (دارالحرب) نہیں ہے۔ یہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر چلنے کی پوری آزادی ہے اور اس لیے یہ 'دارالامن' ہے۔

اس کے بعد عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی مذہبی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے سیّد نے عیسائی مذہب اور اسلام کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ مذہبی مطالعے کی تاریخ میں سیّد احمد شاید پہلے مسلم عالم تھے جنھوں نے ان دونوں مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا۔ لیکن ان کے اس مطالعے کا مقصد راجا رام موہن رائے کے اسی طرز کے مفصل تقابلی مطالعہ 'تحفۃ الموحدین' سے کافی الگ تھا کیوں کہ دونوں کے مطالعے کے اغراض و مقاصد بھی علاحدہ تھے۔ جہاں رام موہن رائے سبھی مذہبوں میں پوشیدہ غیر منطقیت اور غیر عقلیت کی تردید کرتے ہوئے انھیں انسانی عقل و شعور اور اخلاق کی کسوٹی پر جانچنے کے لیے ان کا تقابلی مطالعہ کر رہے تھے، وہیں سیّد کا مقصد ہندوستان میں انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان موجود مخالفت کا جذبہ، بے اعتمادی اور غلط فہمیوں کو دور کر کے ان کی قربت اور نزدیکی کو قائم کرنا تھا۔ اس مطالعے کے لیے سیّد کو کئی زبانوں کی مذہبی کتب حاصل کرنی پڑیں جس میں ان کا کافی سرمایہ بھی لگا۔ بغاوت کے بعد سرکاری فوج کے ذریعے اپنا گھر اور سرمایہ لوٹے جانے کا جو معاوضہ انھیں ملا تھا، اس کا سارا پیسہ انھوں نے اپنے مطالعے کے لیے کتابیں حاصل کرنے اور انگریزی اور عربی مترجموں کا خرچ اٹھانے میں لگا دیا۔ اسے چھاپنے کے لیے انھوں نے خود پیسہ لگا کر رُڑکی میں ایک پریس کھولا اور اردو، انگریزی اور عبرانی کے ٹائپ ڈھلوائے۔ اپنے مطالعے میں سیّد نے یہ پیش کرنے کی کوشش کی کہ اسلام اور عیسائی مذہب آپس میں سب سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں کئی مماثلتیں ہیں۔ اسلام کے لیے عیسائیوں کی غلط فہمیوں اور شبہات کو دور کرتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کے اس تصور کی بھی تردید کی کہ بائبل ایک غیر مستند صحیفہ ہے۔

اس درمیان ۱۸۶۰ء میں مرادآباد میں قحط پڑا تو قحط زدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے دن رات فلاح و بہبود کے کام کر کے، اسپتال کھول کر، ہر طرح سے لوگوں کی مدد کر کے سیّد نے

اپنی ایمانداری اور انتظامی صلاحیتوں سے سب کو متاثر کیا۔ فلاح و بہبود کی خدمات سے فراغت پاکر سیّد نے اودھ اور شمال مغربی صوبے میں دو اہم ادارے قائم کیے۔ ان میں سے ایک 'سائنٹفک سوسائٹی' تھی جو ہندی اردو اکثریتی صوبے کے اعلا طبقے کے درمیان جدید علوم، سائنس اور عقلی افکار کی ترویج و تشہیر کا ایک اہم عوامی ادارہ تھا۔ اس ادارے کی پہلی نشست جنوری ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ہوئی۔ بعد میں سیّد کے علی گڑھ چلے جانے پر ادارے کا مرکز وہیں قائم ہوا۔ ارشد علی اعظمی نے ۱۹۶۹ء کی انڈین ہسٹری کانگریس میں ایک تحقیقی مقالہ پڑھتے ہوئے ادارے کے درج ذیل مقاصد پر روشنی ڈالی:

۱- ادارے کا مقصد یوروپ کے فنون اور سائنس سے متعلق کتابوں کا ہندوستانی میں ترجمہ کرنا ہوگا تاکہ ہندوستانی لوگ بھی ان کتب کو آسانی سے پڑھ سکیں۔
۲- ادارہ خود ہندوستان میں ایسی کتابوں کو تلاش کرنے اور انھیں شائع کرنے کا کام کرے گا۔ لیکن یہ کتابیں مذہبی نہیں ہوں گی۔
۳- ہندوستانیوں کے علم میں اضافے کے لیے ادارہ رسائل، اخبارات اور گزٹ کی اشاعت کرے گا۔
۴- وقت بہ وقت سائنسی موضوعات کے تراجم اور ان کی اشاعت اور سائنسی آلات کی نمائش کے ساتھ ساتھ ادارہ سائنسی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس ادارے نے مذہب کو اپنے دائرۂ کار سے باہر رکھا۔ ہندوستانی زبان میں یہاں کے لوگوں کے درمیان سائنسی معلومات کو بڑھاوا دینا، انھیں سائنسی آلات سے متعارف کرانا، ادارے کے اہم ترین مقاصد تھے۔ ادارے کے تین اہم مقاصد تھے: (۱) لوگوں کو اپنے ملک کے قدیم و جدید ادوار کی تاریخ سے متعارف کرانا اور ان کی تاریخ سے متعلق لاعلمی کو دور کرنا تاکہ چیزوں کو دیکھنے کا تاریخی تناظر وسیع ہو۔ (۲) لوگوں میں سائنسی اور تکنیکی علوم سے واقفیت، خصوصاً زرعی پیداوار کے میدان میں۔ (۳) سیاسی و معاشیاتی اداروں سے متعلق لوگوں میں تعلیم و تربیت اور بیداری پیدا کرنا۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے سوسائٹی نے انگریزی، اردو اور فارسی میں غیر معمولی اہمیت کی حامل تاریخی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ سب سے زیادہ زور سوسائٹی نے جدید انداز سے کھیتی کرنے کے طریقِ کار کی ترقی پر دیا۔ اس کے لیے ایک فارم اور باغیچے میں نئے

سائنسی آلات کے استعمال کی نمائش کر کے بڑے زمینداروں کو جدید سائنسی زراعتی پیداوار کے طریق کار کی طرف موڑنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۸۸۶ء میں سوسائٹی نے The Aligarh Institute Gazette کے نام سے ہفتہ وار اخبار شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا — پریس کی آزادی کو بحال کرنا سرکار کا فرض ہے اور اس آزادی کو قائم رکھنا لوگوں کا فرض ہے — اس اخبار نے سرکاری تعلیمی نظام اور انگریزی کے ذریعے تعلیم کی سخت تنقید کی۔ اس نے تعلیمی اداروں کے لیے سرکاری افسروں کے علاوہ ایک ایسی کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی جس میں شہریوں کی مناسب نمائندگی بھی ہو۔ اس اخبار نے سبھی لوگوں کو علاقائی زبانوں میں مختلف علوم اور سائنس کی جدید تعلیم پر زور دیا۔ اخبار میں ہونے والی تنقید سے محکمۂ تعلیم کافی ناراض ہوا۔ لہٰذا اس کے اڈیٹر منشی محمد یار خاں کو ۱۸۶۸ء میں اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا (انڈین ہسٹری کانگریس، ۱۸۶۹ء، ص ۴۲۰)۔ سید احمد کی قائم کردہ اس سوسائٹی کے سو ممبروں میں (۱۸۷۵ء میں) دس یوروپین، انتالیس مسلمان اور اڑتالیس ہندو تھے۔ عام طور پر یہ ممبر سرکاری افسر، زمیندار، وکیل، ان تین میں سے منتخب ہوتے تھے۔ (حفیظ ملک، ص ۸۷)

۱۸۶۶ء میں سیّد احمد نے ایک دوسری اہم انجمن The British Indian Association بنائی جس کا مقصد ہندوستانیوں کی آواز کو برٹش پارلیمنٹ تک پہنچانے کی کوشش کرنا تھا۔ اس انجمن کو سیّد نے کلکتے میں ۱۸۵۱ء میں بالکل اسی نام سے بنی انجمن سے متاثر ہو کر بنایا تھا۔ سیّد خود اس کے آنریری سکریٹری بنے۔ اس انجمن نے شمال مغربی صوبے میں علاقائی سطح کے نظام حکومت (ایڈمنسٹریشن) میں ہندوستانیوں کی نمائندگی میں اضافے اور نگرانی کے لیے ضلع کی سطح پر تنظیمیں بنانے کا مشورہ دیا۔ ان مسائل پر یہ ادارہ سائنٹفک سوسائٹی کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ انجمن کے آنریری سکریٹری کی حیثیت سے سیّد نے ۱۸۶۶ء میں کتابوں کو ڈاک سے بھیجنے پر لگنے والے محصول کو بڑھانے کے سرکاری قدم کی یہ کہتے ہوئے سخت تنقید کی کہ یہ علم حاصل کرنے پر ٹیکس لگانا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں ایسوسی ایشن نے سرکار سے شمالی مغربی صوبے میں ایک ایسی یونی ورسٹی کھولنے کا مطالبہ رکھا جہاں جدید علوم اور سائنس کی تعلیم صوبے کی علاقائی زبان اردو میں دی جا سکے۔ دیانند سرسوتی کی طرح سیّد احمد نے بھی ہندوستانی طلبہ کو، بالخصوص مسلمانوں کو یوروپ جا کر جدید علوم اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔ لیکن بیشتر ہندوستانی مسلمان اب بھی انگریزوں اور یوروپی

لوگوں سے ربط ضبط رکھنا اپنے مذہب اور اخلاقی اقدار کو ناپاک کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ لہٰذا ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کرنے کے لیے سیّد نے خود انگلینڈ جانے کا فیصلہ کیا۔

وقت کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کو بدلنے کے لیے سیّد نے سب سے زیادہ زور جدید تعلیم پر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے انھوں نے دو اسکول کھولے ـــــ ایک مرادآباد میں، دوسرا غازی پور میں۔ انگلینڈ سے واپسی پر جدید تعلیم سے متعلق خود مختار اور آزاد ادارے کا تصور اور تجربہ حاصل کیے ہوئے سیّد اعلا طبقے کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کیمبرج جیسی ایک یونی ورسٹی کھولنا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں میں جدید تعلیم کی طرف رجحان بہت کم تھا۔ اسی مسئلے پر سیّد نے غور وخوض کیا کہ آخر کیوں ہندوستانی مسلمان انگریزی تعلیم سے دور رہنا چاہتے ہیں؟ اس سوال پر انھوں نے کئی لوگوں سے تبادلۂ خیال کیا اور ان کے خیالات کا تجزیہ کر کے مسئلے کے اسباب معلوم کیے۔ جدید تعلیم کی طرف رغبت دلانے کے لیے مسلمانوں کے جذبات اور خیالات کو بدلنے کے لیے بڑے پیمانے پر مہم چلائی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے سرکار سے بھی اس کے نظامِ تعلیم میں موجود ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کہا جن کی وجہ سے مسلمان سرکاری اسکولوں میں اپنے بچوں کو بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنی ایمان داری اور لگن سے سیّد نے ہر طرح کی رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آخر کار ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ محمڈن اورینٹل کالج قائم کیا جس نے آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی صورت اختیار کی۔ کالج کے قیام کے لیے سیّد نے اپنے ہندو اور مسلمان دوستوں اور حامیوں سے ایک لاکھ روپیہ جمع کیا تھا۔ سیّد کے جدید اور وسیع النظر مذہبی خیالات کی وجہ سے روایت پرست اور کٹر قسم کے علما ان کے سخت خلاف تھے۔ نتیجے کے طور پر سیّد کی جدید نظامِ تعلیم سے متعلق کوششوں میں مسلمانوں نے اتنی مدد نہیں کی جتنی ہندوؤں نے۔ کالج کو قائم کرنے میں سیّد کی ایمان داری اور سنجیدگی کو تو ایک چھوٹی سی مثال سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کالج کو کھولنے کے سلسلے میں انھیں دنوں اپنے بڑے بیٹے محمود کی شادی کے بعد ولیمے کی دعوت بھی نہیں کی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ناراض ہوگئے۔ سیّد نے انھیں جواب دیا: ''میں نہ تو زمیندار ہوں، نہ امیر ہوں۔ اگر دعوتِ ولیمہ کرتا تو مجھے اس پر پانچ سو روپے خرچ کرنے پڑتے۔ ان روپیوں کو میں نے کالج کے فنڈ میں جمع کرادیا۔'' (حالی، ص ۲۲۹)

علی گڑھ کالج میں تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کی ایسی نسل تیار ہوئی جو ہندوستانی مسلم معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لائی۔ لیکن سیّد کا مقصد تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کی جو سرکار پرست نسلیں تیار کرنا تھا وہ پورا نہ ہوسکا، جیسا کہ بیس بائیس برس میں ظاہر ہوگیا۔ اُس زمانے کا بنیادی تضاد یہ تھا کہ ایک طرف برٹش سامراج تھا اور دوسری طرف ہندوستانی عوام۔ یہ تضاد اتنا شدید تھا کہ اس کے سبب سیّد کے مشن کو ناکام ہونا ہی تھا۔ علی گڑھ کی تعلیمی مہم نے دو رجحانات کو جنم دیا۔ ایک رجحان نے مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ صورت اختیار کرلی۔ سیّد نے اپنی تعلیمی مہم کے اس نتیجے کا تصور شاید ہی کیا ہوگا۔ دوسرے رجحان کا حامل طبقہ سیّد کے مقصد کو ناکام کرتے ہوئے برٹش سامراج کے خلاف قومی تحریک میں شامل ہوگیا۔ سیّد کے سیاسی مقصد کی اس ناکامی کے باوجود ان کی جدید تعلیم کی تحریک نے اپنا کام کیا۔ اس نے ہندوستانی مسلم معاشرے میں جدید تبدیلیوں کی جو رفتار پیدا کردی، اسے روکنا یا الٹنا ناممکن تھا۔

اس طرح مجموعی طور پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد سیّد احمد نے کتابیں لکھنے، فلاح و بہبود سے متعلق ادارے کھولنے اور ان سب کے وسیلے سے ایک نئی فکر پیدا کرنے کے جو بہت سے کام کیے ـــــ جنھوں نے مل کر اس ملک کے مسلم معاشرے اور اس کی تاریخ کو ایک نئے رخ پر موڑ دیا ـــــ یہ سبھی کام براہِ راست ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے منسلک تھے۔ ان کے یہ کام اُس ملال و افسوس اور درد و غم کا نتیجہ تھے جو اُن کے دل میں بغاوت کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے اور ان ہی کی وجہ سے ایک نئے سیّد احمد کا جنم ہوا جس نے قوم کی بھلائی میں زندگی قربان کردینے کا عہد کرلیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں سیّد احمد جن تجربات سے گزرے، ان تجربوں سے ان کی شخصیت میں جس طرح کی تبدیلی اور کشادہ ذہنی پیدا ہوئی، اسے دیکھتے ہوئے ایک سوال اٹھتا ہے کہ اس ملک کے ہندوؤں میں سیّد احمد جیسا کوئی فرد پیدا کیوں نہیں ہوا؟

مثال کے طور پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں سیّد کی طرح انگریزوں کی جان بچانے اور ان کی مدد کرنے والے تو ہندوؤں میں بھی بہت سے تھے جیسے بھارتیندو کے والد اور شری نواس داس کے والد، راجا شیو پرساد اور راجا لکشمن وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی سیّد جیسا کردار ادا نہیں کیا۔ انگریزوں کی مدد کے ساتھ اپنی قوم کی تباہی اور بدحالی کے احساس، درد و غم اور مصائب سے ابھر کر، قوم کے لیے احساسِ ذمہ داری، اپنی زندگی قربان کردینے والا

ان میں سے کون ہوا؟ کیا ان میں سے کسی نے بھی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بارے میں تحقیق کی ویسی جرأت دکھائی جیسی سیّد میں دکھائی دیتی ہے؟

ایک دل چسپ مثال راجا شیو پرساد کی ہے جنھوں نے اپنی کتاب 'اتہاس تمر ناشک' میں ایک پورا باب ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر لکھا ہے۔ راجا شیو پرساد کے ساتھ سیّد کی تحقیق کا مقابلہ کریں تو ہم حیرانی میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ موازنہ آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ سرکاری حلقوں میں شیو پرساد ہندوؤں کے نمائندے سمجھے جاتے تھے اور صوبے میں سیّد احمد کے سب سے بڑے حریف تھے۔ دونوں انگریزی حکومت کے قابلِ اعتماد حامی تھے۔ بغاوت کے دوران شیو پرساد بنارس میں تھے اور وہاں انگریزوں کی جان و مال کی حفاظت اور ان کی سہولیات کے لیے جو کچھ کیا جاسکتا تھا وہ انھوں نے کیا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر انھوں نے جو کچھ لکھا، سیّد کی تحقیق کے مقابلے میں وہ نہایت گھٹیا اور پوچ ہے۔ سیّد کے مقابلے میں شیو پرساد بہت ہلکے دکھائی دیتے ہیں، وہ ہر بات انگریزوں کا منہ دیکھ کر کہتے ہیں۔ ان کی تحقیق میں وہ سنجیدگی، تاریخی بصیرت، ایمان داری اور بے خوفی دور دور تک نہیں دکھائی دیتی جو سیّد کی تحقیق کی خصوصیات ہیں۔

اپنی تحقیق میں شیو پرساد نے بغاوت کو 'بلوہ' کہتے ہوئے حیرانی ظاہر کی ہے کہ آخر اس بلوے کا سبب کیا تھا؟ انھوں نے لکھا ہے: ''انگریزوں کو اس کا بڑا تعجب ہے اور اب تک اس کے اصلی سبب کی تلاش ہے'' (پرتی بِدھی سنکلن، ص۳۲)۔ چربی لگے کارتوس کا ہونا —— وہ انگریزوں کے گلے کبھی نہیں اُترے گی۔ شیو پرساد سے پانچ برس پہلے سیّد ان اسباب کی تحقیق کر چکے تھے اور آج بھی اُن اسباب کو مستند و معتبر مانا جاتا ہے۔ ان اسباب کی تحقیق کرتے ہوئے سیّد نے اس کی پروا نہیں کی کہ وہ انگریزوں کے گلے اتریں گے یا نہیں۔ سیّد نے بغاوت کو صرف سپاہیوں تک محدود کر کے دیکھنے سے انکار کیا۔ بغاوت میں فوج سے باہر بڑے پیمانے پر سماج نے بھی حصہ لیا تھا اور اس لیے سیّد نے بغاوت کے اسباب میں انگریزوں کے معاشی، سیاسی، عدالتی نظام، ان کے بنائے ہوئے قانون اور ہندوستانیوں سے ان کا رویہ، ان سب کا احاطہ کیا تھا۔ سیّد کی تحقیق کے برعکس، شیو پرساد بغاوت کو خاص طور پر سپاہیوں تک ہی محدود کر کے دیکھتے ہیں اور بغاوت کے اسباب میں چربی لگے ہوئے کارتوس کے علاوہ اور کسی بات پر غور نہیں کرتے۔ اس ایک سبب کے لیے شیو پرساد نہایت طنز آمیز اور ہتک آمیز رویہ اپناتے ہیں۔ وہ منطقیت اور استدلال کے نام پر سپاہیوں کے

مذہبی جذبے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اس کے برعکس اس کا مذاق اڑاتے ہیں: ''گائے کا گوبر، گائے کا موت منہ میں دیں، سارا پاپ دُھل جائے، اُسی گائے کی چربی کہیں ہونٹ سے لگے، جیتا آدمی راکشس گنا جائے'' (ص۳۳)۔ شیو پرساد نے ہندوؤں کے مکھن شوق سے کھانے لیکن چربی سے بچنے پر طنز کرتے ہوئے انگریزوں کی وکالت کی ہے:

> ''ان بے چاروں نے کبھی نہ سنا تھا کہ چربی نرک کا مول اور مکھن دھرم کے جہاز کا مستول ہے، نہیں ان کے لیے چربی کی جگہ مکھن کام میں لانا کیا کٹھن تھا۔'' (ص۳۳)

چربی سے دھرم بگڑنے کی فکر کرنے والے سپاہیوں کو شیو پرساد 'بے وقوف' کہتے ہیں اور اسے بے وقوفی کے علاوہ بغاوت کا اور کوئی سبب نہیں مانتے۔ جب کہ سید احمد فوج کے لیے انگریز افسروں کے برتاؤ اور رویّے کو سپاہیوں کی بغاوت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کیوں کہ انگریزوں کی بے سوچی سمجھی سختی کے سبب سپاہیوں کے سامنے بغاوت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا! سید کی تحقیق میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ سپاہیوں کے لیے گورنر جنرل نے جو حد سے زیادہ سخت رویہ اپنایا، اس سے فائدے کی جگہ نقصان ہی ہوا۔ شیو پرساد کی تحقیق میں یہ اصلیت نہ چاہتے ہوئے بھی خود بخود سامنے آگئی ہے: ''گورنر جنرل سمجھتے تھے کہ اس ترکیب سے سپاہیوں کے دل پر رعب و دبدبہ طاری ہو جائے گا، پر وہاں ان کے دلوں پر اور بھی پھپھولا پڑتا گیا'' (ص۳۶)۔ اس حقیقت کے باوجود شیو پرساد بغاوت کے لیے انگریز افسروں کے سخت رویے کو ذمے دار ٹھہرانے کے بجائے سپاہیوں کی 'بے وفائی' کو ہی ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ ''وہ جو شبہ تھا کہ سرکار دھرم لینا چاہتی ہے، ان بے وقوفوں کے دل میں اور بھی پکا ہوا'' (ص۳۶)۔ شیو پرساد نے انگریزوں کی عورتوں اور بچوں پر باغیوں کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہم کو ان کا بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے'' (ص۳۷)۔

لیکن ہندوستانیوں پر خصوصاً لکھنؤ اور دلّی کے مسلمانوں پر، انگریزوں نے جو بے شمار زیادتیاں کیں، ان کا شیو پرساد ذکر تک نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ان پر ظلم و ستم کے تمام حقائق کو جانتے ہوئے بھی وہ دلّی والوں کی تباہی پر دل میں خوشی محسوس کرتے ہیں کہ اچھا ہوا، سالوں کی عقل ٹھکانے آجائے گی! ''یہ معرکہ نادر شاہی سے بھی بڑھ کر ہوا، دلّی والوں

کو قیامت تک نہیں بھولے گا'' (ص ۴۰)۔ شیو پرساد کی تحقیق کا بدترین پہلو، جو انیسویں صدی کے متعدد ہندو علما میں یکساں صورت میں ملتا ہے، ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو صرف یا خاص طور پر مسلمانوں کے کرتوت اور بے جا جرأت کا نتیجہ ماننا ہے جس کے اثر میں کچھ بے وقوف ہندو بھی آ گئے تھے: ''تمام مسلمانوں کے دل میں دلّی کی بادشاہت قائم ہونے کی امید کا انکُر جما، پھر صوبیدار، بخشی، نواب، ہزاری، ہر طرح کے 'دَولہ' اور ہر طرح کے 'جنگ' ہونے کا اور مفت میں جاگیر اور معاوضے کھانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ کتنے ہی گوبر گنیش ہندو بھی، جنھوں نے انگریزی عمل داری سے اپنا نقصان سمجھا تھا، ان کی باتوں میں آ گئے۔'' (ص ۳۸)

انگریزی حکومت میں لگان کی نئی پالیسی کے تحت پرانے زمیندار طبقوں کا تباہ و برباد ہو جانا، تعلقہ داروں کے حقوق ختم کرنے، ہندوستانی ریاستوں اور صوبوں کو ہڑپنے کے بارے میں اور اس سے اخذ کردہ نتائج سے شیو پرساد اُتنے ہی بے حس نظر آتے ہیں جتنے خود انگریز، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ انگریزوں سے بھی زیادہ بے حس نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ میں سرکاری فوج کی بے تحاشا لوٹ مار سے انھیں ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ کمپنی حکومت کے قیام سے لے کر ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کی سو برس کی حکومت میں ہندوستان کے روایتی طبقوں کی تباہی، کاریگری، ہنر اور صنعتوں کی بربادی اور ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی غربت اور بے روزگاری، جن کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے سیّد نے بغاوت کے اہم اسباب میں شمار کیا تھا، شیو پرساد ان کا نوٹس تک نہیں لیتے۔ اس کے برعکس وہ کمپنی حکومت کے سو برسوں میں ہندوستان میں صرف ترقی اور خوش حالی کی تصویر دیکھتے ہیں جب کہ سیّد اس حکومت کے تجزیے میں صاف طور پر تنقیدی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو شیو پرساد نہایت حقارت آمیز انداز سے اور سطحی طور سے دیکھتے ہیں جب کہ سیّد احمد اُسے اہم ترین تاریخی واقعہ قرار دیتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی تحقیق میں سیّد احمد اور شیو پرساد کا فرق ایک ایماندار، وفادار اور ایک عاقبت اندیش راج بھکت (حکومت کا وفادار) کے درمیان کا فرق ہے۔ ایک بے خوف مورخ اور ایک بے بصیرت حامی کا فرق ہے۔

تو یہ سوال اپنی جگہ اب بھی برقرار رہتا ہے کہ شمال مغربی صوبے کے ہندوؤں میں سیّد احمد جیسا کوئی فرد پیدا کیوں نہیں ہوا؟

اسی سے منسلک ایک اور سوال ہے۔ اردو ادب میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر صاف صاف لکھی ہوئی متعدد اہم تخلیقات اُسی دور میں مل جاتی ہیں جیسے غالبؔ کے خطوط اور ان کی فارسی تصنیف 'دستنبو' کے علاوہ ظہیر دہلوی کی 'داستانِ غدر'، سید احمد کی دو کتابیں (جن کا ذکر اس تحریر میں آچکا ہے)، ذکاء اللہ خاں کی 'تاریخِ ہند'، انگریزی میں لکھی گئی 'ڈائری آف میوٹنی' جس کا اردو ترجمہ نذیر احمد نے 'روزنامچۂ غدر' کے عنوان سے کیا، لکھنؤ کی تباہی پر کہی گئیں طویل نظمیں، واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر اور برقؔ لکھنوی کی بہت سی نظمیں، دلّی کی تباہی پر چالیس شاعروں کی دردانگیز نظموں کا انتخاب بعنوان 'فغانِ دہلی' (اشاعت ۱۸۶۱ء) اور اپنے والد کے 'دہلی اردو اخبار' میں بغاوت کے دوران ہی محمد حسین آزاد کی نظم 'پورب کی فوج کی جیت'۔ ان سب کے مقابلے میں راجا شیو پرساد کی 'اتہاس تمِر ناشک' کے ایک باب کو چھوڑ کر ہندی ادب میں کیا ایک بھی تخلیق ایسی ہے جو اُس دور میں براہِ راست ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر لکھی گئی ہو؟

جب مارکسی نقاد پرکاش چندر گپت کو '۱۸۵۷ء اور ہندی ساہتیہ' کے موضوع پر مضمون لکھنا پڑا تو انھیں یہ سچائی قبول کرنا پڑی کہ ہندی ادب میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا براہِ راست تذکرہ بہت کم ملتا ہے۔ (۱۸۵۷ء ربیلین، ص ۲۴۳)

غور کریں کہ یہاں کسی تخلیق کی بات نہیں کی جارہی ہے، محض تحقیقی کتابوں اور تذکروں کی بات کی جارہی ہے۔ پرکاش چندر گپت نے یہ نہیں بتایا کہ ان کتابوں میں ـــــ جو بہت کم ملتی ہیں ـــــ ۱۸۵۷ء کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟ وہ یہ بتانے میں شرما کیوں گئے؟ دیگر مارکسی نقاد ڈاکٹر رام ولاس شرما نے بھی لکھا ہے کہ بھارتیندو کے عہد کے ادب میں شاید ۱۸۵۷ء کی جنگ کا واضح اور قابلِ تعریف تذکرہ نہیں ہے۔ (بھارتیندو ہریش چندر اور ہندی نوجاگرن کی سمسیائیں، ص ۱۳)

آخر کیا سبب ہے کہ ہندی ادب میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران اور اس کے کچھ برسوں بعد بھی بغاوت کے بارے میں اچھی بری ایک بھی تالیف نہیں ملتی جب کہ اس دور میں اردو ادب میں بے شمار نہیں تو کتنی ہی تالیفات ضرور موجود ہیں۔ شاید اس سوال کے جواب کے لیے اس سے پہلے والے سوال پر بھی کوئی روشنی پڑ سکے کہ آخر ہندوؤں میں سیّد احمد جیسا کوئی فرد پیدا کیوں نہیں ہوا؟

کتابیات

۱- الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید (اردو سے انگریزی میں ترجمہ)، روپا اینڈ کمپنی، نئی دہلی۔

۲- حفیظ ملک: سرسیّد احمد خاں اینڈ مسلم ماڈرنائزیشن اِن انڈیا اینڈ پاکستان، کولمبیا یونیورسٹی پریس، نیویارک، ۱۹۸۰ء۔

۳- پی.سی. جوش (مرتبہ) ربیلین ۱۸۵۷ء، نیشنل بک ٹرسٹ، دلّی، ۲۰۰۷ء میں شامل تامیز خالدون، کے ایم اشرف، پرکاش چندر گپت، احتشام حسین کے مضامین۔

۴- آر سی مجمدار: سپاہی میوٹنی، کلکتہ، ۱۹۶۳ء۔

۵- رجنی پام دت: آج کا بھارت، ترجمہ: آنند سروپ ورما، میک ملن، دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۶- نِکولس بی ڈرک: دی اتھنو گرافک اسٹیٹ، مرتبہ سوربھ دوبے: 'پوسٹ کولونیل پیجز' میں شامل مضمون، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۴ء۔

۷- فرانسس رابنسن: دی مسلمز آف اَپر انڈیا اینڈ دی شاک آف دی میوٹنی، مرتبہ: مشیرالحسن اور نارائنی گپتا: 'انڈیاز کولونیل انکاؤنٹر' میں شامل مضمون، منوہر، نئی دہلی، ۱۹۹۳۔

۸- شری رام شرما اور شری رام نواس شرما (مرتبہ): غالب کے پتر، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۵۸ء۔

۹- راجا شیو پرساد ستارۂ ہند: ۱۸۵۷ء کا بلوہ، مرتبہ ویر بھارت تلوار، پرتی بِدھی سنکلن میں شامل، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۰۔

۱۰- ارشد علی اعظمی: علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی (۶۷-۱۸۶۴ء) انڈین ہسٹری کانگریس، ۱۹۶۹ء۔

۱۱- سی.ایف. انڈریوز: ذکاء اللہ آف دہلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء۔

۱۲- سیّد احمد خاں: دی کاز آف دی انڈین ریوولٹ (اردو سے انگریزی میں ترجمہ) میڈیکل ہال پریس، بنارس، ۱۸۷۳ء۔

۱۳- رام ولاس شرما: بھارتیندو ہریش چندر اور ہندی نوجاگرن کی سمسیائیں، راج کمل، نئی دہلی۔

(غیر مطبوعہ)

مسلم ضیائی

اسباب سرکشیِ ہند (سرسیّد)

ایک نادر مخطوطہ

ترقی اردو بورڈ (پاکستان) کے سہ ماہی مجلّے 'اردو نامہ'
کراچی، شمارہ ۶، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۱ء کے فائل سے

مسلم ضیائی کا یہ مضمون سرسیّد احمد خاں کے مشہور رسالے 'اسباب بغاوت ہند' کے اس نادر مخطوطے کی بنیاد پر قلم بند کیا گیا ہے جس کا ابتدائی عنوان 'اسبابِ سرکشیِ ہند' رکھا گیا تھا اور جو اپنے مندرجہ جات کے اعتبار سے اس نسخے سے قدرے مختلف ہے جو بعد میں 'اسباب بغاوتِ ہند' کے عنوان سے چھپ کر سامنے آیا۔ اس اعتبار سے یہ مضمون خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ (ادارہ)

سیّد احمد خاں، جوادالدولہ عارف جنگ، سرسیّد نے ۱۸۱۷ء میں آنکھیں کھولیں تو اکبر اور شاہجہاں کی تعمیر کی ہوئی عظیم الشان تیموری سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ سلطنت پارہ پارہ ہوگئی تھی، صوبیدار بادشاہ بن بیٹھے تھے، شہنشاہ کی حکومت 'از دلی تا پالم' بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے قبضے میں صرف لال قلعہ تھا لیکن اس میں بھی صرف قیام تھا، اقتدار باقی نہیں رہا تھا۔ کمپنی بہادر سیّد برادران کی جانشین بن کر بادشاہ گری کر رہی تھی اور اس کا رزیڈنٹ، صاحب علی شاہ، شاہزادوں، مرشد زادوں اور بیگمات سے سازشیں کر رہا تھا۔ چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا اور بقول غالبؔ:

''ہر اک ناچیز نوابی کرنے میں مصروف تھا۔''

مذہبی اور ایک حد تک تمدنی اعتبار سے بھی ہندو اور مسلمان دو قومیں تھیں۔ عوام اقتدار پرست تھے اور بزرگوں کی نیکیوں کے باعث، محبت اکبر کے جانشین سے لیکن پرستش صاحب بہادروں کی کرتے تھے۔

وطنیت اور قومیت کا موجودہ مغربی تصور نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر بھی مغربی نظریۂ وطنیت اور مغربی تصور قومیت فرانسیسیوں، انگریزوں اور ان ہندوستانی سیاحوں کے ذریعے برصغیر میں درآمد ہو چکا تھا، چناں چہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ٹیپو سلطان نے اپنے سفیروں کے یورپ میں مشاہدات اور فرانسیسی ملازموں سے حاصل کی ہوئی اطلاعات کی بنا پر 'زمرہ' کی شکل میں پارلیمانی نظام کا ایک ناقص خاکہ میسور میں بنا رکھا تھا جسے برصغیر میں پارلیمانی نظام کی ابتدا سمجھنا چاہیے۔

مغربی تصورات اور نظریات کی اس درآمد کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا چناں چہ اسباب سرکشیِ ہند کے سلسلے میں سیّد احمد خاں نے ایک سبب ہندوستان میں پارلیمانی طرزِ حکومت کی غیر موجودگی اور حکومت میں عوام کی عدمِ نمائندگی کو بھی بتایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ نظر اور اہلِ شعور وطنیت، قومیت اور مغربی طرزِ حکومت سے ناواقف نہ رہے تھے۔ عوام البتہ اب بھی ان تصورات سے بیگانہ تھے۔ ان کے ذہنوں میں ابھی تک روایتی نمک حلالی اور وفاداری کے تصورات کی حکومت تھی اور ہر ملازم کا فرض تھا کہ وہ ہر حال میں اپنے آقا کا ساتھ دے کر نمک حلال کہلائے۔

حکمراں چوں کہ 'سایۂ خدائے ذوالجلال' اور 'دیوتا سروپ' تھے اس لیے برصغیر کے ایک بڑے حصے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط اور لوٹ کھسوٹ کے باعث معاشی تباہی مسلط ہوگئی، عام باشندوں اور خصوصاً اہلِ حرفہ کے لیے عرصۂ روزگار تنگ ہوگیا۔ بدیسی حکمراں حقارت آمیز برتاؤ کرتے تھے۔ پھر بھی روایتی نمک حلالی صبر وضبط کی تلقین کرتی رہی۔ غالبؔ:

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

لیکن جب انگریز حکمرانوں کی حمایت سے پادریوں کی چیرہ دستی نے عوام کے دلوں میں یہ اندیشہ بھی پیدا کر دیا کہ ان کا آخری سہارا 'مذہب' بھی جو کم از کم دوسری دنیا میں ان کے لیے جنت اور حور وقصور کا ضامن تھا، چھین لیا جانے والا ہے تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوکر

چھنک پڑا اور انھوں نے 'انگریز نوابوں' کے خلاف علم سرکشی بلند کر دیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب ملک کے ہر طبقے نے بدیسی حکمرانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اس میں علما بھی تھے اور جہلا بھی، راجا بھی تھے نواب بھی، اہلِ حرفہ بھی تھے اور بے نوا فقیر بھی۔ لیکن ایک ایسا طبقہ بھی تھا جس نے ان بدیسی حکمرانوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آج کے قومی تصور کی بنا پر ان لوگوں کو غدار کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے تصورات اور خیالات کے مطابق ان لوگوں کو غدار کہتے وقت ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں نے محض اپنے آقاؤں سے نمک حلالی اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا جو اس وقت کے سماجی اور اخلاقی تصورات کے مطابق درست تھا۔

مگر ان وفاداروں اور نمک حلالوں میں بھی دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو اپنے روایتی تصورات کے مطابق انگریزوں کا ساتھ دے رہا تھا، دوسرا وہ جس نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے جاسوسی کتوں کے مانند برطانوی حکومت کی خدمات انجام دی تھیں۔ پہلے گروہ کو اپنے ملک اور اہلِ ملک سے ہمدردی تھی۔ دوسرے کے سامنے مال و دولت، عہدوں اور خطابوں کی آرزوئیں اور امیدیں تھیں۔ ایک کا نظریہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت سے لڑنے والوں میں وہ تنظیمی اور شعوری اتحاد اور قوت نہیں جس سے وہ ایک منظم، ہوش مند اور نئے مادی اور ذہنی ہتھیاروں سے مسلح حکمراں قوم کا مقابلہ کامیابی سے کر سکے۔ اس کے سامنے شکست اور اس کے نتائج تھے اور وہ ایمانداری سے انگریزوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ لیکن دوسرا گروہ صرف یہ چاہتا تھا کہ بدیسی آقاؤں کو، جو اس کے وطن کی دولت، قوم کی عزت اور مذہب کے دشمن تھے کسی طرح بھی کامیاب کرایا جائے، تاکہ اس کی نوازشات سے مستفید ہو سکے۔

اس طرح پہلا گروہ انگریزوں کا حامی اور مددگار ہونے کے باوجود اپنی سچائی، ایمانداری اور سیاسی شعور کی بنا پر قابلِ معافی تھا تو دوسرا نفرت اور لعنت کا مستحق۔

سیّد احمد خاں کا تعلق اول الذکر طبقے سے تھا۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد میں جو کتابیں تصنیف و تالیف کیں اور جس طرح انتہائی بے جگری، ایثار، جواں مردی اور ہمت سے کام لیتے ہوئے ڈوبتی ہوئی قوم کو تعلیم کے ذریعے ترانے کی کوششیں کیں، ان سے ان کے خلوص، ایمانداری اور حکومت سے زیادہ ملک اور قوم سے وفاداری کا ثبوت ملتا ہے۔ ان سے یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ انھیں اپنے مذہب سے محبت تھی، اہلِ وطن سے محبت تھی، اپنی

تاریخ سے محبت تھی، اپنی تہذیب سے محبت تھی اور ان کا دل انگریزوں کے مظالم اور ان کے ہاتھوں اپنے اہلِ وطن کی بے عزتی کو دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا۔

وہ ایک باشعور انسان تھے۔ انھوں نے انگریز حکمرانوں کے تصورات اور ان کی طرزِ حکومت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ ہندوستانی راجاؤں، نوابوں اور خود شہنشاہ دہلی کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل حقیقی معنی میں اورنگ زیب کا جانشین بن چکا ہے اور اس حقیقت کے مقابلے میں ۸۴ سالہ 'اعلا حضرت شہنشاہ ہند ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی' صرف سایہ ہیں اور سایہ جسم سے بغاوت کر کے کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔

انھوں نے صحیح اندازہ لگالیا تھا کہ یہ شورش چند روزہ ہے۔ چناں چہ 'سرکشیِ ہند' (مخطوطہ) کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ بہت دانش مند اور علم تاریخ سے واقف تھے اور شجاعت ذاتی اور حکمت جبلی گورنمنٹ سے واقفیت رکھتے تھے، انھوں نے اس فساد کو چند روز کا ہنگامہ تصور کر کے خیر خواہیِ سرکار میں اپنا قدم ویسی ایمانداری سے مستحکم رکھا جیسا کہ پہلے تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔''

چناں چہ ۱۸۵۷ء کی شورش کا آغاز ہوا تو انھی خیالات کے مطابق سید احمد خاں نے برطانوی حکومت کا ساتھ دیا اور پوری ایمانداری سے ہتھیلی پر سر رکھ کر حکومت کی مدد کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھیں ذاتی نقصانات بھی اٹھانے پڑے لیکن ان کی تلافی کے لیے انھوں نے انگریزوں کی پیش کی ہوئی ایک لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر کو لینا پسند نہ کیا جو ان کی عالی ظرفی اور بالغ نظری کا ثبوت ہے۔

ہماری جنگِ آزادی کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے بعض لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر رجب علی ارسطو جاہ جیسے مطلب پرست برطانوی جاسوسوں کے ساتھ سرسید کا نام بھی غداروں میں شامل کر لیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید احمد خاں کی زندگی، ان کی تصانیف اور اعمال و افعال کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس بات کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ وہ ایک مصلحت بیں اور وفادار باغی تھے، دانا دشمن تھے، 'انگریزداں' تھے اور یہ جانتے تھے کہ اپنی گرتی ہوئی اور مٹتی ہوئی قوم کو بچانے کے لیے کون سے طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں۔

'اسباب سرکشیِ ہند' (خطی نسخہ) اور اسکی دوسری شکل یعنی اسبابِ بغاوت ہند (مطبوعہ نسخہ) اس دعوے کا بیّن ثبوت ہیں کہ ان کا دل اپنے اربابِ وطن کی بے بسی اور بے عزتی پر خون کے آنسو روتا تھا اور وہ شورش فرو ہونے پر کس طرح مظلوموں کے لیے سینہ سپر ہوکر میدان میں کود پڑے تھے۔

۱۸۵۷ء کی شورش عظیم جسے آج ہم بجا طور پر پہلی جنگِ آزادی کے مقدس نام سے یاد کرتے ہیں، سیّد احمد خاں کی پیش قیاسی کے مطابق ختم ہوئی تو عوام اور خصوصاً مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ انگریز بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور پھر اپنے اعمالِ سیاہ کو چھپانے، مفتوح محکوموں کو مرعوب کرنے اور دنیا کے سامنے آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والوں کو بدنام کرنے کے لیے افسانے تراشنے اور تاریخ کے نام سے کتابوں کے اوراق میں محفوظ کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ چناں چہ جس طرح ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنت میسور کے خاتمے پر افسانہ طرازی کی گئی اور متعدد فرضی دستاویزیں اور کثرت سے تاریخیں شائع کی گئی تھیں، اسی طرح ۱۸۵۷ء سے متعلق چند برسوں کے اندر کثرت سے کتابیں تصنیف کی گئیں اور ٹیپو کے دور کی طرح اس دور کی تاریخ کو بھی اس قدر مسخ کرکے پیش کیا گیا جتنا کسی دوسرے دور کی تاریخ کو نہیں۔

دیسی باشندوں نے جو کتابیں دیسی نقطۂ نظر سے لکھی تھیں وہ یا تو انگریزوں کی پھیلائی ہوئی دہشت اور قید و بند کے خوف یا مرورِ زمانہ سے تلف ہوگئیں اور اس طرح صرف وہ کتابیں رہ گئیں جو انگریزوں نے یا انگریزوں کے پٹھوؤں نے انھی کے ایما سے انگریزوں کی حمایت میں لکھی تھیں۔ ان میں بھی ابنائے وطن کے چہروں پر انگریزوں کے دیے ہوئے برش سے انگریزوں کے مانند، سیاہی پھیری گئی ہے۔

جس وقت برصغیر میں کوئی قلم ثابت قدم نہ رہا تھا اور ایک آواز بھی انگریزوں اور کیرانیوں (اینگلو انڈینوں) کے اقوال، افعال اور تحریروں کے خلاف بلند نہ ہوتی تھی، جب انسانوں کو زندہ جلایا جارہا تھا، درختوں کی ہر شاخ پر انسانی لاشیں لٹکتی نظر آتی تھیں، انسانوں ہی نہیں عمارتوں تک سے انتقام لیا جارہا تھا، سیّد احمد خاں نے اپنا قلم اٹھایا اور ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدیداروں کے خلاف ایک فردِ جرم تھی۔ حکومت کے خلاف تلوار اٹھا کر ناکام ہونے والوں کی طرف سے وکالت تھی اور اس میں سرکشی کے اسباب اس

طرح بیان کیے گئے تھے جن سے حکمراں قوم اور اس کے کارندے مجرم قرار پاتے تھے لیکن فاتح انگریزوں کی وحشیانہ خون ریزی اور درندگی دیکھتے ہوئے مذبذب تھے کہ اسے چھپوا کر شائع کیا جائے یا نہیں۔ لیکن وکٹوریہ کے اعلان (یکم نومبر ۱۸۵۸ء) سے کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور انھیں یقین ہوگیا کہ ان کی آواز سنی جائے گی، اس تحریر کو وفاداری پر محمول کیا جائے گا اور ابنائے وطن خصوصاً مسلمانوں کی تباہی رک جائے گی تو انھوں نے اس رسالے میں کاٹ چھانٹ کی، اضافے کیے، مطبع، مفصلائٹ گزٹ، آگرہ میں پانچ سو جلدیں چھپوائیں اور 'اسبابِ بغاوتِ ہند' نام رکھ کر سوا دو ایک نسخوں کے، باقی تمام نسخے انگلستان روانہ کردیے تاکہ پارلیمنٹ میں ان کے پیش کردہ اسباب اور مشوروں پر غور کیا جائے۔ چناں چہ مطبوعہ نسخے کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''سرکشیِ ہندوستان کے جواب مضمون میں جو میں نے اصلی اسباب بغاوت ہندوستان کے بیان کیے تھے، اگرچہ دل چاہتا تھا کہ اب ان کو صفحۂ روزگار سے مٹا دوں بلکہ اپنے دل سے بھی بھلا دوں کیوں کہ جو اشتہار جناب ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ دامہ سلطنتہا نے جاری کیا ہے درحقیقت وہ بغاوت کے ہر ایک اصلی سبب کا پورا علاج ہے ... پھر بھی جو سبب میرے دل میں ہیں ان کو بھی ظاہر کردوں۔ سچ ہے بڑے بڑے دانا اور تجربہ کار لوگوں نے اس بغاوت کے سبب لکھے ہیں مگر امید ہے کہ شاید کسی ہندوستانی آدمی نے اس میں کوئی بات نہ لکھی ہو۔ بہتر ہے کہ ایک ایسے شخص کی بھی ایک رائے رہے۔''

حالی کا بیان ہے کہ سیّد احمد خاں نے یہ رسالہ بجنور سے مرادآباد جانے پر وہیں لکھا تھا جس میں رعایائے ہند کو بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے اور وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے ہیں نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔
(حیات جاوید، لاہور، صفحہ ۱۴۶)

انھی کا بیان ہے کہ سیّد احمد خاں ابھی اپنی کتاب 'اسباب بغاوتِ ہند' ختم نہ کرنے پائے تھے کہ ملکہ کا اشتہار معافی اور امن وامان مشتہر ہوا۔ (حیاتِ جاوید، لاہور، صفحہ ۱۴۹)

بہرحال اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرکے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

پارلیمنٹ میں مباحثے ہوئے اور آخرکار اسے سیّد احمد خاں کی وفاداری پر محمول کر کے اُس کے مندرجات اور مشوروں سے فائدہ اٹھایا گیا۔

خوش قسمتی سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے متعلق زیرِ ترتیب و تالیف کتاب کے سلسلے میں سے اس کتاب کا ایک ایسا خطی نسخہ دستیاب ہوگیا جو اپنی خصوصیات ذیل کے لحاظ سے عدیم النظیر ہے:

۱- یہ رسالہ خود سیّد احمد خاں کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس کے شروع اور آخر میں مصنف کی مستطیل مہر (یا سیّد احمد ۱۲۷۳) ثبت ہے۔

۲- اس میں کئی مقامات پر کاٹ چھانٹ کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسودہ ہے۔

۳- ترتیب، مواد اور عبارت کے اعتبار سے اس میں اور 'اسبابِ بغاوتِ ہند' کے مطبوعہ نسخے میں کافی اختلافات ہیں۔

۴- اس میں اعلان وکٹوریہ والی تمہید موجود نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اعلان سے پہلے لکھا جاچکا تھا اور یہ وہی نسخہ ہے جس کا مولانا حالی نے 'حیاتِ جاوید' میں ذکر کیا ہے۔

۵- اس رسالے کی لوح پر کوئی نام درج نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا تھا۔

۶- اسبابِ بغاوتِ ہند (مطبوعہ) میں عنوانات دیے گئے ہیں لیکن اس نسخے میں عنوانات بھی موجود نہیں۔

۷- اس کے آخر میں پادری ایڈمنڈ کی چٹھی کا ترجمہ اور نقل اشتہار (فارسی) گورنمنٹ بنگال بھی جو اسبابِ بغاوتِ ہند کے ساتھ بطورِ ضمیمہ شامل کیے گئے تھے، موجود نہیں۔

۸- اس نسخے میں انگریز عہدیداروں، کرانیوں اور پادریوں پر کافی سخت الفاظ میں الزامات عائد کیے گئے ہیں۔

۹- برصغیر کی تاریخ میں پہلی بار سرکشی کا باعث معاشی اسباب کو بتایا گیا ہے۔

''کیا سبب ہوا رعایائے ہندوستان کی سرکشی کا''

اس عنوان سے اس خطی نسخے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لیے اسے اسباب بغاوتِ ہند (مطبوعہ)

سے ممتاز کرنے کے لیے ان اوراق میں اسے 'اسباب سرکشیِ ہند' کے نام سے ہی یاد کیا گیا ہے۔ اور چوں کہ اس میں عنوانات نہیں قائم کیے گئے تھے اس لیے اسباب بغاوت ہند کے عنوانات سے تقابل کے لیے میں نے اپنی طرف سے عنوانات قائم کر دیے ہیں۔ ان عنوانات اور ترتیب و تنظیم کے اختلافات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اسباب سرکشی ہند

۱- سرکشی کے معنی
۲- گورنمنٹ کے حقوق
۳- سرکشی عام تھی
۴- سرکشی کا اصلی سبب کیا ہوتا ہے؟
۵- حکومت کا جبر و تعدی، رعایا کے حال سے عدمِ واقفیت اور مثالیں
۶- رعایا کو عرضِ حال کا موقع نہ دینا
۷- ابن صاحب کی مثال
۸- حکومت رعایا کے حالات و خیالات سے ناواقف رہی
۹- دیسی حکام انگریزی حکام متعہد سے زیادہ منصف ہیں
۱۰- پہلے انگریزی حکومت پر اعتماد تھا لیکن اب نہیں رہا
۱۱- بادشاہ دہلی سے ایمبر سٹ کا یہ کہنا کہ ہماری گورنمنٹ تیموریہ خاندان کی تابع نہیں۔
۱۲- یہ بغاوت چار اصولوں پر مبنی تھی

اصل اول

۱- حکومت کا اپنے فرائض نہ بجالانا
۲- رعایا سے محبت اور اتحاد نہ کرنا
(الف) تسلونیقیون خط ۱، باب ۳، درس ۱۴
(ب) متی باب ۷، درس ۱۴
۳- گورنمنٹ کا رعایا سے برتاؤ محبت پر مبنی نہ تھا
۴- حاکم رعایا سے الگ تھلگ رہتے تھے
۵- حاکموں کی یورپینوں سے محبت ـــــ پطرس خط ۲، باب ۱، درس ۷

۶- مسلمانوں کا اصول حکمرانی
۷- عالمگیر کی غلطی اور اس کا نتیجہ
۸- رعایا کی بے عزتی کے نتائج
۹- تالیف قلوب کے نتائج
۱۰- عام ہندوستانی رعایا سے بدسلوکی اور عوام کی بے عزتی
۱۱- سابق حکام کا برتاؤ سیتھن، فریزر اور اکٹرلونی کی مثالیں۔ پطرس خط۲، باب ۱، درس ۷
۱۲- انگریز حکمرانوں کی بدمزاجی
۱۳- اس بدمزاجی کے اثرات خصوصاً مسلمانوں پر
(الف) بعض اچھے حکام اور ان سے محبت
(ب) متی باب ۵، درس ۳
(ج) متی باب ۵، درس ۵
۱۴- شاہی دربار اور انعامات
۱۵- شاہی دربار ہوں اور انعامات دیے جائیں
۱۶- قدیم ہندوستانی طرزِ حکومت کی مثال
۱۷- مغل بادشاہ کا احترام ہندوستانیوں کی نظر میں تھا
۱۸- ایمبرسٹ اور الن برا کا رویہ، گورنر جنرل کو چاہیے کہ بادشاہانہ دربار کرے
۱۹- انعام واکرام سے نوازا جائے
۲۰- قدیم حکومتوں کا رعایا سے سلوک
۲۱- انگریزی حکومت نے یہ طریقے بند کر دیے
رعایا انگریزی حکومت کو ٹھیکیدار تصور کرتی تھی
۲۲- بارسٹن، ڈربی اور ایلن برا کے بارے میں رعایا کے خیالات
۲۳- کمپنی کی حکومت سے نجات کی خواہش
۲۴- انعام واکرام کے رعایا پر اثرات
۲۵- عدم تعلیم طرفداریِ سرکار
۲۶- رعایا اور اقتدار پرستی، حاکموں کے بارے میں تصورات
۲۷- عدم اشاعت قوانین نافذہ اور سخت سزائیں
زبور، ۱۴۳، درس ۲
زبور، ۵۱، درس ۱-۲

اصل دوم

ناواقف رہنا رعایا کے حالات سے اور مصائب سے

۱- رعایا اور مسلمان حکمراں

۲- انگریزی حکومت اور باشندوں کی بے تعلقی

۳- عہدیداروں کی بداخلاقی

۴- رعایا کا کوئی غم خوار نہ تھا

۵- انگلستان کے عوام اور وکلا کی مثال

۶- ہندوستانی عہدیداروں کو مامور کرنا چاہیے تھا

۷- ہندوستان میں افلاس پھیل گیا

۸- حقیقی آسودگی ملکی آزادی کا دوسرا نام ہے

۹- تنگیِ معاش کے اسباب

۱۰- مسلمانوں کی خستہ حالی

۱۱- فوجی ملازمت کی حالت

۱۲- بحی ملازمتوں کا حال

۱۳- برطانوی حکومت سے پہلے روزینے اور انعام

۱۴- شاہ جہاں کی فیاضی کا برطانوی ضبطیوں سے مقابلہ

۱۵- انگریزی تجارت ہندوستان کے لیے نقصان دہ تھی

۱۶- اہلِ حرفت کی زبوں حالی

۱۷- جلاہوں کی تباہی

۱۸- کاشت کاروں کی بپتا

۱۹- نہروں سے کاشتکاروں کو فائدہ نہیں پہنچا

۲۰- کمپنی کے نوٹ

۲۱- ہندوستانی اہل دفتر کی تعداد میں اضافہ ضروری تھا

۲۲- تھانہ داروں کی برخاستگی

۲۳- آرتھر رابرٹس سے گفتگو کا حوالہ کہ ہندوستانی ملازموں کی تعداد بڑھائی جائے

۲۴- حکومت میں ہندوستانیوں کا حصہ نہ تھا

اصل سوم

ہندوستانیوں کی عادات کے نامناسب اور مضرت رساں آئین وضوابط کا اجرا

۱- نوعیہ گورنمنٹ نے شخصیہ گورنمنٹ کی صورت پیدا کرلی ہے

۲- حکومت میں رعایا کی نمائندگی نہیں

۳- انگلستان میں عوام کی نمائندگی

۴- ہندوستانی امرا نالائق ہیں لیکن حکومت میں عوام کی نمائندگی ضروری ہے

۵- حکومت کو چاہیے تھا کہ ہندوستانی افسر مقرر کرتی

۶- ہندوستانیوں میں سرکاری عہدوں کے لائق آدمی موجود ہیں

۷- چند قوانین سے فائدہ نہ پہنچنے کا حوالہ

۸- خرابیوں کا اصل سبب عوام کی عدم نمائندگی تھی

۹- ہندوستانیوں کو بڑے عہدے نہیں دیے جاتے تھے

۱۰- کرانی عہدیداروں کی بیہودگیاں

۱۱- ضبطیِ اراضیات

۱۲- مال گزاری بندوبست قابلِ اعتراض ہے شیر شاہ اور اکبری دور کے حوالے

۱۳- مغل اور برطانوی بندوبست کا مقابلہ

۱۴- کاشتکاروں پر نئے بندوبست کے اثرات

۱۵- عدالت دیوانی کی بدانتظامی اور مسلمانوں پر اس کے مضر اثرات

۱۶- اسٹامپ کے کثیر اخراجات

۱۷- محصول انصاف قابلِ الزام ہے

۱۸- فوجداری عدالتوں میں عورتوں کا فعل مختاری

اصل چہارم

رعایا کی غلط فہمی

۱- حکومت کا فرض رعایا کی بھلائی ہے

۲- ہندو بیواؤں کی دوسری شادی اور اس سے اولاد کا ورثہ پانا

۳- گورنمنٹ پر شبہات کے اسباب

۴- عوام کے خیالات انگریزوں کے بارے میں، ''انگریزوں کی مثال ٹھنڈی آنچ کی ہے''

۵- گورنمنٹ عیسائی بنانا چاہتی ہے
۶- ریاستوں کی تباہی کا اثر
۷- بیگم ثمرو کی مثال
۸- پنجاب کی فتح کا اثر
۹- صوبۂ اودھ پر قبضہ اور تنگیِ معاش
۱۰- ریاستوں کے معاملات میں مداخلت بیجا
۱۱- مذہبی معاملات میں مداخلت بڑھ گئی
۱۲- پادریوں کی چیرہ دستیاں اور ان پر تنقید
۱۳- مسلمان اور اہلِ کتاب
۱۴- حکام کے نام دینِ مسیحی کو قبول کرنے کے لیے چٹھیاں اور ان کے اثرات
۱۵- انگریزی مدرسوں کے اثرات، عربی تعلیم کی موقوفی
۱۶- مشنری اسکول
۱۷- دیہاتی مکتب، مذہب کے معاملے میں حکومت پر شبہ
۱۸- فوج پر ان شبہات کا اثر

ذکر وقوع سرکشی کا

۱- نئے کارتوس اور فوج
۲- پہلے سے کوئی سازش نہ تھی
۳- ایران سے سازش اور بادشاہ کی حالت
۴- چپاتیوں کے بٹنے کا سبب
۵- حاصل کلام۔ ''اس فساد کو صرف فساد کارتوس ہی خیال نہ کرنا چاہیے بلکہ بہت سی باتوں اور رعایا کی ناراضیوں اور غلط فہمیوں کا ایک مجموعہ خیال کرنا چاہیے۔''

۱۲۷۳
یا سیّد احمد

ظفر احمد صدیقی

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا کردار

مولانا فضلِ حق خیرآبادی (مولود ۱۷۹۷ء، متوفی ۱۸۶۱ء) ہندوستان کے مایۂ ناز علما میں سے تھے۔ معقولات اور علومِ عربیت میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں جن اکابر علما نے انگریزوں کی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، ان کی اذیتوں کا شکار ہوئے، حبس دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا پائی اور بالآخر وہیں جان جاں آفریں کے سپرد کی، ان میں مولانا خیرآبادی کا نام سرفہرست ہے۔

انھیں یہ سزا کیوں دی گئی؟ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ان کا کیا کردار تھا؟ اس ضمن میں سب سے قدیم تحریر جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے وہ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی (ف ۱۹۶۹ء) کی ہے۔ وہ اپنے ایک رسالے موسوم بہ 'مولانا فضلِ حق وعبدالحق خیرآبادی' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا حکیمانہ دماغ کے فرد تھے۔ ان کے سامنے اسلامی اقتدار ختم ہورہا تھا۔ آنکھوں دیکھتے دیکھتے یکے بادیگرے شعائرِ اسلامی مٹ رہے تھے۔ محکمۂ قضاۃ توڑا گیا۔ محرمات کی روز بروز گرم بازاری ہونے لگی۔ تمام ریاستوں میں دورہ کیا مگر دوالیہ تھے۔ علما کے جرگے

پر ہاتھ ڈالا تو نبضوں میں گرمی تھی۔ فتویٰ دیا۔ علما کے دستخط ہوئے۔ عوام میں مشتہر کیا گیا۔ مگر عصبیت ختم ہوچکی تھی۔ شعلہ کی آخری بھڑک تھی کہ بھڑکی، پھر سرد ہوگئی۔ علما پکڑے گئے۔ مفتی صدرالدین خاں، نواب مصطفیٰ خاں وغیرہ صدہا کو اربابِ حکومت نے دھرلیا۔ نواب صاحب کی معافی ہوئی۔ مفتی صاحب نے بالجبر اور بالخیر کے قضیے میں جان بچائی۔ مگر علامہ فضل حق مردانہ وار انتظارِ دار میں رہے۔

مولانا پر مقدمہ لکھنؤ میں بغاوت کے سلسلے میں چلایا گیا۔ جس مخبر نے آن کر فتوے کی خبر دی تھی، اس نے ان کو جو دیکھا، چہرے پر تقدس کے آثار، ملک صورت۔ مخبر کی آنکھیں کھل گئیں۔ بیان کے وقت مخبر نے عدالت سے کہا، 'حضور! یہ وہ فضل حق نہیں ہیں، یہ کوئی دوسرے ہیں۔' مولانا پاس کھڑے تھے، مسکرائے اور عدالت سے کہا، 'جناب! پہلے جو کچھ اس نے کہا وہ بالکل سچ ہے۔ اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور میں آج بھی وہی کہوں گا جو اس میں میں نے لکھا ہے۔' فتویٰ میرا ہے۔' چناں چہ مقدمہ ان کے خلاف فیصل ہوا۔ ہشاش بشاش جیل گئے۔ پھانسی کے بجائے انڈمان بھیج دیا گیا۔ ۱۲ر صفرالمظفر ۱۲۷۸ھ کو انتقال کیا اور جزیرۂ انڈمان ہی میں سپردِ خاک ہوئے۔'' (ص ۱۰، ۱۱)

اس بیان کا حاصل یہ ہے کہ مولانا خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ ماخوذ ہوئے، لکھنؤ میں مقدمہ چلا، بری ہوسکتے تھے، لیکن انھوں نے مردانہ وار اعترافِ جرم کیا اور ہشاش بشاش جیل چلے گئے۔ مفتی صاحب کا محولہ بالا رسالہ نظامی پریس، بدایوں سے شائع ہوا ہے، لیکن اس پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے البتہ بعض داخلی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت ۱۹۳۷ء کے بعد کسی وقت عمل میں آئی ہے۔

اس کے بعد اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے والے دوسرے مصنف عبدالشاہد خاں شروانی (ف ۱۹۸۴ء) ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں مولانا خیرآبادی کی عربی تصنیف 'الثورۃ الہندیۃ'

کا اردو ترجمہ 'باغی ہندوستان' کے نام سے شائع کیا تو اس کے ساتھ مولانا موصوف کی سوانح حیات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس میں مذکورہ مقدمۂ بغاوت کے سلسلے میں شروانی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی تلخیص جناب مالک رام (ف ۱۹۹۳ء) نے اس طرح کی ہے:

''۱- مولانا فضل حق مرحوم پر یہ مقدمہ 'سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرمِ بغاوت' کی بنا پر قائم ہوا تھا۔
۲- جس جج کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تھا وہ ان کا شاگرد تھا؛ اس لیے اسے ان سے ہمدردی تھی اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہ بری ہو جائیں۔
۳- جیوری میں ایک اسیسر بھی مولانا کو بری کر دینے کے حق میں تھا۔
۴- مولانا فضل حق نے خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل مثلِ تارِ عنکبوت عقلی و قانونی ادِلّہ سے توڑ دیے تھے اور امید تھی کہ وہ بری کر دیے جائیں گے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتوے کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہوا ہے وہ صحیح ہے؛ میرا لکھا ہوا ہے؛ اور آج اس وقت بھی، میری وہی رائے ہے۔
۵- اس اقرار و اقبال کے بعد عدالت نے 'بے حد رنج کے ساتھ' حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کا حکم سنایا۔
۶- یہ فیصلہ آپ نے کمالِ مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔''

لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مفتی انتظام اللہ شہابی اور عبدالشاہد خاں شروانی دونوں کا موقف بنیادی طور پر ایک ہی ہے کہ مولانا خیرآبادی کو فتوائے جہاد کا مجرم قرار دے کر کالے پانی بھیجا گیا تھا اور یہ کہ انھوں نے اعترافِ جرم کر کے بہ رضا و رغبت بلکہ بہ کمالِ مسرت یہ سزا قبول کی تھی۔

اس کے بعد اگست ۱۸۵۷ء میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مضمون ''مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد'' ماہنامہ 'تحریک' دہلی میں شائع ہوا۔ عرشی صاحب کے اس مضمون کی بنیاد مولانا خیرآبادی کے ایک فارسی مکتوب بنام نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور پر رکھی گئی ہے۔ اس خط میں بہ قولِ مالک رام مولانا خیرآبادی کا یہ دعویٰ تھا کہ:

''۱- میں کبھی خان بہادر خاں کی (جسے وہ باغی سمجھتے تھے) ملازمت میں نہیں رہا؛
۲- میں کسی زمانے میں پیلی بھیت کا ناظم یا محمدی کا چکلہ دار نہیں تھا؛
۳- میں نے کبھی کسی باغی لشکر کی کمان نہیں کی۔
۴- یہ سب کوائف ایک شخص سیّد فضل حق شاہجہانپوری سے متعلق ہیں، اور مجھے ان صاحب کے دھوکے میں ماخوذ کرلیا گیا ہے۔
لہٰذا وہ نواب فردوس مکان سے درخواست کرتے ہیں کہ رئیس مالاگڑھ اسماعیل خاں کو (جو دونوں کو خوب جانتے ہیں) ہدایت کی جائے کہ موصوف یہ تمام کوائف اور سیّد فضل حق شاہجہانپوری اور فضل حق خیرآبادی۔ دونوں کے تفاوت اور جدا جدا شخصیت ہونے کا ثبوت، اپنے سفارشی خط کے ساتھ لکھ کر اسپیشل کمشنر لکھنؤ کے پاس بھیج دیں تاکہ انھیں اس مقدمے سے رہائی مل سکے۔''

عرشی صاحب کا محولہ بالا مضمون پڑھ کر جناب مالک رام کے دل میں اس مقدمۂ بغاوت سے متعلق مزید تحقیق و تفتیش کا داعیہ پیدا ہوا۔ جوینده یابنده۔ بالآخر انھوں نے 'قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی' سے ۱۸۵۹ء کے اس مقدمے کی فائل ڈھونڈھ نکالی اور اسکی مکمل روداد ایک مضمون کی شکل میں ماہنامہ 'تحریک' دہلی کے شمارہ جون ۱۹۶۰ء میں شائع کردی۔ اس مقدمے کی مِسل کے بہ غور مطالعے کے بعد مالک رام صاحب نے لکھا کہ عبدالشاہد خاں نے مقدمے کی نوعیت اور دیگر کوائف کے بارے میں اپنی کتاب 'باغی ہندوستان' میں جو دعاوی کیے ہیں، 'افسوس کہ واقعات سے یہ تمام دعاوی ٹھیک ثابت نہیں ہوتے۔' اس کے ساتھ ہی انھوں نے مضمون کے آخر میں بہ طورِ نتیجہ یہ بھی لکھا کہ:

''غرض پورے حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انھوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو (اور اس کی طرف انھوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے) لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے۔ نہ علمی

پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے؛ انھوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا، نہ تلوار ہی اٹھائی۔''

راقم عرض کرتا ہے کہ مالک رام نے مفتی انتظام اللہ شہابی اور عبدالشاہد خاں کے دعووں کو مقدمے کی مِسل اور دوسری تاریخوں، شہادتوں کے حوالے سے اس طرح رد کردیا ہے کہ ان پر مزید بحث و تمحیص کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور یہ بات بہ ہر حال ثابت ہوجاتی ہے کہ:

(۱) بنائے مقدمہ مولانا خیرآبادی کا کوئی فتویٰ نہ تھا۔

(۲) جن ججوں کی عدالتوں میں مولانا کا مقدمہ پیش ہوا، ان کے نام معلوم ہوچکے ہیں، ان میں سے کسی کے کسی زمانے میں مولانا کے شاگرد رہنے کا ثبوت موجود نہیں ہے۔

(۳) مولانا پر جس عدالت میں مقدمہ چلایا گیا، وہ فوجی قسم کی تھی، ایسی عدالتوں میں جیوری نہیں ہوتی، لہٰذا یہ خیال بھی غلط ہے کہ عدالت کا کوئی رکن مولانا کو بری کردینا چاہتا تھا۔

(۴) انھوں نے اپنے خلاف مقدمے کا فیصلہ کمالِ مسرت اور خندہ پیشانی کے ساتھ ہرگز نہیں سنا، بلکہ دورانِ مقدمہ اور اس کے بعد بھی برابر اپنی برأت کی کوشش اور متواتر رحم کی درخواست کرتے رہے اور اس ضمن میں امکانی حد تک انھوں نے کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔

لیکن مالک رام کا یہ کہنا کہ مولانا خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا اور جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے، تاریخی و تحقیقی لحاظ سے درست نہیں۔

اس باب میں دراصل مقدمے کی مِسل کے ساتھ ساتھ مولانا خیرآبادی کی تصنیف 'ثورۃ الہند' کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے کیوں کہ یہ خود صاحبِ معاملہ کی مستند تحریر ہے اور اس پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس کتاب اور رودادِ مقدمہ کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک حساس اور غیور شہری نیز باحمیت عالمِ دین کی حیثیت سے مولانا خیرآبادی انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان سے موالات اور دوستی کا رشتہ مولانا کے نزدیک کفر وارتداد کے ہم معنی تھا۔

یہ دونوں بنیادی مآخذ ترتیبِ واقعات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چناں چہ ان سے مستفاد ہوتا ہے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں جب ہنگاموں کا آغاز ہوا، اس وقت مولانا الور میں تھے، لیکن ان کے اہل وعیال دہلی میں تھے۔ انھی ہنگاموں کے دوران انھیں غالباً عمالِ شاہی کی جانب سے دہلی بلایا گیا۔ اس دعوت اور دہلی میں اہل وعیال کی موجودگی کی وجہ سے وہ دہلی آ گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ابھی دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ تسلط نہیں ہوا تھا، لیکن شہر میں لاقانونیت کا دور دورہ اور افراتفری کا ماحول تھا۔ مولانا دل سے یہ چاہتے تھے کہ بغاوت کامیاب ہو اور انگریز ملک سے دفع ہو جائیں۔ مولانا نے تلوار تو نہیں اٹھائی، لیکن تحریک کے سربراہوں اور ذمہ داروں کو برابر مناسب اور مفید مشورے دیتے رہے۔ مولانا کا بیان ہے کہ ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا گیا۔ بالآخر مختلف اسباب وعوامل کی بنا پر، جن کا ذکر مولانا نے قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے، تحریک ناکام ہوگئی اور انگریز دہلی پر دوبارہ قابض ہوگئے۔ اب دہلی میں بدامنی، کشت وخون اور داروگیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ لوگ فاقوں سے مرنے لگے۔ اس حال میں مولانا کسی طرح بچ بچا کر اہل وعیال کے ساتھ وطنِ مالوف خیرآباد پہنچ گئے۔ یہ تمام واقعات ۱۸۵۷ء میں پیش آئے۔

دہلی کے بعد ہنگاموں کا دوسرا بڑا مرکز لکھنؤ تھا۔ یہاں بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا اور بیگم کی جانب سے احمد علی عرف ممو خاں قیادت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ مولانا چاہتے تو دہلی کے واقعات وحادثات سے سبق لیتے ہوئے گوشہ گیر و خانہ نشین ہو جاتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ انگریزوں سے نفرت کا جذبہ انھیں ممو خاں تک لے گیا اور ایک صاحب تدبیر اور مذہبی مشیر کی حیثیت سے وہ اس کے فوجی کیمپ میں اس وقت تک مقیم رہے، جب تک کہ یہاں کے حالات دگرگوں نہ ہوگئے۔ یہ واقعات سال آئندہ یعنی ۱۸۵۸ء کے ہیں۔

جب بیگم حضرت محل اور ممو خاں کی فوج تتر بتر ہونے لگی تو مولانا وہاں سے نکل کر روپوش ہوگئے۔ کچھ دنوں بعد جب ملکۂ معظّمہ کی جانب سے عام معافی کا اعلان ہوا تو مولانا نے

یہ خیال کر کے کہ میں نے اس ہنگامے میں نہ تو عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہے نہ فتنہ و فساد میں کوئی عملی حصہ لیا ہے اور نہ باغیوں کو پناہ دی ہے، اپنے آپ کو معافی کا مستحق تصور کیا اور اعلانِ معافی کی آخری تاریخ دسمبر ۱۸۵۸ء سے پہلے پہلے سیتاپور کے اعلا فوجی افسر کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پھر اس سے حاضری کی سند لے کر اس کی ہدایت کے مطابق وطن خیرآباد چلے آئے۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں انھیں حراست میں لے لیا گیا۔ پھر مقدمہ چلا کر بالآخر انھیں کالے پانی بھیج دیا گیا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ وہ دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ باغیوں کے دوش بہ دوش رہے اور انگریزوں کا تسلط ختم کرانے میں اپنی عالمانہ اور مدبرانہ صلاحیتوں کا انھوں نے پورا پورا استعمال کیا۔

البتہ فتوائے جہاد جاری کرنے، بغاوت میں عملی حصہ لینے، مسرت و شادمانی کے ساتھ سزا کا استقبال کرنے اور ہشاش بشاش جیل جانے کی باتیں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔

مآخذ:

(۱) باغی ہندوستان: عبدالشاہد خاں شروانی

(۲) مولانا فضل حق خیرآبادی: مالک رام، مشمولہ تحقیقی مضامین، مالک رام، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

(۳) مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد: مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ماہنامہ 'تحریک' دہلی، اگست ۱۸۵۷ء

(۴) مولانا فضل حق و عبدالحق خیرآبادی: مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی، نظامی پریس، بدایوں، سنہ ندارد (مابعد ۱۹۳۷ء)

(غیر مطبوعہ)

○

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا مِرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنانا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جاناناں بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ رہِ میخانہ بنایا ہوتا
دلِ صد چاک بنایا تو بَلا سے لیکن
زلفِ مشکیں کا تری شانہ بنایا ہوتا
زور معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

اسلم پرویز

بہادر شاہ ظفر اور اٹھارہ سو ستّاون

۱۹۴۷ء تک بہادر شاہ ظفر اور انقلاب کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا، وہ زیادہ تر برٹش حکومت کے نقطۂ نظر سے تھا۔ اس سلسلے میں بعض روزنامچے بھی شائع ہوئے، جن میں جیون لال کا روزنامچہ اور معین الدین حسن کی کتاب 'خدنگِ غدر' اہم ہیں۔ منکاف نے ان کا انگریزی میں ترجمہ کرایا تھا۔ ہمارے بعض مورّخین نے ان تحریروں کے سہارے اچھی خاصی غلط فہمی پھیلائی ہے، جن میں آر.سی. مجمدار اس لیے قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی تحقیق کے مطابق ''بہادر شاہ غدّار تھے اور آخر تک برٹش حکومت کے وفادار رہے[۱]۔'' یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے پیشِ نظر صرف انگریزوں کی لکھی ہوئی کچھ تاریخیں اور جیون لال کا روزنامچہ ہوگا۔ جیون لال کے روزنامچے سے پتا چلتا ہے کہ وہ جاسوس تھا اور انگریزوں کو قلعے سے متعلق خبریں پہنچاتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر اگرچہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے لیکن دہلی کے عوام کے لیے وہ اب تک ہندوستان کے شہنشاہ تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی عزّت و عظمت اُسی طرح برقرار تھی۔ عوام ہی نہیں، عالم فاضل لوگ بھی بادشاہ سے یکساں طور پر عقیدت رکھتے تھے۔ اینڈریوس نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''جب انگریزی افواج شہر میں بغیر کسی مقابلے کے قابض ہوگئیں اور بادشاہ کو قلعے کے رقبے کے اندر پورے شاہانہ اختیارات کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس وقت دہلی کے باشندوں کی عام ہمدردی ان کے ساتھ ہوگئی۔ تاہم قدرت کے اس تمام انقلاب میں جو خواہ مرہٹوں کے ماتحت ہوا ہو یا انگریزوں کے ماتحت، دہلی کے لوگ ہندو اور

مسلمان یکساں طور پر... عقیدت مندانہ وفاداری کے ساتھ مغل شہنشاہوں کے ساتھ چمٹے رہے۔ اس بارے میں جو بھی شہادت مجھے ملی، وہ قطعی تھی۔ انھیں (ذکاء اللہ کو) بہادر شاہ کے ساتھ جو محبت تھی اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، خواہ وہ ان کے نظم ونسق کی کمزوری اور خرابی پر کتنا ہی ماتم کناں کیوں نہ رہتے ہوں[۲]۔"

۱۸۳۷ء میں جب بہادر شاہ تخت نشین ہوئے تو وہ بھی اپنے والد کی طرح شہنشاہ اور غازی کے خطابات سے سرفراز ہوئے، لیکن شہنشاہیت برائے نام تھی اور عوام بھی اُس برائے نام شہنشاہیت کے برسوں سے عادی ہو چکے تھے۔ آخری مغل شہنشاہ بھی دربار تو بڑے تزک و احتشام سے کرتے تھے لیکن عملی طور پر اُن میں اتنی صلاحیت اور قوت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کسی بڑی تحریک کی قیادت کر سکتے۔ وہ ہمت اور شجاعت جو بابر سے لے کر اورنگ زیب تک مغل شہنشاہوں کا طُرّۂ امتیاز رہی تھی، اِن آخری مغل شہنشاہوں کے حصے میں نہیں آئی تھی جن کا سلسلہ محمد شاہ سے شروع ہو کر بہادر شاہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بہادر شاہ ظفر کی شخصیت انگریزوں کے لیے کسی خطرے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ میرٹھ کی ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کر دی ہے اور یہ باغی فوجیں جمنا کے کشتیوں کے پُل کو پار کر کے دہلی پہنچ گئی ہیں۔ اہلِ دہلی اُس وقت تک میرٹھ کی بغاوت سے بے خبر تھے، چناں چہ ۱۱ر مئی کی صبح کو بھی سب لوگ اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ پہاڑ گنج تھانے کے انچارج معین الدین حسن ایک فوجی مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں مسٹر ہنچسن کی عدالت میں مصروفِ کار تھے[۳]۔ منشی جیون لال صبح ہی کپتان ڈگلس سے قلعے میں ملاقات کر کے واپس گھر آچکا تھا اور اب کچہری جانے کے لیے پالکی کا منتظر تھا[۴]۔ سیمسن کمشنر دہلی ابھی محوِ خواب تھا۔ اچانک یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ میرٹھ کی فوج بغاوت کر کے دہلی پہنچ گئی ہے۔ باغی فوج نے چنگی کی چوکی کو آگ لگا کر اس کے داروغہ کو جان سے مار ڈالا تھا۔ ہنچسن عدالت سے رخصت ہو کر فوراً کمشنر کے بنگلے میں لپکا۔ کمشنر کی طرح خود بہادر شاہ ظفر کے لیے بھی یہ خبر اتنی ہی غیر متوقع اور حیرت ناک تھی۔ قلعے کی پشت پر جھروکے کے نیچے جمنا کی ریتی میں باغی فوجیں اکٹھا ہو گئیں۔ یہ شور وغوغا سُن کر بادشاہ پریشان ہو گئے۔ ان کے کمزور دل میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس جمِّ غفیر کا سامنا کر سکتے، چناں چہ انھوں نے فوراً انگریز قلعے دار کپتان ڈگلس کو بلا بھیجا۔ اس اثنا میں حکیم احسن

اللہ خاں نے تسبیح خانے میں آکر باغی سواروں سے پوچھ گچھ کی، جس کا حال ظہیر دہلوی نے اِس طرح بیان کیا ہے:

''حکیم احسن اللہ نے بہ موجبِ حکم تسبیح خانے میں آکر سوارانِ باغیہ سے استفسارِ حال کرنا شروع کیا۔ چند افسران گھوڑوں پر سے اتر پڑی پر آکر کھڑے ہوگئے اور زیرِ جھروکہ سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:

تقریر زبانی سوارانِ باغیہ

حضور بادشاہ سلامت! آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں، آپ کو حق تعالیٰ نے بائیس صوبوں کا مالک کیا ہے، تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرمانبردار ہے، ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت میں شمار ہوتی ہے، آج تک ہندوستان میں منادی پھرتی ہے تو یہی بیان کیا جاتا ہے: خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی کا۔ انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک ومختار ہیں، ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں، امیدوارِ انصاف ہیں، ہم ملازم انگریزی ہیں... سرکار کی نیت میں فتور ہوا اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئے اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کرلیں... ہم لوگوں کو خیالِ دین وآئین دامن گیر ہوا، نزاع بڑھ گئی مقدمہ طول کھینچ گیا... ۵ ''

باغی سپاہ کی یہ تقریر بادشاہ کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ اُنھیں اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کا بہ خوبی احساس تھا، وہ انگریزوں کے خلاف ایسا قدم خواب وخیال میں بھی نہیں اٹھا سکتے تھے، اِس لیے اس صورتِ حال سے اُنھوں نے فوری طور پر جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ فوج نے یہ جو کچھ کیا ہے، محض نادانی کی بنا پر کیا ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے فوج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا سلطنت تو برسوں پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جدّ وآبا کے نوکر چاکر اپنے خداوندانِ نعمت کی اطاعت سے جدا گانہ رئیس بن بیٹھے

۔ میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا، قوتِ لایموت کو محتاج ہو گئے ... میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں، مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں، مجھ سے کسی طرح توقع استطاعت کی نہ رکھو[۶]۔''

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ ظفر کو اس انقلاب کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ انھیں اس حادثے کی اطلاع ۱۱ر مئی کی صبح کو آٹھ بجے ملی۔ اس کی تفصیل 'سراج الاخبار' میں شائع ہوئی تھی، جس کا خلاصہ یہ ہے:

صبح آٹھ بجے بادشاہ کو بتایا گیا کہ انگریزی فوج کے سوار اور پیدل ملازموں نے ضلع میرٹھ کے حکام کی حکم عدولی کی۔ افسران کو قتل کر دیا اور اور دہلی پہنچ کر لال قلعے کے پاس جوق در جوق زیرِ جھروکہ جمع ہو گئے۔ بادشاہ نے فوراً سیف الدولہ کو حکم دیا کہ قلعے دار کپتان ڈگلس کو مطلع کرو۔ قلعے دار وہاں آیا اور اس نے زیرِ جھروکہ ہجوم کو مخاطب کر کے کہا کہ بادشاہ کو تکلیف مت دو، یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔ باغی سپاہی راج گھاٹ کی طرف چلے گئے۔ قلعے دار زیرِ جھروکہ جانا چاہتا تھا مگر بادشاہ نے منع کر دیا اور اس کی حفاظت کے لیے احکام صادر کیے۔ تھوڑی دیر میں خبر آئی کہ قلعے دار اور دوسرے تمام مرد عورتوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے مکانات لوٹ لیے گئے اور پھر پورے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی انگریز نظر آتا ہے، اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کو بھی لوٹا جا رہا ہے۔ دوپہر تک لوگوں کے گروہ کے گروہ فریاد کرتے ہوئے آئے کہ بادشاہ اپنے فرزندوں کو شہر کے انتظام پر مقرر کریں۔ بادشاہ نے مرزا ظہیر الدین بخت بہادر عرف مرزا مغل اور مرزا عبداللہ کو تعینات کیا کہ فوج لے کر شہر جائیں اور امن و امان قائم کریں[۷]۔''

'سراج الاخبار' کی اس خبر سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ انقلاب سے بے خبر تھے۔

ادھر سمسن اور ہنچسن جو ڈگلس کے ہمراہ قلعے پہنچے تھے، واپسی پر ہندوستانیوں کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے۔ لوگوں میں بے پناہ جوش وخروش تھا۔ شہر پر قبضہ ہو چکا تھا، چھاؤنی خالی ہو چکی تھی، لیکن ابھی تک میگزین انگریزوں کے ہاتھ سے نہیں نکلا تھا۔ نو انگریز افسروں کا ایک حفاظتی دستہ میگزین پر تعینات تھا۔ جب باغی فوجوں نے میگزین کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور سیڑھیوں کی مدد سے چڑھ کر میگزین پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو لاچار انگریزوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے میگزین کو اڑا دینا پڑا۔ ایک ہیبت ناک دھماکا ہوا اور میگزین بھک سے اُڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی آس پاس کے مکانات بھی ملبے کا ڈھیر ہو گئے۔ سیکڑوں ہندوستانیوں کے جسم چیتھڑوں کی طرح اُڑ گئے۔ نو انگریز افسران جو میگزین میں موجود تھے، اُن میں سے چھے زخمی حالت میں باقی بچے، جن میں سے پانچ کو بعد میں وکٹوریہ کراس ملا[۸]۔

حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک بار پھر اُن کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ اب یہ بالکل واضح ہو چکا تھا کہ بغاوت کے اس سیلابِ عظیم کو روکنا مقامی انگریز افسران کے بس کی بات نہیں۔ اکثر انگریز افسران تو مارے ہی جا چکے تھے اور جو بچ رہے تھے، اُن کی حالت خستہ تھی۔ بادشاہ بہت سراسیمہ تھے۔ انھوں نے حکیم احسن اللہ خاں کے مشورے سے فوراً ایک چٹھی آگرے کے لیفٹننٹ گورنر کے نام روانہ کی، جس میں تمام حالات تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے لیفٹننٹ گورنر کے نام سانڈنی سوار کے ہاتھ جو چٹھی روانہ کی تھی، اُس میں یہ فارسی شعر بھی تھا:

بر لبم رسیدہ جانم ، تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازآں کہ من نہ مانم ، بچہ کار خواہی آمد[۹]

گویا اُس وقت تک بادشاہ انگریزوں کو ہی دوست اور ہمدرد سمجھتے تھے اور انقلاب سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُس وقت قلعے کی جو حالت تھی، اُس کا ذکر جیون لال نے اس طرح کیا ہے:

> ''حکیم احسن اللہ خاں نے پھر ان فوجوں کی فہرست طلب کی جنھوں نے بغاوت کر دی تھی۔ شاہی محل کے افسر منتظم کو بھی طلب کیا گیا۔ اس کے بعد چند مقتول افسروں کی خبر محل میں پہنچی اور معاً سواروں کی ایک

نئی پلٹن بھی دیوانِ خاص کے صحن میں خیمہ زن ہوئی ۔ بہت سے آدمی زبردستی بادشاہ کے حضور میں پہنچ گئے جو اس وقت دیوانِ خاص میں جلوہ فرما تھے ...محل کا صحن ابتری، گھبراہٹ اور باہمی تنازعات کا بدترین نمونہ پیش کر رہا تھا۔ فوج میں ڈسپلن پیدا کرنے کی غرض سے حکیم احسن اللہ خاں نے شہزادگان کو مختلف رجمنٹوں کی کمان لینے کا حکم صادر کیا[10]۔"

ظفر کی زندگی میں اس پیرانہ سالی میں یہ پہلا موقع تھا جب انھیں ایسے ہنگامی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا، چناں چہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، جب باغی سپاہ نے اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور اُن سے تحریک کی قیادت کی درخواست کی تو وہ حیران و پریشان رہ گئے ۔ اُدھر شہر میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور غلط قسم کے عناصر موقعے کا فائدہ اُٹھا کر لوٹ مار پر تُلے ہوئے تھے، جس سے شہر کا امن برباد تھا اور باشندگانِ شہر عاجز و پریشان تھے۔ بادشاہ کو دہلی اور اہلِ دہلی سے جو بے پناہ محبت تھی اُس کی وجہ سے وہ دہلی کی بربادی دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ شہر میں امن و امان کس طرح قائم ہو۔ چناں چہ اگلے دن یعنی ۱۲ر مئی کو اُنھوں نے شہر کے عمائدین کی ایک کونسل طلب کی جس میں اِن امور پر غور کیا گیا کہ فوج کے لیے غلّے اور قیام کا کیا بندوبست ہو اور اس کے لیے روپیا کہاں سے آئے اور یہ بھی کہ شہر میں نظم و نسق کس طرح برقرار رکھا جائے[11]۔

شہر میں امن و امان برقرار رکھنے کی غرض سے ضعیف العمر بادشاہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کے معائنے کے لیے نکلے ۔ بادشاہ نے دکان داروں کو تسلی دے کر اُن کی دکانیں کھلوائیں اور لوگوں کو سمجھایا اور بعض کے گھر جا کر انھیں صبر کی تلقین کی[12]۔ مرزا مغل اس اثنا میں تمام افواج کے کمانڈر انچیف مقرر ہو چکے تھے ۔ دوسرے شہزادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دیے جا چکے تھے ۔ فوج کے تجربہ کار افسران بادشاہ اور کمانڈر انچیف کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرنے کو تیار تھے ۔ شہری اور فوجی بدامنی کو روکنے کے لیے ایک "کورٹ بنائی گئی" جس کے دس ممبر تھے ۔ اُن میں چھے فوجی نظم و نسق کے نمائندے تھے اور چار شہری امور کے ۔ کثرتِ رائے کو فیصلہ کُن مانا گیا تھا۔ کمانڈر انچیف مرزا مغل فوج کے سربراہ تھے اور اُن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کورٹ کے کسی بھی فیصلے کو نظرِ ثانی کے لیے واپس بھیج سکتے تھے۔ اور اگر نظرِ ثانی کے بعد بھی کورٹ اپنے سابقہ فیصلے پر قائم رہے، تو پھر آخری فیصلے کا اختیار بادشاہ کو تھا کہ وہ جو قدم مناسب سمجھیں، اُٹھائیں ۔ بادشاہ اور کمانڈر انچیف کو کورٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے کا

اختیار بھی حاصل تھا۔ اِن حالات میں کورٹ کی تشکیل کے بعد بہادر شاہ ظفر انگریزوں کی حمایت کا خیال چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور پھر پوری طرح انقلابیوں کے ساتھ ہوگئے۔ جہاں تک اِنقلابیوں کا تعلق ہے، وہ تو انھیں پہلے ہی اپنا بادشاہ تسلیم کر چکے تھے۔ ۱۶ر مئی کو بادشاہ نے دربار کیا اور حسبِ ذیل عہدے تقسیم کیے:

''مرزا جواں بخت بہادر	:	عہدۂ وزارتِ کل سلطنت
مرزا مغل بہادر	:	عہدہ سپہ سالاری کل افواجِ جنگی وانتظامِ جمیع تمام پلاٹن وسوارات
مرزا عبداللہ بہادر	:	افسری پلٹن
مرزا سہراب بہادر	:	افسری پلٹن
مرزا خضر سلطان بہادر	:	افسری پلٹن الیگزنڈر
مرزا محمد کوچک سلطان بہادر		
ومرزا ابوبکر بہادر	:	افسران جمیع ترک سواران[۱۳]۔''

اس سلسلے میں ایک اور خبر ۲۳ر مئی کے 'سراج الاخبار' میں ملتی ہے، لیکن یہ خبر ۱۵ر یا ۱۶ر مئی کے آس پاس ہی کسی دن سے متعلق معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ اس میں ان ترک سواروں کی آمد کا ذکر ہے جن کی افسری ۱۶ر مئی کی اطلاع کے مطابق مرزا کوچک سلطان بہادر اور مرزا ابو بکر بہادر کو سونپی جا چکی تھی، تاہم یہ خبر بھی قابلِ غور ہے، اس لیے درج کی جاتی ہے:

> ''جس دن ترک سواران اور مردم پلاٹن جنگی، خدمت میں حاضر ہوئے تھے، تو بادشاہ نے کہا تھا کہ ہمارے پاس مال وخزانہ نہیں ہے جس سے تمھاری مدد کریں۔ ایک جان ہے اُس سے دریغ نہیں۔ ترک سوار وغیرہ اس پر راضی ہوگئے۔ انھوں نے عرض کیا، ہم آپ کی فرماں برداری کے لیے حاضر ہیں۔ ارشاد ہوا کہ میگزین اور خزانے کا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ ہمارے تمھارے کام آسکے[۱۴]۔''

اگرچہ کمانڈر اِنچیف کا عہدہ مرزا مغل کو مل گیا اور بعد میں بخت خاں کو بھی گورنر جنرل کے خطاب سے نوازا گیا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ آخر وقت تک بہ ذاتِ خود فوجی انتظام میں دل چسپی لیتے رہے تھے۔ نیشنل آرکائوز میں ایسی دستاویزیں موجود ہیں جن سے اندازہ

ہوتا ہے کہ امن وامان قائم رکھنے کے لیے بادشاہ روزانہ خود احکام جاری کیا کرتے تھے[15]۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی اس بغاوت کے پیچھے ایک زبردست جوش اور جذبہ کارفرما تھا ، اس لیے کہ اس بغاوت کا براہِ راست تعلق ہندستان کی تہذیبی ، سماجی ، اقتصادی اور مذہبی زندگی سے تھا۔ ہندستان پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے یہ زندگی بری طرح متاثر تھی ۔ ہر شعبۂ زندگی میں ایک بے چینی کی سی کیفیت تھی جسے ذہنی اور جذباتی دونوں سطحوں پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ بدقسمتی سے بغاوت کی تحریک کوئی منظم شکل نہیں اختیار کرسکی ۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سماج کے مختلف طبقوں میں برٹش راج کو اکھاڑ کر پھینکنے کے مقاصد جدا جدا تھے ۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصہ لینے والوں میں موٹے طور پر تین طرح کے عناصر شامل تھے۔ ایک تو وہ سپاہی جن کے ہاں ایک ایسا والہانہ مذہبی جذبہ تھا جس نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک سیاسی رنگ اختیار کرلیا تھا۔ دوسرے وہ سپاہی جو وقتی طور پر تو ایک جذبے کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوگئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس روایتی لوٹ مار میں بھی حصہ لیتے رہے جو ہندستان بلکہ پورے ایشیا میں فوجی مہموں کا ایک حصہ رہی ہے۔ تیسرے اس تحریک میں شامل ہونے والے وہ لوگ تھے جن کے ہاں کوئی جذبہ نہیں تھا مگر وہ مجاہدین بن کر باغیوں کے ساتھ صرف اس لیے شریک ہوگئے کہ یا تو لوٹ مار میں ہاتھ رنگ سکیں یا انگریزوں کی جاسوسی کریں اور انعام پائیں۔ یہ تمام مثبت اور منفی کردار پوری تحریک میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ان کی شناخت مشکل تھی۔ انگریزوں کی طاقت سے ٹکر لینا یوں بھی آسان نہیں تھا اور جب خود تحریک میں ہی غدار اور موقع پرست لوگ شامل ہوں تو اس کا انجام معلوم۔ ان حالات میں جب بادشاہ نے تحریک کی قیادت سنبھالی تو ہر طرح کی ذمے داریوں اور پریشانیوں نے انھیں بری طرح آن گھیرا۔ ایک طرف تو انگریزوں کو شکست دینا تھا اور دوسری طرف مقامی فتنہ وفساد پر قابو پانا تھا۔ خزانے میں روپے کا نام نشان نہ تھا۔ سپاہی تنخواہوں کے لیے واویلا مچا رہے تھے۔ ان حالات میں بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا۔''

> ''تمام مہاجنوں اور مال دار اشخاص کو گرفتار کرلیا جائے بالخصوص اُن کو جو انگریزوں کے ہوا خواہ ہیں اور ان سے باغیوں کی تنخواہ کے لیے روپیا اینٹھا جائے[16]۔''

حکیم احسن اللہ خاں نے عرض کیا کہ سپاہی شہر میں لوٹ مار کررہے ہیں اور درخواست کی کہ انھیں شہر بدر کیا جائے ۔ چناں چہ اس سلسلے میں فوراً ہی افسرانِ پلاٹن کے نام یہ حکم صادر کیا گیا:

''چوں کہ جنگی پلٹن کے شہر میں وارد ہونے کی وجہ سے شہر کی بربادی کا خطرہ ہے اس لیے انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ پلٹن کے افسران اپنے سالار کے ساتھ اپنے خیمے شہر کے باہر نصب کریں اور یہی احکام برخوردار کا مگار مرزا ظہیر الدین کے لیے بھی ہے جو کل فوج کے سپہ سالار ہیں۔ برخوردار کا مگار بھی یہ حکم ان تک پہنچا دیں اور تمام فرزندان بھی جو اپنی اپنی پلٹن کے سالار ہیں اپنے خیمے شہر کے باہر نصب کریں تا کہ بادشاہ سلامت کے حکم کی تعمیل ہو کیوں کہ اسی میں ان کی خوشنودی ہے ۔۲۹ رمضان ۱۲۷۳ھ۔''

(فارسی سے ترجمہ)

منشی اجودھیا پرشاد کے سپرد ٹکسال کا کام ہوا اور ان کی نگرانی میں تیزی سے سکّے بننے شروع ہو گئے۔ عبداللطیف نے ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو اپنے روزنامچے میں لکھا ہے:

''اس کام میں نہایت اہتمام کیا گیا اور تیزی سے سکّہ بننا شروع ہوا۔ سکّے کا چہرہ اس طرح روشن ہوا:

سکّہ زد در جہاں بفضلِ الٰہ شاہِ ہندوستاں بہادر شاہ[۱۸]''

۱۸۵۷ء کی جنگ میں انقلابیوں کی ناکامی کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے، وہاں ایک سبب یہ بھی تھا کہ دہلی میں انگریزوں نے جاسوسوں کا جال پھیلا رکھا تھا۔ یہ جاسوس ہر جگہ موجود تھے، قلعے میں، فوج میں، شہر میں، حلقۂ امرا میں یہاں تک کہ بادشاہ کے کے مقربینِ خاص یعنی حکیم احسن اللہ خاں اور نواب محبوب علی خاں کو بھی اس اعتبار سے شبہے کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ جیون لال لکھتا ہے:

''آج یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی نے اسلام گڑھ کی توپوں کو کنکروں اور پتھروں سے بھر دیا ہے۔ شبہ حکیم احسن اللہ خاں پر کیا گیا اور اس الزام میں کہ وہ انگریزوں سے ملی بھگت رکھتے ہیں، بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ باغیوں نے حکیم صاحب اور محبوب علی خاں کو قتل کر دینے کی دھمکی دی اور تلواریں بھی میان سے نکال لیں۔ ہر دو ملازموں نے حلف اٹھایا کہ ہم بے گناہ ہیں۔ بادشاہ نے ملازمین کی حمایت کی اور

سپاہیوں کا غصہ فرو کر دیا[19]۔"

حکیم احسن اللہ خاں کے کردار پر اس بارے میں بجا طور پر شبہے کی گنجائش ہے کہ وہ انگریزوں کے خیر خواہ ہی نہیں، ان کے معتبر جاسوس بھی تھے۔ ان کے رویّے پر گریٹ ہیڈ کے ایک خط سے بھی روشنی پڑتی ہے جو اُس نے ۱۵ر اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی کے محاذِ جنگ سے جان برنس کے نام بھیجا تھا۔ اِس خط میں باغیوں کے اُس رویّے کا جواز بھی موجود ہے، جو اُنھوں نے حکیم صاحب کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ خط کا اقتباس یہ ہے:

"مولوی رجب علی (صاحب) نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں آپ کو یہ اطلاع دوں کہ انھوں نے حکیم احسن اللہ (صاحب) کے نام ایک مراسلہ بھیجا تھا جو مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ اس سے کچھ ضرر نہ پہنچے گا بلکہ ممکن ہے اس کی وجہ سے حکیم صاحب بادشاہ اور باغیوں کے منصوبوں کے اندرونی راز بتانے کے قابل ہو جائیں۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اس کے باعث حکیم صاحب کی سخت بے عزّتی ہوئی اس لیے کہ وہ مراسلہ سپاہیوں کے ہاتھ پڑ گیا جنھوں نے ان کے مکان کی تلاشی لے ڈالی[20]۔"

جیون لال نے بھی ایک جگہ ایسی ہی بات لکھی ہے:

"باغیوں نے حکیم احسن اللہ خاں پر انگریزوں سے سازش کرنے کا الزام لگایا اور ان پر پہرا بٹھا دیا گیا۔ ان سے کہہ دیا گیا کہ آپ بادشاہ سے گارد کی موجودگی کے بغیر بات چیت نہیں کر سکیں گے۔ نواب محبوب علی خاں کے مکان پر بھی پہرا بٹھا دیا گیا[21]۔"

انقلابیوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ کوئی شخص شہر میں ایسا ہے جو انگریزوں سے خط کتابت کرتا ہے، لہٰذا اس شخص کا کھوج لگایا جائے۔ اگلے روز محل کے اناج خانے میں گولہ بارود کی کچھ مقدار پائی گئی جس کی نسبت یہ گمان ہوا کہ یہ انگریزوں کو بھیجی جانے والی ہے۔ چناں چہ باغی فوج کے افسروں نے حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں پر حملہ کر دیا۔ خیال یہ تھا کہ بادشاہ کی بیگم، زینت محل بھی اس کارگزاری میں شریک ہیں[22]۔

بادشاہ حکیم صاحب پر جتنا زیادہ بھروسا کرتے تھے، فوج کے افسران ان پر اسی قدر شبہ کرتے

تھے۔ حقیقتاً حکیم صاحب کو اس انقلاب سے قطعی دل چسپی نہیں تھی لیکن وہ کھل کر اس کی مخالفت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو بادشاہ کی ضرورت سے زیادہ حمایت حاصل تھی اور اسی لیے وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ انقلاب کی تحریک میں شامل ہو جانے کے بعد بہادر شاہ ظفر نے اس میں حالات کے دباؤ کے تحت حصہ لیا۔ شاید انھیں یہ بھی محسوس ہونے لگا ہو کہ اُن کی کھوئی ہوئی سلطنت، دولت، جاہ و حشم سب واپس مل جائے گا۔ اس کا امکان ہے کہ وہ سچ مچ ہندستان کے بااختیار شہنشاہ بننے کا خواب دیکھنے لگے ہوں، خاص طور پر اس وقت سے جب سے باغی فوجوں نے ان کو پورے ہندستان کا شہنشاہ کہا تھا اور تمام اختیارات ان کو سونپ دیے تھے۔ وہ مقدور بھر پوری احتیاط اور حکمت عملی کے ساتھ تمام امور میں دل چسپی لیتے اور ایسے احکام صادر کرتے رہتے جن سے لوگوں میں اتحاد اور اپنی ذمّے داریوں کا احساس پیدا ہو اور شہر میں نظم و نسق قائم رہے۔ انھوں نے تمام افوج کے نام ایک شقّہ جاری کیا جس میں فوجیوں کو اس بات کی تلقین کی گئی تھی کہ وہ اپنے فرائض اور ذمّے داریوں کو پورا کریں۔ یہ شقّہ نیشنل آرکائوز کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، اور سات دفعات پر مشتمل ہے۔ شقّے کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے:

''۱- جو فوجیں انگریزوں پر فتح پانے کی غرض سے بادشاہ کے ساتھ شریک ہوئی ہیں، اُن پر یہ واجب اور لازم ہے کہ وہ بادشاہ کے احکام بجا لائیں اور پوری جاں فشانی کے ساتھ دشمن کا صفایا کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے انھیں بادشاہ کی خوشنودی حاصل ہوگی، جو ان کے لیے وسیلۂ ترقی ثابت ہوگی۔

۲- ہر پیادے اور سوار پر لازم ہے کہ اپنے افسر کی فرماں برداری کرے۔ اسی طرح چھوٹا افسر بڑے افسر کی فرماں برداری کرے اور بڑا افسر فوج کے نظم و نسق کو اپنے لیے لازم سمجھے۔

۳- سب سپاہیوں اور سرداروں پر واجب ہے کہ وہ دشمنانِ دین اور مدعیانِ ملک کو مارنے، گرفتار کرنے یا سزا دینے میں کسی قسم کی پہلو تہی سے کام نہ لیں۔ اس لیے کہ اس کام میں پوری خلقِ خدا کی بہبود ہے۔

۴- جو سپاہی اور افسر، اِن احکام پر عمل کرے گا، اپنے عہدے کے مطابق انعام اور اضافہ پائے گا اور جو شخص اپنی جان نثار کرے گا اس کے اہل

وعیال کی اچھی طرح پرورش کی جائے گی اور اسکے بیٹے، پوتے یا کسی قریبی عزیز کو اس کی جگہ ملازم رکھ لیا جائے گا۔

۵- جو دشمنانِ دین سے ساز باز کرے گا یا کسی طرح ان کی مدد کرے گا یا انھیں رسد پہنچائے گا، وہ خدا اور رسول کا گنہ گار ہوگا اور اپنے کیے کی سزا پائے گا۔

۶- جس پہاڑی میں کفار پناہ گزین ہیں، وہ باوجود کثرتِ فوج کے سر نہیں ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ملک کے انتظام میں خلل پڑا ہوا ہے اس لیے بہادروں کو چاہیے کہ جان و دل سے اس معرکے میں مصروف ہو جائیں اور پوری کوشش کریں کہ دشمنانِ دین ہلاک اور تباہ ہو جائیں اور اس فتح کی خبر سب طرف پھیلے۔

۷- جو سوار اور تلنگے جس جس پلٹن میں ہیں، وہ اپنے اپنے افسر کے ماتحت رہیں، اِدھر اُدھر منتشر نہ ہوں۔ بعد میں امورِ سلطنت کے انتظام کے مطابق ہر کسی کو بھرتی کیا جائے گا۔

چھوٹے افسروں اور سپاہیوں کو چاہیے کہ بادشاہ کے اِن احکام کو بجان و دل قبول کریں اور ان کے مطابق عمل کریں۔ جو افسر یا سپاہی اپنی پلٹن سے الگ ہو جائے، اُس کی رپورٹ متعلقہ افسر حسبِ ضابطہ سرکارِ شاہی میں کرے تاکہ وہ سزا پا کر نکالا جائے[۲۳]۔"

ان حالات میں بادشاہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جایا کرتے تھے۔ انھیں سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ انقلابی اگر ہار گئے تو انگریز انھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ وہ اِس انقلاب کی کامیابی کے متمنی رہتے ہوں۔ وہ معمولی سی بدنظمی پر بھی جھلا اٹھتے تھے اور بہت زیادہ غصّے اور مایوسی کا اظہار کرتے تھے۔ چناں چہ ایک مرتبہ وہ بخت خاں پر بھی بہت ناراض ہوئے، اور انھوں نے انتہائی کبیدہ خاطر ہو کر بخت خاں سے کہا:

"شہسوار اور ہوتے ہیں اور گدھے دوڑانے والے دوسرے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لومڑی لڑائی کیا لڑے گی۔ بخت بلند خاں رونے لگے اور بولے: بادشاہ کو صاحبِ خدا کہتے ہیں بارگاہِ الٰہی میں ان کی

دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور جو دعائیں وہ کرتے ہیں مقبول ہوتی ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں ہوکر رہتا ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ بادشاہ کی دعا لشکر کے لیے سپر ہو۔ یہ سُن کر بادشاہ نے یہ آیت پڑھی: نصرٌ مّن اللہ و فتحٌ قریب وبشّر المومنین ۲۴۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک میں فوجی تنظیم نام کو نہیں تھی۔ ایک بے پناہ جوش تھا جس کی بدولت انقلاب تو برپا ہوگیا تھا لیکن اس انقلاب کی کامیابی اور استحکام کے لیے کوئی باقاعدہ اور سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان حالات میں سب سے زیادہ مصیبت بادشاہ کو خود اپنی نظر آرہی تھی۔ ایسے ہنگامی حالات میں بھی شہزادے بدعنوانیوں سے باز نہیں آرہے تھے۔ فوج کے لیے شہزادے مہاجنوں اور ساہوکاروں سے روپیا جمع کرتے تھے لیکن اسے خزانے میں جمع نہیں کرتے تھے ۲۵۔ مجبور ہوکر بادشاہ نے کل اختیارات بخت خاں کو سونپ دیے اور انھیں لارڈ گورنر کا خطاب عطا کیا۔ اگرچہ مرزا مغل کمانڈر انچیف تھے لیکن بات زیادہ بخت خاں ہی کی چلتی تھی، اس بنیاد پر اکثر مرزا مغل اور بخت خاں کے درمیان اختلافِ رائے رہتا جو تحریک کی کمزوری کا ایک اور سبب تھا۔ جیون لال لکھتا ہے:

''محمد بخت خاں نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ اگر کسی شہزادے نے شہر کو لوٹنے کی کوشش کی تو میں اس کی ناک اور کان کٹوادوں گا۔ بادشاہ نے جواب دیا تمھیں پورے اختیارات حاصل ہیں، جو بہتر سمجھو کرو ۲۶۔''

مرزا مغل کے نام بھی ایک شقہ اسی قسم کا جاری کیا گیا کہ جن لوگوں نے شہر میں قتل و غارت اور لوٹ مار مچا رکھی ہے اُنھیں گرفتار کیا جائے اور شہر کا امن وامان بحال رکھا جائے ۲۷۔''

جولائی کے مہینے میں تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ شہری امور میں امکان بھر سمجھ بوجھ اور دانش مندی سے کام لینے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چناں چہ ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے ۹ر جولائی کو یہ منادی کرائی گئی کہ جو شخص گائے ذبح کرے گا اُسے توپ سے اُڑادیا جائے گا لیکن اگر کوئی بکری ذبح کرنے پر اعتراض کرے تو اُسے بھی سزا دی جائے گی ۲۸۔ کچھ دن بعد جب بقرعید کا تہوار قریب آگیا تو ایک بار پھر گائے کے ذبیحے کی بابت منادی کرادی گئی اور اس سلسلے میں بادشاہ نے ایک شقہ کوتوالِ شہر مبارک خاں کے نام جاری کیا جو اس طرح تھا:

''حضور والا کا خاص شقہ حضور معلا شجاعت نشان کے دستخطوں کے ساتھ۔

مبارک شاہ خاں کوتوالِ شہر کو معلوم ہو کہ کل تمام شہر میں شقہ خاص کے مطابق یہ منادی کرادی جائے کہ گائے کا ذبیحہ یا قربانی قطعی ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ شہر کے تمام دروازوں پر یہ بندوبست کر دیا جائے کہ کسی بھی جانب سے گائے یا بھینس فروخت کرنے والے آج سے لے کر عید کے تین روز بعد تک گائے یا بھینس شہر میں نہ لائیں۔ جن مسلمانوں نے گائیں پال رکھی ہیں، وہ اپنی گائیں کوتوالی میں بندھوادیں۔ اگر کوئی شخص خفیہ طور پر یا اعلانیہ گائے کی قربانی کرے گا، تو اُسے موت کی سزا دی جائے گی[۲۹]۔ (فارسی سے ترجمہ)

شہر کوتوال نے اس شقے کی روشنی میں جملہ تھانیدارانِ شہر کے نام احکام جاری کیے اور تھانیداروں کو تاکید کی کہ وہ اس حکم کو نہ صرف اپنے اپنے علاقوں میں مشتہر کریں بلکہ اس کی وصولیابی کی رسید بھی کوتوالِ شہر کے پاس بھیجیں[۳۰]۔ اس حکم کے اجرا کے بعد عملی دشواریوں کے پیشِ نظر کوتوال نے کمانڈر انچیف کو لکھا کہ کوتوالی میں اتنی گنجائش نہیں کہ یہاں گائیں رکھی جاسکیں۔ جواباً کمانڈر انچیف نے ایک حکم جاری کیا جس میں ہدایت کی گئی کہ وہ تمام لوگ جن کے پاس پالتو گائیں ہیں، اُن سے یہ عہد نامہ بھروالیا جائے گا کہ وہ گائیں ذبح نہیں کریں گے[۳۱]۔ اس قانون پر سختی سے عمل درآمد کیا گیا۔ چناں چہ ایک شخص کی گرفتاری عمل میں آئی جس نے انگریزوں کی سازش کے تحت محض تنازعے کی غرض سے گائے ذبح کر ڈالی تھی۔ شہر کوتوال نے مرزا مغل کے نام اپنے ایک خط میں اس معاملے پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ مسمّی عبدالرحمان ولد محمد پناہ، شیخ پیشہ، ساکن چاہ سرخ، غلام محمد و متمن ولد عظیم اللہ، ساکن قدم شریف کو... حوالدار کمپنی اوّل نے کہ تعینات موری دروازے کے ہے بعلّت گاؤ کشی اس عبارت سے کہ انگریزوں سے سازش کر کے پانصد روپے لینا کر کے ہمارے گارد کے سامنے بمراد تنازعہ ہوجانے ہندو مسلمان میں کری۔ اس علّت میں گرفتارِ کوتوالی ہوئے[۳۲]۔''

ایک طرف تو یہ احتیاط و انتظام تھا اور دوسری طرف جاسوس بیخ کنی پر لگے ہوئے تھے۔

انگریزوں کو پل پل کی خبر مل رہی تھی اور اسی اعتبار سے وہ اپنے منصوبے بناتے تھے۔ قلعۂ معلا کی سیاست، اندرونی نفاق، فوجی بدنظمی غرض انگریز انقلابیوں کی ہر کم زوری سے باخبر تھے اور اسی لیے بددِل نہیں تھے۔ گوری شنکر جاسوس لکھتا ہے:

''آج کہ روز شنبہ ہے راقم فوج میں گیا تھا اور نیک (نایک) سدھاری سنگھ کے کمپو میں زیادہ دیر تک ٹھہرا رہا مگر سپاہ کو کمال بددل پایا۔ ایک ایک سپاہی افسر کا مقابلہ کرتا تھا اور حکم مطلق خیال میں نہیں لاتا تھا اور فوج مفلس ہوگئی اور روپے کی بہت قلت ہے۔ سپاہی پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اگر ہم کو تنخواہ نہیں ملے گی تو ہم نہیں رہنے کے۔ چناں چہ آج ہی سو نفر سے زیادہ تلنگا چلا گیا۔ ہر روز قافلے کی روانگی جاری ہے مگر مرزا مغل زیادہ تر فوج کی تسلّی کرتا رہتا ہے اور ہر روز تنخواہ تقسیم کا حکم جاری ہوتا ہے۔ اس بات سے اس قدر فوج مقیم ہے ورنہ اب تک بہت سی چلی جاتی [۳۳]۔''

بخت خاں اور مرزا مغل کے اختلافات کے سلسلے میں بھی گوری شنکر لکھتا ہے:

''مرزا مغل بیگ اور بخت (بہادر) میں نزاع وعداوت ہوگئی چناں چہ مرزا مغل، بخت خاں کی شکایت برملا کرتے تھے اور باعثِ عداوت یہ ہے کہ سپہ سالار فوج بخت خاں کو مقرر کیا تھا۔ مرزا مغل بیگ کو ناگوار ہوا۔ اگر بخت خاں کا کمپو تمام مارا جائے تو مغل بیگ کا کمپو اس کی معاونت نہ کرے [۳۴]۔''

ایک متوقع حملے کی خبر گوری شنکر کے ذریعے انگریزوں تک اس طرح پہنچتی ہے:

''آج تمام افسران کو بادشاہ نے پھر گلے ملا دیا اور سب کا اتفاق ہوگیا اور سدھارا سنگھ جرنیل جو بے دل تھے اس سے آشتی ہوگئی۔ شام کے وقت تمام کمپنیوں کی پریٹ ہے یقین ہے امروز فردا دھاوا ہوگا اور تین بزن سوار ہوں گے [۳۵]۔''

ایک بار کسی طرح بارود خانے میں آگ لگ گئی۔ لوگوں نے شبہہ ظاہر کیا کہ یہ حرکت حکیم احسن اللہ خاں کی ہوسکتی ہے چناں چہ احسن اللہ خاں کا سامان لوٹ لیا گیا۔ گھر کو آگ لگا دی گئی۔

بادشاہ کی نظرِ کرم ان پر بے پناہ تھی اس لیے انھوں نے بادشاہ کے دامن میں پناہ لی اور اس طرح جان بچی۔ عبداللطیف لکھتا ہے:

''ناگاہ بارود خانے میں ایک پتھر آ گرا اور اس سے آگ لگ گئی اور اس (حادثے نے) پانسو بیس بارود بنانے والوں کو ایسا جلا ڈالا کہ ان کی روح دنیا سے پرواز کر گئی۔ بدکردار لشکریوں نے یہ حرکت عمدۃ الحکما حکیم احسن اللہ خاں کی طرف منسوب کی، انھیں ملامت کی اور ان کے گھر اور اسباب کو لوٹ لیا، بادشاہ کی حمایت سے ان کی جان بچی۔ بادشاہ نے فرمایا عمدۃ الحکما ہمارے دشمن کا دشمن ہے۔''[۳۶]

اس واقعے کا ذکر بالکل اسی طرح جیون لال اور گوری شنکر نے بھی کیا ہے۔ گوری شنکر کے بیان سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس موقعے پر نہ صرف یہ کہ زینت محل کے بارے میں بھی شبہہ ظاہر کیا گیا تھا بلکہ بادشاہ کی جان بھی خطرے میں پڑ گئی تھی:

''دیروز بعد تاخت و تاراج کرنے مکان حکیم احسن اللہ کے سپاہ تلنگہ سواروں نے مکان حکیم مذکور کو آتش دی کہ تمام مکان سوخت ہوا اور اب تک اس کا مکان جل رہا ہے اور اسباب بھی لوٹ کر چلے جاتے ہیں اور حکیم کو قلعے میں لے جا کر رات سے قید کر رکھا ہے۔ حکیم، بادشاہ کے پاس تھا (سپاہ نے) بادشاہ سے کہا کہ حکیم کو ہم کو دے دو ورنہ تمھارا خون اور تمھارے شہزادوں کا اور محل میں جا کر قتل کریں گے... اور زینت محل کی طرف بھی اشتباہِ غالب ہے... زینت محل کا مکان کہ اس قرب و جوار میں تھا بادشاہ کے حکم کے بموجب اس کی نگہداشت ہوئی ورنہ اس کی لوٹ کا بھی ارادہ تھا... اور باروت خانے میں جو آگ لگی تھی دیروز... ایک اتفاق سے ہی یہ امر ہوا ہے ورنہ کارسازی حکیم مذکور کو دخل نہیں ہے۔''[۳۷]

نیشنل آرکائوز میں محفوظ Mutiny Papers سے، جن کی بنیاد پر اس باب میں زیادہ تر بحث کی جا رہی ہے، یہ حقیقت بہت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں، زینت محل اور الٰہی بخش انگریزوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ چناں چہ تراب علی جاسوس ایک جگہ لکھتا ہے:

''اب التماس کمترین، کہ منجملہ سلاطین عظام، مرزا الٰہی بخش صاحب قدیم خیر طلب سرکار ہیں اور منشاے زینت محل صاحبہ یہی ہے کہ کسی طرح انتظام سرکار کا ہو جائے چناں چہ صرف اس ضرورت کو مرزا الٰہی بخش سے صفائی کی ہے اور مشورہ اپنا ہے کہ کوئی صورت نکالنا چاہیے۔ اگر ان مدارجات سے کہ جن کا انصرام ان سے ممکن ہو تحریر فرمادیں تو کوئی صورتِ ملاقات اور محرمیتِ راز بیگم صاحبہ اور مرزا الٰہی بخش سے کری جائے اور جو حکیم صاحب سے ممکن ہو ان کو بھی دریغ نہیں ۳۸۔''

بہادر شاہ ظفر کی طبیعت میں مروّت اور رواداری حد سے زیادہ تھی، اس لیے وہ معاملہ فہمی سے کام نہیں لے پاتے تھے اور اکثر جذبات کے تابع رہتے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں سے انھیں بے پناہ عقیدت بھی تھی اور محبت بھی اس لیے وہ کسی بھی قیمت پر ان کی وفاداری پر شک کرنے کو تیار نہیں تھے اور نہ ایسی کوئی بات وہ سننا چاہتے تھے، اسی لیے انھوں نے خود اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حکیم احسن اللہ خاں کی جان بچائی تھی۔ چناں چہ حکیم احسن اللہ خاں کی جانب باغی سپاہ کا جو رویہ تھا، جب وہ اس سے بہت دل برداشتہ ہو گئے تو انھوں نے افسرانِ فوج کے نام یہ حکم نامہ جاری کیا:

''حکم نامہ بنامِ افسرانِ فوج

حکم حضورِ والا کا یہ ہے کہ ایک تو امر یہ ہے کہ جس طور سے سپاہ کی خوشی ہوئی اس طور پر خوشی میں نے کی اور اپنی جان کا دریغ نہ کیا اس واسطے کہ یہ جو فوج سے میں نے اقرار کیا کہ تم میرے بیٹا اور بیٹی کی جاے ہو... خواہ بچہ ہوتا ہے اور ضد کرتا ہے تو اس کی ضد اٹھائی جاتی ہے اس واسطے میں نے تمھاری ضد اٹھائی اور جس طرح تمھاری خوشی تھی وہ کیا۔ مگر افسوس ہے تم نے میری جان کا دریغ نہ کیا اور اس ضعیفی کی طرف خیال نہ کیا۔ تو چاہیے اب یہ ہے کہ میری ضعیفی کی طرف خیال کرنا چاہیے کہ میرا حال کیا ہوا جاتا ہے ایک ایک لمحے میں کس واسطے (کہ) میرا مزاج حکیم احسن اللہ کے ہاتھ میں ہے اور تھا۔ وہ ہر وقت میرے مزاج کی خبر لیتا رہتا تھا تو اب میرے مزاج کی خبر لینے والا بجز خدا کے

اور کوئی نہیں ہے۔ لحہ لحہ میرے مزاج کا عجیب حال ہوا جاتا ہے۔ اب سب صاحبوں کو، سرداران و سپاہیوں کو چاہیے کہ جس طرح میں نے تمھاری خوشی کی ہے اسی طرح پر تم میری خوشی کرو، حکیم احسن کے اوپر سے گارد اٹھالینی چاہیے، رہائی دینی چاہیے اور نبض میری دیکھ جایا کرے اور تم لوگوں کو جو دشمن بہکاتے ہیں، ناحق، تو اسے خیال نہ کرنا چاہیے اور جو شخص یہ کہے کہ ایسا ہے تو اس سے کہو کہ میری چٹھی پکڑ کر لاؤ ہمارے پاس، جس میں ہم کو یہ معلوم ہو کہ یہ دشمن ہمارا ہے، اس کے بموجب سزا ہم آپ دیں گے۔ اور یہ مال اسباب جو لٹا ہے سو بادشاہی لٹا۔ چاہیے کہ تحقیق کر کے سب اسباب حضور میں داخل ہو اور جن کی شرارت سے لٹا ہے ان کو مطابق گناہ کے کورٹ کی تجویز سے سزا ملے اگر یہ منظور نہیں ہے تو ہم کو خواجہ صاحب میں پہنچا دو، ساتھ حفاظت کے۔ میں وہاں پہنچ کر مجاوری کروں گا اور بیٹھا رہوں گا۔ اور یہ بھی نہیں ہوگا تو میں یہاں سے اُٹھ کھڑا ہوں گا جس سے روکا جائے وہ مجھے روک لے۔ کس واسطے کہ ان کے ہاتھ سے قتل نہ ہوا تمھارے ہاتھ ہوا۔ اور رعیت میں جو ظلم ہو رہا ہے رعیت پر نہیں ہے میرے اوپر ہے۔ چاہیے سب کو اس کا بندوبست کریں اور نہیں تو مجھ کو جواب دیں میں ہیرا کھا کے سو رہوں گا اور ایک صندوقچہ میرے حضور والا کا بُرد و غارت (کذا) اسباب حکیم احسن اللہ خاں جاتا رہا جو کوئی تاریخ ۱۶ ذالحجہ سے کاغذ لکھا ہوا اُس میں میرا ہوگا جائز نہ ہوگا[۳۹]۔"

بغاوت کے آخری دنوں میں انگریزوں کی فتح سے قبل ہی تحریک تقریباً دم توڑ چکی تھی۔ خزانے میں روپیا ختم ہو چکا تھا اور سپاہی تحریک کے مقاصد کو چھوڑ کر اپنی اپنی تنخواہوں کی فکر میں لگ گئے تھے۔ ستمبر کے مہینے میں ابتدا ہی سے زوال کے آثار صاف نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ چناں چہ گوری شنکر ۲ ستمبر کو لکھتا ہے:

"دیروز تقسیم تنخواہ پر قلعے میں بڑا دنگا فساد ہوا یہاں تک کہ دو کمپنی نے خاص محل بھی گھیر لیا۔ بادشاہ فوراً بہ استماع خبر محل سے برآمد ہوئے۔ صوبے داروں نے تنخواہوں کے واسطے عرض کیا بادشاہ نے فرمایا کہ نہ

ہم نے تم کو بلایا اور نہ ہم کو تمھاری ایسی غرض ہے اور نہ میرے پاس
روپیا ہے کہ تم کو دوں غرض بدیر قیل وقال ہوتی رہی[۴۰]۔''

تاہم اب بہادر شاہ ظفر کسی بھی قیمت پر اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھے کہ انگریز آ کر دہلی پر قبضہ کرلیں اور انھیں اور ان کے خاندان کو پھانسی دے دیں۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے اور فوج کی تنخواہ کی ادائیگی کے لیے اپنا ساز و سامان بھی الگ کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ بقول جیون لال:

''افسروں نے بار بار تنخواہوں کی ادائیگی کا انتظام کرنے کے لیے زور
دیا اور دھمکی دی کہ اگر کچھ انتظام نہ ہوا تو ہم شہر کو لوٹ لیں گے بادشاہ
نے جواب دیا کہ لوٹنے کی ضرورت نہیں میں اپنے گھوڑے، ہاتھیوں
اور شاہی زیورات کو فروخت کردوں گا اور فوج کی تنخواہ ادا کردوں گا۔
اگر میں ایسا نہ کروں تو تم سب کے سب شہر چھوڑ کے چلے جاؤ اس لیے
کہ میں نے تم کو بلایا نہیں تھا تم اپنی خوشی سے آئے تھے[۴۱]۔''

اگلے روز یہ خبر پہنچی کہ میرٹھ میں انگریزی راج دوبارہ قائم ہو گیا ہے اور علی گڑھ پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا ہے[۴۲]۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا، حالات نازک صورت اختیار کرتے جارہے تھے۔ ۴ر ستمبر کی رپورٹ ہے کہ ''نصیر آباد کی فوج نے رات کو بادشاہ کو تنخواہ کے متعلق سخت رنج پہنچایا جس پر بادشاہ نے اپنے تمام چاندی کے ظروف ان کے حوالے کردیے اور کہا کہ انھیں بیچ کر جو کچھ ہاتھ آئے، اُسے آپس میں تقسیم کرلو[۴۳]۔''

اس کے ساتھ ہی قلعے کی سیاست نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تک انگریزوں کو شکست دینے کے لیے بہادر شاہ ظفر اپنا مال و دولت ہی لٹا رہے تھے لیکن اب انھوں نے اس جنگ کو جیتنے کے لیے اقتدار کی بازی بھی لگادی۔ چناں چہ جب باغی فوجوں سے کچھ کام بنتا نظر نہیں آیا تو رجواڑوں سے رجوع کیا گیا اور انھیں اس بات کی دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس جنگ میں بادشاہ کا ساتھ دیں گے تو بادشاہ اپنے شاہی اختیارات بھی انھیں سونپ دیں گے۔ اس سلسلے میں جیون لال رقم طراز ہے:

''جے پور، بیکانیر اور الور کے راجگان کے نام بادشاہ کی دستخطی چٹھیاں
بھیجی گئی ہیں جن میں لکھا گیا تھا کہ مجھے فوج کی ضرورت ہے اور میں

انگریزوں کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہوں لیکن چوں کہ اس وقت میرے پاس سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے قابلِ اعتماد آدمی موجود نہیں ہیں اس لیے میں ریاستوں کی ایک مجلس بنا دینا چاہتا ہوں اگر وہ ریاستیں جن کے نام خط بھیجے جا رہے ہیں اس غرض کے لیے مجلس بنالیں گی تو میں نہایت خوشی سے اپنے شاہی اختیارات ان کے ہاتھ میں دے دوں گا[۴۴]۔"

بادشاہی کیمپ میں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی اور ادھر انگریز اپنے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ گوری شنکر کا آخری خط جو نیشنل آرکائوز میں ملتا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ اس نے شہر دہلی کی ساری صورتِ حال انگریزوں پر واضح کر دی تھی اور انھی معلومات کی بنیاد پر انگریزوں نے شہر پر ایک بھرپور اور کامیاب حملہ کیا۔ گوری شنکر نے یہ خط بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جس کا مضمون حسبِ ذیل ہے:

"واضح ہوا ہے کہ آپ میرے سے تین سوال کا جواب طلب کرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اندرونِ شہر کس کس مقام پر سامانِ جنگ کیا ہے اندرونِ قلعہ کس جگہ جمعیت واسطے لڑائی کے ہے یا نہیں اور اضرابِ توپ کہاں لگائی گئی ہیں۔ دوم یہ کہ فوج سوار و سپاہ کہاں کہاں جمعیت رکھتی ہے۔ سوم یہ کہ کابلی دروازے سے تا اندرونِ شہر چار پُل ہیں، ان میں سے کوئی شکستہ ہوا یا نہیں۔ سو اب جواب ہر ایک کا مفصل لکھا جاتا ہے۔ اوّل سوال کا جواب یہ ہے کہ سامانِ جنگ جملہ تیرہ دروازہ ہائے شہر پر ہے اِس میں سے خصوصیت سے کشمیری دروازہ و کابلی دروازہ و اجمیری دروازہ۔ چناں چہ کشمیری دروازہ و (کذا) دروازہ و بروج متعلقہ اس کے و کابلی دروازہ صدمات (کذا) سرکاری سے توپ ان کی مسدود ہوگئی بلکہ برج سیاہ منہدم ہو گیا اور شہر پناہ اس طرف سے تا گرجا شکست ہوگئی اور کابلی دروازے کا بالکل تیغہ ہے اور لال دروازہ بند اور کھڑکی فراش خانہ بالکل مسدود۔ باقی رہا اجمیری دروازہ اس پر زیادہ سامانِ جنگ ہے۔ اتواپ مقدار دروازہ ضربِ مدرسہ غازی الدین لگائی ہوئی ہیں اور ماوری دروازہ ہائے مذکور اور کسی جگہ سامان

جنگ نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر روز خبرِ حملہ لشکرِ سرکار کی جو گرم پائی گئی دو توپ جستی بر سڑک لاہوری دروازہ و بر مکان کوتوال اور ایک توپ بر کوٹھی لالہ ہرنرائن بر نہر سعادت خاں واقع ہے اور سڑک سے داہنی طرف لگا دی ہے۔ مگر اب وہ اتواپ اٹھا کر لے گئے اور لاہوری دروازہ اور کشمیری دروازہ (ہا) ئے مابین جو راہ آمد و رفت ہے ان پر دو ...صلابت کوچہ بنی ہوئی ہیں ان کے اوپر دمامہ واسطے لگانے اتواپ کے بنایا ہے ...علیٰ ہذا القیاس دیوارِ شکستہ شہر پناہ کا ہے اور یہی حال ہے اور اندرون قلعہ جمیعت پلٹن دو کی ہے۔ منجملہ اس کے ایک سلیم گڑھ اور ایک قلعے میں اور ساری پلٹن دو سوار رجمنٹ بہم اردلی شہزادہ قلعے میں جمیعت رکھتے ہیں اور تین ضرب توپ جستی آہنی دیوانِ عام میں اور ایک ضرب دروازہ دہلی اور ایک لاہوری قلعے کی (کذا) دروازہ رکھی ہے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جمیعت سوار و پیادوں کی ایسا مقام یا کوئی کوچہ و بازار شہر میں باقی نہیں ہے جہاں فوج نہیں ہے۔ باقی رہا (کذا) قلت و کثرت سواروں کا حال لکھا جاتا ہے۔ کشمیری دروازہ پر کوٹھی کرنل جیمس اسکر صاحب موجودہ ایک پلٹن جلیسر، اور ایک پلٹن بریلی اور کابلی اور (بدرو) دروازے کے درمیان میں (حسن) پلٹن کی کمپنی میں ...اور نگم بودھ کی طرف ایک پلٹن اور لاہوری دروازے ہیں (کذا) واجمیری دروازہ مدرسہ نواب غازی الدین خاں ایک پلٹن (کذا) بازار تین حوض قاضی اور بازار سیتارام و محلہ املی ترکمان دروازہ تین پلٹن سو تین اور ...فروکش ہیں اور دہلی دروازے کے درمیان بازار ...اور دریا گنج میں پانچ پلٹن ... چاندنی چوک میں سوارانِ ہندوستان اور رسالہ سوم متعین ہیں۔ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جس قدر پل یا نہر متعلق کابلی دروازہ کشمیری دروازہ شہر واقع ہیں تا ایندم صحیح سلامت ہیں۔''

اسی خط کے آخر میں گوری شنکر لکھتا ہے:

''اور واضح ہووے کہ راقم کی کارکردگی منظور ہوئی ہووے ساٹھ قطعہ

کھیت عنایت ہوں اگر ایک صرف فدوی کے واسطے عنایت کریں گے تو
فدوی نہیں لے گا[۴۵]۔"

اہلِ شہر رعیت میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں اپنے بادشاہ سے عقیدت اور محبت تھی اور وہ بادشاہ کو خدا کا سایہ تصور کرتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے ان کے بادشاہ کی حیثیت کیا رہ گئی تھی، اس بات کی عام لوگوں کو نہ تو کچھ خبر تھی اور نہ اس سے انھیں کوئی سروکار تھا۔ انقلابی فوجوں میں نظم ونسق کی کمی اور روپے کی قلت کی وجہ سے کچھ لوگ ساتھ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کچھ لوگ اتنے دنوں میں جنگ میں مرے بھی تھے۔ اب آخری حل یہی رہ گیا تھا کہ شہر کی حفاظت کے لیے ہر فرد و بشر کمر بستہ ہو جائے۔ جس طرح ملک کی تمام طاقتوں کو ایک مرکز پر لانے کے لیے دہلی اور لال قلعے کا رخ کیا گیا تھا اسی طرح اب پوری دہلی کو ایک مرکز پر لانے لیے فوجی اور شہری ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر جدو جہد میں حصہ لیں بادشاہ خود اٹھے۔ چناں چہ ۱۲ر ستمبر کے روز حسبِ ذیل منادی شہر میں کرائی گئی:

"بوقتِ شب شہر میں منادی ہوئی کہ بادشاہ سلامت سوار ہوں گے
مناسب ہے کہ ہنود و مسلمان، ہمراہ خضر واسطے جہاد کے ساتھ ہوویں
چناں چہ معاً دس بارہ ہزار آدمی شہر کا مسلح قلعے میں گیا[۴۶]۔"

جیون لال نے بھی اس واقعے کا ذکر اس انداز سے کیا ہے:

"منادی کرادی گئی کہ بادشاہ بہ نفسِ نفیس آج رات کو انگریزوں پر حملے کی کمان کریں گے اور انھیں تباہ کر دیں گے اور تمام شہر کو دعوت دی گئی کہ وہ بھی انگریزی لشکر پر حملے میں شریک ہوں اور انگریزوں سے لڑیں۔ اعلان میں ہندو اور مسلمان دونوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس کام کے لیے حلف اٹھاویں[۴۷]۔"

بالآخر ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کی فوجیں کچھ ایسے مقامات سے جہاں فصیل شکستہ ہو گئی تھی، شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ ۱۴ر ستمبر سے ۱۹ر ستمبر تک پانچ دن لگاتار شہر میں جنگ ہوتی رہی۔ ۱۴ر ستمبر کو انگریزی فوجیں کوتوالی اور جامع مسجد تک پہنچ گئیں۔ باغیوں نے جامع مسجد میں پناہ لی اور وہیں سے مدافعت کرتے رہے۔ انگریزوں کی پیش قدمی کو عارضی طور پر روک دیا گیا اور وہ کشمیری دروازے کی طرف واپس چلے گئے[۴۸]۔

غلام حسین کے قول کے مطابق بادشاہ خود سوار ہوکر لال ڈگی پر تشریف لائے اور تمام افوج و رعایا جمع ہوئی لیکن انگریزوں کی گولیاں لال ڈگی تک پہنچتی تھیں اس لیے افسران نے عرض کیا کہ حضور کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے ایسا نہ ہو کہ حضور کو کچھ صدمہ پہنچے۔ بادشاہ ان لوگوں کے کہنے سے قلعے میں چلے آئے[۴۹]۔

اس دوران ۱۷ر اور ۱۸ر ستمبر کو شہر میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، ہر طرف گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ باغی سپاہیوں میں اب لڑنے کا دم باقی نہیں رہا تھا، چناں چہ ۱۹ر ستمبر کو جو ہفتے کا دن تھا، بادشاہ نے قلعہ چھوڑ دیا اور بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ سلطان جی چلے گئے۔ غلام حسین خاں اس وقت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قلعہ اور شہر کے لوگ ننگے پانو ننگے سر شہر سے نکلے اور جس کا جدھر منہ اُٹھا چل دیا۔ کوئی قدم شریف کی طرف بھاگا، کوئی پہاڑ گنج چل دیا، کوئی جے سنگھ پورہ۔ اکثر درگاہ سلطان جی صاحب اور روشن چراغ دہلی درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین... وغیرہ[۵۰]۔''

غالب نے 'دستنبو' میں اس الم ناک حادثے کی تصویر کشی بڑے عبرت ناک انداز میں کی ہے:

> ''دو تین دن تک کشمیری دروازے تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ، یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے... مجھ مردہ دل کا خاک کدہ وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ گلی کا دروازہ بند کرلیا گیا لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

انگریزوں کی فتح اور مظالم

میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی

جاتی ہیں۔

اس غصّے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فق ہوگئے بے شمار مرد عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت بھی ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ شہر کے باہر چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے ان میں پناہ گزین ہوگئے[۵۱]۔''

کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے قلعہ چھوڑنے سے قبل بخت خاں نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ لکھنؤ بھاگ چلیں:

''جنرل بخت خاں تھوڑی سے فوج لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بہ منّت درخواست کی کہ حضور میرے ساتھ لکھنؤ بھاگ چلیں۔ انھوں نے منتشر افواج کو جمع کرنے اور شہر کے باہر انگریزی افواج کا مقابلہ کرنے کی غرض سے اپنی خدمات پیش کیں مگر بوڑھے بادشاہ نے انکار کر دیا[۵۲]۔''

لیکن بخت خاں کے معروضات کے مقابلے میں مرزا الٰہی بخش کا یہ استدلال بہادر شاہ کے لیے زیادہ قابلِ قبول ثابت ہوا:

''گرمی کا موسم ہے، برسات آگئی ہے۔ حضور کی ضعیفی اور ناتوانی کا زمانہ ہے، گھر سے باہر نکل کر مسافرت میں امن ہو تب بھی گھر کا سا آرام میسر آنا محال ہوتا ہے۔ اور لڑائی بھڑائی کی حالت میں تو لازمی طور سے بڑی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ چھوٹے چھوٹے شہزادوں، شہزادیوں اور پردہ نشین بیگمات کو لیے کہاں پھریں گے لہٰذا میری گزارش تو یہی ہے کہ آپ باغیوں کے ساتھ تشریف نہ لے جائیں۔ میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات کی صفائی کرادوں گا اور آپ پر اور آپ کی اولاد پر ایک حرف نہ آنے دوں گا، سلطنت کا نظام جو کچھ ہو، آپ کی پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں جائے گی۔

مرزا الٰہی بخش کی تقریر سن کر بادشاہ چپ ہوگئے۔ کچھ جواب نہ دیا البتہ ایک خواجہ سرا نے عرض کیا کہ حضور صاحب عالم بہادر تو انگریزوں سے

ملے ہوئے ہیں، آپ بخت خاں بہادر کی گزارش پر توجہ فرمایئے، ان لوگوں کے کہنے میں نہ آیئے۔ مرنا اور تکلیف اٹھانا تو ہر زندگی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ تو بادشاہ نے فرمایا میں دونوں باتوں پر غور کر کے کل جواب دوں گا[۵۳]۔''

۲۱ر ستمبر کو میجر ہڈسن نے ہمایوں کے مقبرے سے بادشاہ کو اس شرط پر حراست میں لے لیا کہ اگر بادشاہ بہ خوشی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں گے تو ان کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔ میجر ہڈسن کی جانب سے بادشاہ کی جاں بخشی کی پیش کش خود انگریز افسران کے درمیان ایک متنازعہ معاملہ بن گیا۔ چناں چہ ۳۰ر اکتوبر کو ساندرس (کمشنر و ایجنٹ شمال مغربی صوبہ جات) نے میجر ہڈسن سے اس اقدام کی وضاحت چاہی کہ انھوں نے کس کی ہدایت کے تحت بادشاہ کی جاں بخشی کا وعدہ کیا۔ ساندرس لکھتا ہے:

''میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ اس معاملے کی وضاحت کریں کہ جب آپ نے بادشاہ کی جاں بخشی کی ضمانت دی تو آپ کس کی ہدایت کے تحت کام کر رہے تھے اور ساتھ میں یہ بھی تفصیل سے بیان کیجیے کہ وہ کیا حالات تھے جنھوں نے بادشاہ کو اس بات کی طرف راغب کیا کہ وہ خود کو حکومتِ برطانیہ کے قیدی کی حیثیت سے آپ کے حوالے کر دیں[۵۴]۔''

(انگریزی سے ترجمہ)

ساندرس کے اس خط کا جواب ہڈسن نے انتہائی تفصیل سے دیا۔ ہڈسن کے اسی خط سے جو اس نے ساندرس کے خط کے جواب میں لکھا تھا بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے صحیح حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ہڈسن کا خط اگرچہ طویل ہے لیکن اس کی جزئیات اس اعتبار سے اہم ہیں کہ یہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے تاریخی المیے سے متعلق بھرپور معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ ہڈسن کا پورا خط اس طرح ہے:

''از طرف لیفٹننٹ ڈبلیو. ایس. آر. ہڈسن

بہ ملاحظہ جی. بی. ساندرس صاحب

کمشنر و ایجنٹ شمال مغربی صوبہ جات دہلی

کیمپ دہلی۔ ۲۸ر نومبر ۱۸۵۷ء

جنابِ عالی

۱- آپ کے خط نمبر ۲، مورخہ ۳۰ر اکتوبر کا جواب حاضر ہے۔ میں آپ کو اس امر کی اطلاع دینے کی سعادت حاصل کرتا ہوں کہ بادشاہِ دہلی نے اس (مخصوص) شرط پر خود کو میرے حوالے کیا کہ ایک تو ان کی جاں بخشی کردی جائے اور دوسرے یہ کہ ان کی شان میں کوئی گستاخانہ سلوک نہ کیا جائے۔ میرے نام سے یہ وعدہ مرزا الٰہی بخش کے ذریعے ایک روز قبل بیگم زینت محل اور ان کے والد سے بھی کیا جاچکا تھا اور دوبارہ گرفتاری والے دن مولوی رجب علی نے بھی یہی وعدہ (میری طرف سے) بادشاہ سے کیا۔ بعدازاں بادشاہ کے اصرار پر مجھے بھی بہ زبانِ خود ان الفاظ کو دہرانا پڑا۔

۲- میں نے یہ اقدام میجر جنرل ولسن کی ہدایت کے مطابق کیا تھا جو اس وقت فوج کی کمان کررہے تھے۔

۳- جن حالات کے تحت بادشاہ نے خود کو میرے سپرد کیا وہ درجِ ذیل ہیں:

جب مجھے اندازہ ہوا کہ بادشاہ واقعی باغیوں کے ساتھ فرار ہونے کی غرض سے قلعہ خالی کرچکے ہیں اور فوری طور پر ہماری کوئی فوج ان کا پیچھا کرنے کے لیے نہیں بھیجی جاسکتی، تو میں نے میجر جنرل سے اس بات کی اجازت چاہی کہ بادشاہ کو یا تو کسی نہ کسی طرح فرار ہونے سے روکوں یا انھیں اس بات پر راغب کروں کہ وہ خود کو میرے حوالے کردیں۔

۴- اس غرض سے میں نے مرزا الٰہی بخش کو طلب کیا اور ان کی معرفت زینت محل اور ان کے والد سے سلسلۂ گفت وشنید جاری کیا-- ان لوگوں کے مطالبات شروع میں بہت غیر ضروری قسم کے تھے۔ بیگم (زینت محل) کہتی تھیں کہ ان کے لڑکے جواں بخت کو ولی عہد تسلیم کیا جائے اور اس (جواں بخت) کے لیے تخت شاہی کی وراثت کی ضمانت دی جائے۔ بادشاہ کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کی پینشن بغیر کسی تخفیف کے

جاری کی جائے اور پچھلے پانچ ماہ کی ہنگامہ مئی سے تا حال فوراً ادا کی جائے۔ میں نے انتہائی مشکل کے ساتھ بادشاہ کو ان کے صحیح حالات کا اندازہ کرایا جن میں وہ اس وقت گھرے ہوئے تھے اور جن کی رو سے یہ قطعی ناممکن تھا کہ بادشاہ یا ان کے خاندان کا کوئی فرد اس تخت کو دوبارہ حاصل کر سکے جس کو وہ کھو چکے تھے۔

۵- بہت قیل وقال کے بعد جب ان پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ بادشاہ اور شہزادوں کی نہ صرف آزادی بلکہ زندگی بھی خطرے میں ہے تو میں نے ان (زینت محل) کے لڑکے (جواں بخت) اور ان کے والد (احمد قلی خاں) کی جان کی حفاظت کی ذمے داری لیتے ہوئے بیگم (زینت محل) کو اپنے مقصد کے لیے ہموار کرلیا اور ان سے یہ شرط لے لی کہ وہ بادشاہ کو اپنے ذاتی اثر سے اس بات پر مجبور کریں گی کہ وہ خود کو میرے حوالے کردیں۔ مرزا الٰہی بخش نے اس کے بعد بادشاہ کی سواری کا تعاقب کیا اور قطب کے راستے میں اُن کو جالیا اور اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ درگاہ نظام الدین نزد مقبرہ ہمایوں کو لوٹ چلیں۔ (بادشاہ) وہاں آکر زینت محل سے ملے اور تمام لوگ مقبرہ ہمایوں میں آگئے۔ جس روز دہلی دشمنوں سے خالی ہوئی اس دن شام کو مرزا الٰہی بخش یہ مژدہ لے کر میرے پاس آئے۔ اگلے روز صبح میں نے ان کو دوبارہ بھیجا۔ مولوی رجب علی اور گھوڑسواروں کا ایک مختصر سا دستہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے اپنے پچاس سپاہی اور بھیجے۔

۶- مقبرے کے قریب مولوی رجب علی کی پارٹی پر حملہ ہوا اور چار گھوڑسوار زخمی ہوگئے لیکن یہ ظاہر تھا کہ یہ حملہ بادشاہ کی پارٹی کا نہیں بلکہ کچھ جذباتی قسم کے لوگوں کا تھا، اس لیے میں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ بادشاہ کی گرفتاری میں کسی قسم کے پس و پیش سے کام لیا جائے۔ لہٰذا میں نے رسالدار مان سنگھ کو اٹھارہ جوانوں کے ساتھ مولوی رجب علی کے پاس بھیجا اور یہ حکم دیا کہ اگر بادشاہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جائے تو مجھے فوراً اطلاع دو۔ اور جو شخص بھی مقبرے سے باہر جانے کی

کوشش کرے اسے (گولی) سے اُڑادو۔ میں (خود بھی) موقعے پر موجود رہا لیکن عمارتوں کی آڑ میں ہوگیا تاکہ نظر نہ آسکوں مولوی رجب علی کو ہدایت دے دی گئی تھی کہ وہ بادشاہ کو بتادیں کہ اگر وہ خاموشی سے باہر آکر خود کو حوالے کردیں تو میں (ہڈسن) ان کی حفاظت کا ضامن ہوں لیکن اب اگر انھوں نے مقبرے سے فرار ہونے کا ارادہ کیا تو (یہ سمجھ لیں) کہ (مقبرے کے) دروازے کی کمان میرے ہاتھ میں ہے میں بغیر کسی رحم کے ان کو اور ان کے لواحقین کو گولی ماردوں گا۔

۷- دو تین گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد رسالدار نے آکر اطلاع دی کہ بادشاہ آرہے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش اور مولوی رجب علی بذاتِ خود بادشاہ کی پالکی کے ہمراہ چل رہے تھے۔ بادشاہ کی پالکی کے بالکل پیچھے بیگم (زینت محل) کی پالکی تھی، پھر بادشاہ کے ملازمین اور ان کے پیچھے قلعے اور شہر سے بھاگے ہوئے پناہ گزینوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ پالکیاں رک گئیں اور بادشاہ نے یہ پیغام میرے نام بھیجا کہ وہ (بادشاہ) خود میری زبان سے اپنی جاں بخشی کے الفاظ سننے کے خواہش مند ہیں۔ میں اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر ادھر کی طرف بڑھا لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے اپنے سپاہیوں کو بادشاہ کی پارٹی اور اس مجمعے کے درمیان کھڑا کردیا جو پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ بظاہر ان سب کے ارادے خطرناک معلوم دے رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور پھر فوراً بادشاہ اور بیگم کے قریب پہنچ گیا۔ جو عہد میں نے ان سے کیا تھا اس کی بابت دونوں (بادشاہ اور بیگم) احتجاج اور خوف کا مظاہرہ کررہے تھے کیوں کہ میں نے ان سے یہ شرط لے لی تھی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کریں گے جس کا کہ اس وقت پورا امکان تھا۔ پھر میں نے خاصی بلند آواز میں ایسے کہ سب سن سکیں اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو شخص اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کرے گولی ماردینا۔ جیسے ہی وہ مجمعے سے کچھ اور دور آگئے، میں نے

مرزا الٰہی بخش اور مولوی رجب علی سے بادشاہ کی پالکیوں کے ساتھ ساتھ چلنے کو کہا اور اپنے سپاہیوں کو ہدایت کی کہ وہ بادشاہ کی پالکی کے پیچھے پیچھے چلیں ۔ اِس کے ایک گھنٹے بعد مجھے اس وقت اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملا جب میں نے بادشاہ اور بیگم کو میجر جنرل کے احکام کے مطابق قلعے کے دروازے پر آپ کے حوالے کر دیا ۔ہڈسن ۵۵،،

(انگریزی سے ترجمہ)

اس سلسلے میں میجر ہڈسن کا یہ خط ہی سب سے مستند دستاویز ہوسکتی ہے۔ ہڈسن کے بیان کے مطابق جب اس نے جواں بخت اور بیگم زینت محل کے والد احمد قلی خاں کی زندگی کی ضمانت دے دی تو زینت محل اس پر تیار ہوگئیں کہ وہ بادشاہ کو اپنے ذاتی اثر سے اس پر آمادہ کرلیں گی کہ بادشاہ خود کو ہڈسن کے حوالے کردیں۔ ہڈسن کے خط سے اس بات کا بھی بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس گرفتاری میں دو تین روز لگے اور اس گرفتاری کو عمل میں لانے کے لیے ہڈسن کو پہلے زینت محل کو شیشے میں اتارنا پڑا۔ گویا ہڈسن اور زینت محل کے درمیان گفت وشنید کا آغاز اس روز سے ہوگیا تھا جس روز بادشاہ نے قلعے کو خیر باد کہا تھا۔ نیشنل آرکائوز میں محفوظ ''خارجی محکمے کے سیاسی راز'' نام کی اس فائل میں جس کے حوالے سے یہاں ہڈسن کا خط نقل کیا گیا ہے، ایک خط ہڈسن کی طرف سے فارسی زبان میں زینت محل کے نام بھی ہے۔ یہ خط ہڈسن نے بیگم زینت محل کو ۱۸ر ستمبر کو لکھا تھا جس میں زینت محل کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہڈسن کو بیگم زینت محل، جواں بخت اور احمد قلی خاں کی جاں بخشی اور ان کے مال ومتاع کی حفاظت کا پورا خیال ہے۔ واضح ہو کہ یہ وہ تاریخ ہے جب شہر دہلی میں انگریزوں اور باغیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ جاری ہے اور شکست کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں لیکن بہادر شاہ ظفر جنھوں نے ۱۹ر ستمبر کو قلعے کو خیر باد کہا، ابھی شہر اور لال قلعے میں موجود ہیں۔ گویا زینت محل بیگم نے جو لال قلعے میں نہیں بلکہ غالباً حویلی زینت محل واقع لال کنواں میں مقیم تھیں، انگریزوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ خط کی عبارت حسب ذیل ہے:

''جنابہ بیگم صاحبہ مکرمہ ومعظمہ زینت محل بیگم صاحبہ! جو لوگ فساد میں شریک رہے ہیں، انھیں سزا دینا منظور ہے۔ بظاہر بیگم صاحبہ، اور مرزا جواں بخت اور بیگم صاحبہ کے والد کی جاں بخشی ہے، آپ لوگ اطمینان

کے ساتھ اپنے مکان میں رہیں بعض دریافت طلب امور کے لیے
اپنے معتمد کو روانہ کریں تا کہ بیگم صاحبہ کے مکان کی حفاظت کے لیے
گارد تعینات کی جا سکے ۵۶۔" (فارسی سے ترجمہ)

غالباً یہی وہ خط ہے جس کا تذکرہ ہڈسن نے سانڈرس کے نام اپنے مندرجہ بالا خط کی دفعہ ۵ میں کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعد میں زینت محل بھی بہادر شاہ ظفر کے ساتھ موردِ عتاب ہوئیں لیکن اس کا نام سیاست ہے اور یہ اعلا پیمانے کی وہ سیاست تھی جسے نہ معصوم بہادر شاہ ظفر ہی سمجھ سکتے تھے اور نہ ان کی خوش فہم اور نادان بیگم زینت محل۔ انگریز افسران یہ بات بہ خوبی جانتے تھے کہ مرزا الٰہی بخش وغیرہ کی طرح بیگم زینت محل بھی برٹش حکومت کی خیر خواہ تھیں لیکن گرفتاریاں عمل میں آجانے کے بعد انگریزوں کی بساطِ سیاست پر شاید اب اس مہرے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ انگریز معاملے کی اس نزاکت سے بہ خوبی آگاہ نظر آتے تھے کہ معزول بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی بیگم ہونے کی حیثیت سے بیگم زینت محل کو کبھی بھی عوام کی ہم دردیاں حاصل ہو سکتی ہیں، اس لیے انھیں آزاد چھوڑ دینا کوئی سیاسی دانش مندی نہ ہوگی۔

اگلے روز ہڈسن دوبارہ ہمایوں کے مقبرے گیا اور بغیر کسی شرط کے مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو ایک بیل گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔ ہڈسن کا کہنا ہے کہ اس موقعے پر ایک مسلح گروہ نے انھیں گھیر لیا تھا لیکن اس پر قابو پانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ہڈسن جب شہزادوں کو گرفتار کر کے دہلی کی طرف بڑھا تو مجمع بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب یہ لوگ دہلی دروازے کے قریب پہنچے تو ہڈسن نے تینوں شہزادوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے اتار لیں۔ اس کے بعد ہڈسن نے خود اپنے ہاتھوں سے ان تینوں کو گولی مار دی۔ ہڈسن اس بہیمانہ رویّے کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ وہ اس مجمعے سے خوف زدہ ہو گیا تھا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اور جس کے متعلق اسے یہ خوف تھا کہ کہیں شہزادوں کو رہا کرا کے نہ لے جائے لہٰذا اسے اپنے اور اپنے سپاہیوں کے تحفظ کے لیے یہ وحشت ناک قدم اٹھانا پڑا۔ لیکن یہ بات اپنے آپ میں بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ ہڈسن کو ہمایوں کے مقبرے سے لے کر دہلی دروازے تک تو کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا اور جب وہ بالکل شہر کے پاس پہنچ گیا تو اسے اچانک خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ جب اس سے ایک روز قبل وہ بادشاہ اور بیگم زینت محل کو قید

کر کے لایا تو اسے اس قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا[۵۷]۔

ذکاء اللہ کا خیال ہے کہ ہڈسن پہلے ہی سے شہزادوں کے قتل کا ارادہ کر کے گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بادشاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش نے خبر دی کہ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر بادشاہ کے دو بیٹے اور ایک پوتے بھی مقبرہ ہمایوں میں موجود ہیں جنھوں نے قلعے میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ میجر ہڈسن کا خون اس خبر سے جوش میں آ گیا اور وہ جنرل ولسن سے اجازت لے کر شہزادوں کے قتل کے لیے روانہ ہوا[۵۸]۔''

غلام حسن خاں نے لکھا ہے کہ ہڈسن نے ''تینوں شہزادوں کو کوتوالی کے سامنے کھڑا کر کے گولی سے اُڑا دیا[۵۹]۔'' لیکن ذکاء اللہ کا بیان یہ ہے کہ ''جب وہ مر گئے تو ان کی لاشوں کو لے کر کوتوالی پر آیا اور لاشوں کو ایک رات دن سرِ بازار لٹکائے رکھا[۶۰]۔'' اس کے بعد بیس شہزادوں کو اور پھانسی پر چڑھایا گیا جس کا ذکر سین نے کامن ویلتھ لائبریری کے ایک مخطوطے کی عبارت نقل کرتے ہوئے اس طرح کیا ہے:

> ''میں نے ایک روز دیکھا کہ بیس آدمی قطار میں بیٹھے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ سب شہزادے ہیں ان پر بوائڈ عدالت میں مکاف نے مقدمہ چلایا تھا۔ بوائڈ نے شہزادوں کو مشتبہ قرار دیتے ہوئے اظہارِ خیال کیا کہ کیوں کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے سازشیوں اور باغیوں سے ان کا تعلق قطعی ممکن ہے۔ سب مزایاب ہوئے، سب کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی لاشوں کو چھکڑے میں لدوا کر بھیج دیا گیا[۶۱]۔''

گرفتاری کے بعد بادشاہ کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا تھا، جیسا کسی بہت ہی برے اخلاقی مجرم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کو آہنی سلاخوں میں تو نہیں رکھا گیا لیکن پھر بھی ان کی حالت انتہائی قابلِ رحم اور عبرت ناک تھی۔ جب ہڈسن ہمایوں کے مقبرے سے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے لایا تو لال قلعے کے دروازے پر انھیں سانڈرس کے حوالے تو کر دیا لیکن انھیں زندگی میں دوبارہ لال قلعے میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

حواشی 'اٹھارہ سو ستاون'

۱- The Sepoy Mutiny and Revolt of 1857. pp. 126-27.

۲- ذکاء اللہ دہلوی، ص ۵۶

۳- غدر کے صبح و شام، ص ۵۴

۴- غدر کے صبح و شام، ص ۹۱

۵- (الف) داستانِ غدر، ص ۴۶ تا ۴۷

۶- (الف) غالب نے 'دستنبو' میں اس سال (۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء) کا مادۂ تاریخ 'رستخیز بے جا' نکالا ہے۔ (اُردوے معلّا، غالب نمبر، حصہ دوم، ص ۱۸۳)

(ب) داستانِ غدر، ص ۴۹ تا ۵۰

(ج) مزید تفصیل کے لیے 'غدر کے صبح و شام'، ص ۱۰۰

۷- 'سراج الاخبار'، نمبر ۱، جلد سیزدہم، مملوکہ نیشنل آرکائوز

۸- (الف) Eighteen fiftyseven. pp. 76-77.

(ب) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

☆ داستانِ غدر، ص ۷۶ تا ۷۷

☆ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۱

☆ غدر کے صبح و شام، ص ۶۶

۹- (الف) تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۶۶

(ب) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

M.P.. Collection No.57, File Nos. 539/41. N.A.I.

۱۰- غدر کے صبح و شام، ص ۱۰۰

۱۱- (الف) غدر کے صبح و شام، ص ۱۰۲

(ب) ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۳

۱۲- غدر کے صبح و شام، ص ۱۰۲

۱۳- سراج الاخبار، نمبر ۹، جلد سیزدہم، ۱۶ر مئی ۱۸۵۷ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز۔

۱۴- سراج الاخبار، نمبر ۱۰، ۲۳ر مئی ۱۸۵۷ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز

۱۵- M.P.. Collection No. 30. N.A.I.

۱۶- غدر کے صبح و شام، ص ۱۸

۱۷- M.P.. Collection No. 85. File No. 2. N.A.I.

۱۸- (الف) ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۹

(ب) عبداللطیف نے سکّے کا جو شعر اپنے روزنامچے میں دیا ہے اس کے مصنف کا نام نہیں بتایا لیکن ایامِ 'غدر' کے اس طرح کے کئی سکّے ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں سے دو سکّوں کے متعلق انگریزوں کو یہ شبہ تھا کہ یہ غالب کے کہے ہوئے ہیں اور اسی بنیاد پر غالب انگریزوں کے ہاتھوں بہت دن معتوب رہے۔ غالب کے خطوط میں ان سکّوں کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ گوری شنکر نے، جو 'غدر' کے زمانے میں انگریزوں کی جاسوسی کر رہا تھا، یہ خبر دی کہ ۱۸/ جولائی ۱۸۵۷ء کو غالب نے ایک پرچے میں یہ سکّہ لکھا:

بزر زد سکّۂ کشور ستانی سراج الدیں بہادر شاہ ثانی

لیکن مالک رام کی تحقیق کے مطابق یہ سکّہ ذوق کے شاگرد حافظ ویران کا کہا ہوا ہے جو حافظ ویران کے نام سے صادق الاخبار (دہلی) ۱۳ ذیعقدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۶/ جولائی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں چھپا ہوا موجود ہے جس کا مطلب ہے کہ گوری شنکر کو اس سکّے کی خبر اُڑتی ہوئی دس بارہ دن بعد ملی اور اس نے یہ خبر غالب کے سر تھوپ دی۔ خلیق انجم نے بھی 'غالب اور شاہان تیموریہ' میں سکّے سے متعلق تفصیلی بحث کی ہے اور یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ یہ سکّہ جو عبداللطیف نے اپنے روزنامچے میں کسی شاعر کا ذکر کیے بغیر نقل کیا ہے، شاید غالب کا کہا ہوا ہے۔ اسی طرح معین الدین حسن نے بھی ایک سکّے کا ذکر کیا ہے جو گوری شنکر کے بیان کردہ سکّے کی قدرے ترمیم شدہ شکل معلوم دیتی ہے۔ سکّے کے پہلے مصرعے کے آخر میں 'کشور ستانی' کو 'نصرت طرازی' سے اور دوسرے مصرعے کے آخری میں 'ثانی' کو 'غازی' سے بدل کر یوں کر دیا گیا ہے:

بزر زد سکّۂ نصرت طرازی سراج الدیں بہادر شاہ غازی

جب لکھنؤ میں باغی فوج نے جمع ہو کر واجد علی شاہ کے گیارہ سالہ فرزند برجیس قدر کو اودھ کے تخت پر بٹھایا تو ٹکسال جاری ہوئی اور سکّے پر بہادر شاہ کی ضرب پڑی۔ بعد میں برجیس قدر کی جانب سے بہادر شاہ ظفر کو جو نذر بھیجی گئی اس میں تاج جواہر نگار، ایک سو اشرفی اور پانچ ہزار روپیہ زرِ نقد اور ضربِ سکّہ شامل تھی۔ سکّے میں جو ترمیم نظر آتی ہے اس سے ایک خیال یہ بھی گزرتا ہے کہ حافظ ویران کا جو سکّہ ۱۸۵۷ء کے 'صادق الاخبار' میں چھپا تھا اس سکّے میں ہنگامی حالات کے مطابق ترمیم کر کے شاید 'نصرت طرازی' اور 'غازی' کے الفاظ شامل کر دیے گئے ہوں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

(الف) 'سکّے کا الزام اور اس کی حقیقت' اور 'غالب سے منسوب دوسرا سکّہ' مشمولہ فسانۂ غالب (مالک رام)

(ب) غالب کا سکّہ شعر، مشمولہ 'ذوق و جستجو' (خواجہ احمد فاروقی)

(ج) 'سکّے کا الزام' مشمولہ 'غالب اور شاہانِ تیموریہ' (خلیق انجم)

(د) خدنگِ غدر (معین الدین حسن)

۱۹- غدر کے صبح وشام، ص ۱۱۹ تا ۱۲۰

۲۰- محاصرۂ دہلی کے خطوط، ص ۴۲

۲۱- غدر کے صبح وشام، ص ۱۲۴

۲۲- غدر کے صبح وشام، ص ۱۲۴

۲۳- M.P.. Collection No. 94. File No. 1. N.A.I.

۲۴- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۳۲

۲۵- (الف) ''شہزادوں نے یہ وضع اختیار کرلی کہ مہاجن عزت دارِ شہر کو بہ مدد سپاہیانِ پلٹن، خود جس کے افسر بنے ہوئے ہیں، طلب کر کے قید کر دیا۔ بطور ڈنڈ جس قدر روپیا ہاتھ آیا لے لیا۔ وہ روتا جھینکتا گھر چلا گیا۔ یہاں تیاریِ لباسِ عیش وعشرت میں وہ روپیا صرف ہوا۔''

(خدنگ غدر، معین الدین حسن، ص ۶۱ تا ۶۲)

(ب) انگریزوں کا خیال تھا کہ لال قلعہ جرائم پیشہ لوگوں کی ایک مستقل قیام گاہ ہے۔ چناں چہ ریذیڈنٹ طامس مٹکاف کی بیٹی لیڈی کلائیو بیلی اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھتی ہے:

''غدر کے زمانے تک لال قلعے کی چہار دیواری میں بادشاہ کا مکمل اختیار تھا۔ کوئی بھی جرائم پیشہ یا بدمعاش وہاں جا کر پناہ لے سکتا تھا اور پھر وہ کبھی پکڑا نہیں جا سکتا تھا۔ چناں چہ لال قلعہ چوروں، قاتلوں اور ہر طرح کے مجرموں کی آماجگاہ تھا جو برطانوی حکومت کے لیے مستقل پریشانی اور دردِ سر کا باعث تھا چناں چہ اس طرح کے انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے کہ بادشاہ کی موت کے بعد اس صورتِ حال کو بدل کر رکھ دیا جائے لیکن یہ کام ہمارے لیے غدر نے کر دیا جب ہمارے سپاہی قلعے میں داخل ہوئے تو ہر شخص بھاگ کھڑا ہوا۔ ہزاروں مارے گئے۔''

(The Golden Calm. p. 208)

۲۶- غدر کے صبح وشام، ص ۱۵۲

۲۷- M.P.. Collection No. 43. File No. 24. N.A.I.

۲۸- غدر کے صبح وشام، ص ۱۶۳

۲۹- M.P.. Collection No. 142. File No. 144. N.A.I.

۳۰- M.P.. Collection No. 142. File No. 144. N.A.I.

۳۱- M.P.. Collection No. 120. File No. 103. 144. N.A.I.

۳۲- M.P.. Collection No. 103. File No. 134. N.A.I.

۳۳- M.P.. Collection No. 15. File No. 5. N.A.I.

۳۴- M.P.. Collection No. 21. File No. 9. N.A.I.

۳۵- M.P.. Collection No. 21. File No. 19. N.A.I.

۳۶- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۶۲

۳۷- M.P.. Collection No. 21. File No. 78. N.A.I.

۳۸- M.P.. Collection No. 23-24. N.A.I.

۳۹- M.P.. Collection No. 135. File No. 170. N.A.I.

(ب) نیشنل آرکائوز میں اس خط کی دو کاپیاں ہیں اور دونوں کرم خوردہ ہیں مگر اس طرح کہ دونوں کو ملا کر خط کا پورا متن سامنے آجاتا ہے۔ پہلے خط پر ۱۸ر ذی الحجہ اور دوسرے پر ۲۰ر ذی الحجہ تاریخ پڑی ہوئی ہے۔

۴۰- M.P.. Collection No. 135. File No. 170. N.A.I.

۴۱- غدر کے صبح و شام، ص ۲۳۹

۴۲- غدر کے صبح و شام، ص ۲۴۰

۴۳- غدر کے صبح و شام، ص ۲۴۲

۴۴- غدر کے صبح و شام، ص ۲۴۲

۴۵- M.P.. Collection No. 22. Page No. 1-3. N.A.I.

۴۶- M.P.. Collection No. 15. File No. 20. N.A.I.

۴۷- غدر کے صبح و شام، ص ۲۴۲

۴۸- تاریخِ عروجِ انگشیہ، ص ۵۷۷

۴۹- (الف) نصرت نامۂ گورنمنٹ، ص ۴۲

(ب) گوری شنکر اور جیون لال کا اشارہ بھی غالباً اس واقعے کی طرف تھا۔

(ج) معین الدین حسن نے واقعے کو ذرا دوسرے ڈھنگ سے بیان کیا ہے جس میں بادشاہ کی اہانت کا پہلو بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''سب افسرانِ فوج بادشاہ کے پاس جمع ہو کے آئے۔ عرض کی کہ شہزادے و مجاہدین مفت بیٹھے روٹیاں کھاتے ہیں لڑنے کو نہیں جاتے ہیں آپ حکم دیجیے اور خود تشریف لے چلیے۔ بادشاہ نے منادی کرائی کہ آج ہم خود پہاڑی پر حملہ کریں گے جس کو ہمارا ساتھ دینا ہو مغرب کے وقت سے قلعے کے میدان میں حاضر ہو۔ تمام مجاہدین اور شہر کے آدمی شام کے وقت زیرِ قلعہ میدان میں جمع ہو گئے۔ بادشاہ تختِ ہوادار پر سوار ہو کر دہلی دروازۂ قلعہ سے برآمد ہوئے۔ سب تخت کے ہمراہ ہو لیے۔ رجمنٹوں سے بھی بہت سپاہی آ گئے تھے۔ سواری بادشاہ کی لال ڈگی پر سے زیرِ دیوارِ قلعہ چلی جب لاہوری دروازۂ قلعہ کے روبرو پہنچے بادشاہ

تختِ ہوا دار کو چھوڑ کر دوسرے ہوا دار میں سوار ہو بہ بہانۂ استنجاء اندر قلعے کے تشریف لے گئے ۔ محلوں میں داخل ہوئے تھوڑی دیر بعد یہ مجمع بھی متفرق ہو کے اپنے اپنے مقاموں پر چلے گئے کچھ اور نہیں ہوا۔'' (خدنگ غدر، ص ۷۹)

۵۰- نصرت نامۂ گورنمنٹ، ص ۴۳

۵۱- اردوے معلّا، غالب نمبر، حصہ دوم، ص ۱۹۴

۵۲- (الف) غدر کے صبح و شام، ص ۸۶

(ب) خدنگِ غدر، ص ۸۱

۵۳- دہلی کی جاں کنی، ص ۴۱

(ب) معین الدین حسن نے بھی 'پلاؤ کی رکابی' کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔
(خدنگ غدر، ص ۸۱ تا ۸۲)

(ج) لیڈی کلائیو بیلی کی ڈائری سے پتا چلتا ہے کہ اس کے والد اور دہلی کے ریذیڈنٹ طامس مٹکاف نے قطب میں اپنے لیے 'دل کشا' نام کی ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی جہاں وہ کبھی کبھی اپنے معمولات سے تھک کر آرام کرنے جاتے تھے، اس کوٹھی میں مٹکاف نے ایک عمدہ لائبریری بھی قائم کی تھی۔ یہ کوٹھی بڑی آراستہ و پیراستہ تھی۔ اپنی خوبصورتی کے لیے اتنی مشہور تھی کہ جب ۱۸۵۷ء میں بغاوت شروع ہوئی تو بادشاہِ دہلی نے ایک گارد بھیج کر اس کوٹھی پر قبضہ کرلیا اور سخت احکام جاری کردیے کہ اس کوٹھی کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے اور اس کی مکمل حفاظت کی جائے۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ (قلعے سے فرار ہونے کی صورت میں) وہ اس کوٹھی میں آکر رہیں گے۔ (The Golden Calm. p.148)

۵۴- F.D., Political Secret. Nos. 56-57. N.A.I.

۵۵- F.D., Political Secret. Nos. 56-57. N.A.I.

۵۶- F.D., Political Secret. Nos. 56-57. N.A.I.

۵۷- Eighteen fiftyseven. Pp-100-111

۵۸- تاریخ عروجِ انگلشیہ، ص ۷۲۱

۵۹- نصرت نامۂ گورنمنٹ، ص ۴۳ تا ۴۴

۶۰- تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۷۲۱

۶۱- Eighteen fiftyseven. p. 111.

محاصرۂ دہلی کے خطوط

'محاصرہ غدر دہلی کے خطوط' جیسا کہ خود ان خطوط کے اردو مترجم خواجہ حسن نظامی نے بھی لکھا ہے ان انگریزی خطوط کا ترجمہ ہیں جو دورانِ 'غدر' دہلی ۵۷ء کے محاصرے کے وقت انگریزی افسرانِ فوج نے مسٹر جارج کارنک بارنس کے نام بھیجے تھے۔ مسٹر بارنس اس زمانے میں دریائے ستلج کی مغربی ریاستوں کے کمشنر تھے، ان خطوط کا یہاں پہلے انگریزی متن پیش کیا جارہا ہے جو سپرنٹنڈنٹ پبلشنگ گورنمنٹ آف انڈیا، ۸۔ بسنگر روڈ، کلکتہ نے شائع کیا تھا۔ انگریزی متن کے بعد ان خطوط کا وہ اردو ترجمہ شامل ہے جو خواجہ حسن نظامی کا کیا ہوا ہے۔ 'محاصرۂ دہلی کے خطوط' کے نام سے ترجمہ شدہ خطوط کے بالترتیب چار اڈیشن ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۴۰ء میں شائع ہو چکے تھے۔

اڈیٹر

LETTERS

Written from the Camp before Delhi to GEORGE CARNAC BARNES, C.B. Commissioner of the Cis-Sutlej States, and now lent to the Delhi Fort Museum by his son, SIR GEORGE BARNES, K.C.B.

No. 1.—Letter, dated June 14th, 1857, from General Sir Henry Barnard, Commander-in-Chief, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

Camp [illegible],
June 14, 1857.

My dear Mr Barnes,

Here I am still looking at Delhi hoping [illegible] guns can silence [illegible] ammunition to enable me with [illegible] *reasonable hope* of success to approach nearer and carry the place—but they beat me in weight of metal; so that in fact I have I fear nothing left [illegible] but an attempt at *coup de Main* [illegible] on these *bright nights!*

I can only man 6 guns and these ill served by raw hands.

The brutes come out almost every day and on two occasions I have been able to send them [back] considerably mauled; but I lose men myself and knock them up. In fact ever since the 8th we have had a continued skirmish. They estimate their loss since the 8th at upwards of 2,000; this I doubt not includes the missing.

What you all could mean when you spoke disparagingly of the walls of Delhi I cannot imagine. 24-pounders mounted throughout their bastions with about 7,000 men behind them is not so easily walked into, and as my engineers say they cannot make regular approaches and my artillery that they cannot work the Guns I have I have only one alternative! and that must be tried. If it fails I have no *reserve*, it will be annihilation. Which would be least pernicious to India—to lose time in waiting for reinforcement or the risk of failure!

They are making ready for *another visit* so I must conclude. Give my kind regards to Mrs Barnes.

Yours sincerely,
H. BARNARD

[illegible]

No. [illegible] dated June 17th, 1857, from General Sir Henry Barnard to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

I wish they would send my General to Madras when he was done his campaign here for it will not be quite the position and [illegible] to act as a Brigadier under General Grant [illegible] wrote.

Yours very truly,

H. BARNARD.

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

No. 3.—Letter, dated June 18th, 1857, from General Sir Henry Barnard, Commander-in-Chief, to Colonel Cornet Barnes Commissioner, Cis-Sutlej States.

yours sincerely,

H. H. BARNARD.

No. 4.—Letter, June 19th, 1857, from Hervey Greathed, Political Adviser to the Force before Delhi, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

CAMP NEAR DELHI.

June 19th 1857

[illegible] BARNES,

Mr Richards left for Pattiyalah on Monday and I heard of him on the road. His presence [illegible] allay the alarm among [illegible] and Dak Contractors created by a foray made by a [illegible] on horse from Delhi on Allipore. They appeared to be looking for the Tuhseeldar and carried off the horses of a small party of Pattiyalah Cavalry [illegible] to the Enemy. We shall be able to pass them out in the same way when the Punjab Irregular Cavalry arrives.

I should be glad to place the Rajah of Jheend in charge of Rohtuck, but his force cannot be spared by Sir H. Barnard and without it, it would be useless for him to attempt the charge.

If Pattiyalah has the force to spare and you do not hear of troops moving down from the Punjab on Hissar, I would gladly assent to that District being made over to his temporary care. [illegible] a proper [illegible] application for assistance both from Hansee and Hissar. I should be glad if you acted upon this and if the arrangement is made I will write a *Khureeta*[1] to the Rajah.

The Nawab of Jhujur has I think irretrievably compromised himself by his treachery to the Cause of Peace and we must [illegible] The Nawab of Dadri [illegible] has been forced to [illegible] declaration of his former acts but he has been [illegible] *under guidance*. The other chiefs are doing their best to [illegible] suspicion.

[illegible] with Loharu [illegible] which we [illegible] Delhi could have relied. I [illegible] you letters [illegible] have intercepted Treasure [illegible] assistance [illegible]

No. 5.—Letter, July 12th, 1857, from Brigadier General Neville Chamberlain, Adjutant-General, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

CAMP BEFORE DELHI,

12th July 1857.

1 P.M.

MY DEAR BARNES,

Now that Kurnaul is becoming a Depôt for our reserve ammunition and stores, we ought to have a Detachment of Infantry there, and as not a man can be spared from this Camp, we must as usual look to the Punjab to supply the men. Please place yourself in communication with Lahore on the subject, and if no other men be procurable endeavour to get us 4 Companies of the Sikh Sepoys taken from some corps. Our rear must be kept open and quiet, and to leave our reserve stores insufficiently protected would be a very grave error. This is the first time I have ever asked for *more troops*, and I would not do so now but that we cannot spare a man. On the 9th we lost 270 soldiers *hors-de-combat* including killed, wounded and sick; and as I write this we are all ready to turn out, an attack on all four sides being threatened.

I recommended the selection of Kurnaul for it is within sufficiently easy communication of our camp and too far off the city to be open to a surprise. It is also on our line of communication with Meerut, Saharunpur and Muzufferuggur; and the Nuwab being friendly there is less likelihood of local disturbance. At this season of the year too the Marcumdar[1] is not to be trusted between us and our gunpowder and reserve stores.

We hear that some of the mutineers are using sporting gun caps. Immediate steps should be taken for depriving all shopkeepers and others of all denominations who deal in such articles, from retaining possession of anything in the shape of detonating powder. All should be taken possession of by Government, and a receipt given.

You will have seen that the 4th L. C. are to be disarmed, and that the 10th L. C. are not to come on. As long as you keep

NEVILLE CHAMBERLAIN.

No. 6.— Letter, 19th July, 1857, from Lieutenant Henry Norman, Acting Adjutant-General, to George Cornac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

CAMP [illegible] DELHI.

19 July 1857.

MY DEAR MR. BARNES,

Chamberlain has handed to me your letter of the 17th to reply to one or two points.

For charge of ordnance stores at Kurnaul Captain Knatchbull was appointed. He has remained at Umballah sick, so I have to [illegible] applied for a Deputy Assistant Commissary of Ordnance or a permanent Conductor to be sent for the duty from Europeans. If Captain Knatchbull recovers of course the original order (which was sent to Mr Le Bas to communicate) will hold good.

All officers on private leave were ordered down from Simla on 14 May and the order was repeated shortly after and Captain Becher of our department reported it had been obeyed. I knew of no officer who had disobeyed it, though several obtained sick certificates.

There appears to be now an ample force at Kurnaul.

There is no objection to your asking Brigadier Hartley to send down two officers of the 5th to do duty at Kurnaul if they are wanted there, but if none are available one junior to Lieutenant Chester might with advantage be sent to do duty with the Nusseree Battalion at Saharunpur. We drove the enemy out of Sabzee [illegible] Chamberlain's letter. There were 3 officers yesterday [illegible] Conductor 75th killed, Foreign Wallers 57th Native Infantry [illegible] Regiment 2nd Fusiliers, killed by *coup de soleil*, Lieutenant [illegible] officers, leg amputated Lieutenant Paton, 61st [illegible] wounded. Lieutenant Crichton, Artillery, slightly.

[illegible] Chamberlain's [illegible] there is room in [illegible] to be sent if a

No. 7.—Letter, 29th July, 1857, from Lieut. W. S. R. Hodson, to J. Douglas Forsyth, Deputy Commissioner of Umballa.

CAMP DELHI.

29th July.

My dear Forsyth,

[illegible] comprised in the [illegible] Lady who accompanies [illegible] Hansi. [illegible] to proceed to [illegible] safely, and had [illegible] of all the [illegible] by her extraordinary [illegible], disgusted at [illegible] process, she took the field in person, and ordered [illegible] mounted on a horse and [illegible] and escort, headed a party of horsemen and actually [illegible] against the 75th Foot! The moment she was within [illegible] to deal with, and [illegible] several of their [illegible]. At length she was [illegible] and captured. The General wished at first to let her [illegible] but I begged him not to [illegible] people would go into the city triumphant and make much [illegible] out of her escape from our hands—which she would have represented, of course, as a miraculous interference of Providence—and [illegible] become a sort of Joan D'Arc!

I obtained permission to send her to you to be kept in safety in your jail or wherever you think best, till the business here is over. Will you kindly see to her safe custody? [illegible] to say the Old [illegible] elephant [illegible]

Yours very sincerely,

W. S. R. HODSON.

No. 8 – Letter, 15th August, 1857, from Hervey Greathed, Political Adviser to the Force before Delhi, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States

CAMP BEFORE DELHI,

August 15, 1857.

MY DEAR BARNES,

Maulvi Rajab Alee enjoined me to mention that I was cognizant of the fact of his having written a letter to Hakeem Ahsun Oolah. It was right he should, I considered it could do no harm and might lead the Hakeem to give an insight into the projects of the king and mutineers. The Maulvi says it led to the Hakeem's disgrace, having fallen into the hands of the sepoys who searched his house but that is hardly likely to be true.

The condition of the camp has improved considerably we are well off in all respects and as yet have to be thankful for the health of the troops and the enemy have failed at all points and in every form of tactics. There is no use in deciding upon any course of active operations until the siege train comes up and by that time it will be time to do so. Nepaul Havelock ought to be waited for. Your news tends to produce a speedy dissolution of the mutineers in Oudh. A letter from Agra that 2,500 Nepal troops were to join Captain Lawrence. Drummond suffered for the excesses of the rabble at Agra he trusted them and they were removed in the interest of the station. 3,22,000 of Revenue have been collected in Puteeala and the Meerut people have replenished their coffers. Hebert has gone out with the Guides and to look after the detachment of rebels who have gone to Rohtuck. It was their intention to send out such detachments to raise the country but from one cause and another it was a device of the Hakeem's to weaken the force and [illegible] to betray it into our hands.

I believe you have not carried out the plan of occupying parts of Bol[illegible]ck with Jheend troops you doubtless have good reasons for not doing so — Brigadier Volatile has been superseded at Agra and Colonel Cotton reigns in his stead.

Yours sincerely,

H. H. GREATHED.

No. 9.—Letter, 30th August, 1857, from Hervey Greathed, Political Adviser to the Force before Delhi, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

CAMP

August 30th, 1857.

MY DEAR BARNES,

Le Bas wishes to plant a Tehseeldar at Gohana to collect Revenue. I do not authorize him at once to do so as it might clash with the Jheend Rajah's arrangements but if the Rajah is doing nothing I wish you would tell Le Bas to collect the Revenue as well as he can.

I cannot believe there is anything to fear for Lucknow. Havelock is clearing his rear and flank by routing out the Rebels at Bithoor and Sherajpoor, and I do not suppose he would occupy himself in that way if the salvation of the Lucknow garrison called for an attack on the City at all risks. A detachment from the Agra garrison have had a good affair near Allyghur, they beat some 2000 Rebels put them to flight and 3 to 400 were left on the ground. Gerads is named among the Nabha Cavalry as distinguished. Major Tandy Ensign Marsh and three Privates were killed. A naval Brigade under Captain Peel R.N. is coming up country. A Brigade of Madras Infantry has arrived in Calcutta. Madras troops has occupied Jubbulpore and Panjur.

Yours sincerely,

H. H. GREATHED.

[illegible] the order of Her Majesty's Most Exalted [illegible] Star of India [illegible] Western India.

No. 10.—Letter, 9th September 1857, from Herbert Greathed, Political Adviser to the Force before Delhi, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

[illegible] September [illegible]

My dear [illegible]

[illegible] despatch [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] time a 10 gun battery [illegible]
[illegible] Metcalfe House. It opened with a good deal [illegible]
ing and all [illegible] evening. There was a hot fire upon
it at first and [illegible] Kendrick and Ludlow were [illegible] knocked
[illegible] our loss was [illegible] Lieutenant Pidcock [illegible]
and Lieutenant Bonnerman Belooches were killed and Lieutenant
Budd Artillery wounded, and about thirty men killed and wounded.
Since last evening there have only been three men wounded [illegible]
up to 10 A.M. The practice on the Moree and Cashmeere has been
excellent. 22 mortars were got into position last night and another
heavy gun battery is nearly ready when all are complete there will
be a tremendous fire. My brother Willby[1] is in charge of the left
attack. I have just got a cheery note from him. He writes the
day after tomorrow [illegible] opening of the grand Artillery [illegible]
At the rate Brind has been working his 10 gun [illegible] little
left of the Moree by [illegible]

Yours [illegible]

H. H. GREATHED

[1] [illegible] Willby [illegible]

No. 11.—Letter, 13th September, 1857, from Hervey Greathed, Political Adviser to the Force before Delhi, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

[illegible]

September 13, 1857.

[illegible]

[illegible] the Mooree Bastion is unable to hold heavy guns, but [illegible] rifles are occasionally fired from it in a dodging way. The [illegible] Bastion is effectually silenced and a heap of [illegible] shells prevent any one from living in it. The [illegible] Curtain on the proper right of the Bastion is made to a considerable extent and our sabres are constantly widening it. [illegible] battering battery erected in the Custom House Compound at a distance of only 180 yards from the wall was only opened yesterday afternoon. The construction of this Battery has been attended with much difficulty and has delayed the operations. It was at first intended to erect it in the Koodseea Bagh where it could have been made securely and rapidly. But obstacles were found to intervene between it and the wall which are not down in any map and the ground had to be taken up in front at a distance which laid the working parties open to much fire. It could not be got ready [illegible] afternoon and is now doing its work against the Water Bastion and the curtain but it is a tough business and hot work. Every one regrets the loss of Captain Fagan of the Artillery who was shot through the head soon after the Battery opened. He was [illegible] and could not be prevented from exposing himself [illegible] with half his body above the parapet, taking [illegible] who was shot. The duties are difficult and laborious. The Artillery Officers have been night and day in the trenches for they [illegible] direct fire from the Curtain [illegible] great [illegible] Battery are [illegible] and they keep up a [illegible] firing fire [illegible] our right and [illegible] other

[illegible]

[illegible]

[illegible]

No. 12.—Letter, 16th September, 1857, from Hervey Greathed, Political Adviser to the Force before Delhi, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

Delhi.

September 16th.

My dear Barnes,

I witnessed the assault from the top of Ludlow Castle. I do not think one could stand long the anxiety of the minutes that elapse between the disappearance of the head of the Column and their re-visiting the Breach. The fire from the walls on the party directed against the Water Bastion Breach was so heavy that only two ladders reached the ditch, my brother Willy[1] was wounded on his way from the battery to this breach, the bullet broke the ulna of his right forearm and cut him across the chest. The other[2] brother surmounted and survived all the dangers of the attack and is still thank God full of life and vigour. The assaults of the Cashmeer breach and the blowing in of the Gate were very successful. All this took place in broad daylight. Nicholson's column swept round the Ramparts and reached the Lahore Bastion. He was wounded [illegible] ammunition failed and they fell back on the Cabul Gate. Colonel Campbell's Column piloted by Metcalfe with [illegible] and Lieut. [illegible] officer had been shot down and the Powder Bags remained behind. More were sent up under Tandy and Brownlow of the Engineers. The former was killed and the other wounded. No support came from the Lahore Gate direction and Campbell had to retire, but on [illegible] ammunition, and it was known that Wilson [illegible] brought up [illegible]

[illegible] Reid's flanks. [illegible] Dawes [illegible] Barrack [illegible] Regt. The Barrack Intrenchment very well [illegible] is much improved. The Magazine has been [illegible] Residency [illegible] in possession of the Magazine. All the [illegible] have been evacuated by the Infantry and will be [illegible]. A considerable number of Rebels have been [illegible] Lucknow [illegible] Many escape, but no women, [illegible] Kisleer Singh. It is [illegible] threatened but not molested. Batteries are now opening on Sekingbur and the Palace. I feel that complete success is nearly safe. The total loss killed and wounded on our side will not be [illegible] less than 800. Great fears for Neill.[3] His loss is not to be repaired. Colonel Campbell 52 too is disabled. The full Colonels left are Longfield 8th Jones 61st; Dennis 52nd General Wilson is much knocked up.

Mr Colvin[4] died on the 9th.

Mr Beadon at present Civilian has issued a Government Gazette Extraordinary announcing that he has assumed the Government of the North-West Provinces. Barataria has an Empire in comparison to his dominions.

Yours,

H. H. CREATHED.

[illegible]
[illegible] K.E., attached to the [illegible]
[illegible] commanded [illegible]
[illegible] September [illegible]
[illegible] North-West Provinces
[illegible] October 3 [illegible]

No. 13.—Letter, 11th October, 1857, from Sir John Laurence, Chief Commissioner of the Punjab, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States.

LAHORE.

11th October, 1857.

[illegible]

I send you the 50 rupees [illegible] sent to that poor girl at the Dawk Bungalow. I forget her name. I hope she got safe to her destination. I [illegible] to Sam Lee to send off Rujjub Ali, who in it would have been a pity [illegible] after all his services.

I shall be glad to get Melvill back to the Punjab and will look after his interests.

We are now beginning to breathe after the storm and when I look back I only wonder we are all alive. It is only by God's mercy we have escaped. Assuredly it was more than we could hope that all the Punjab Regiments should [illegible]. I am not comfortable about Hazaroo. [illegible] affairs there, and matters [illegible] as I had hoped. I am now pushing on another corps to Pindee and have to take up [illegible] that which has just left [illegible]. Hazara has been [illegible] and the [illegible] a blow to [illegible]

[illegible]

[illegible] I am [illegible] the new [illegible] Bill proposed for Putiala Native Herald. They should certainly be [illegible] when [illegible] but on the whole [illegible]

Your obedient

JOHN LAWRENCE.

[illegible]

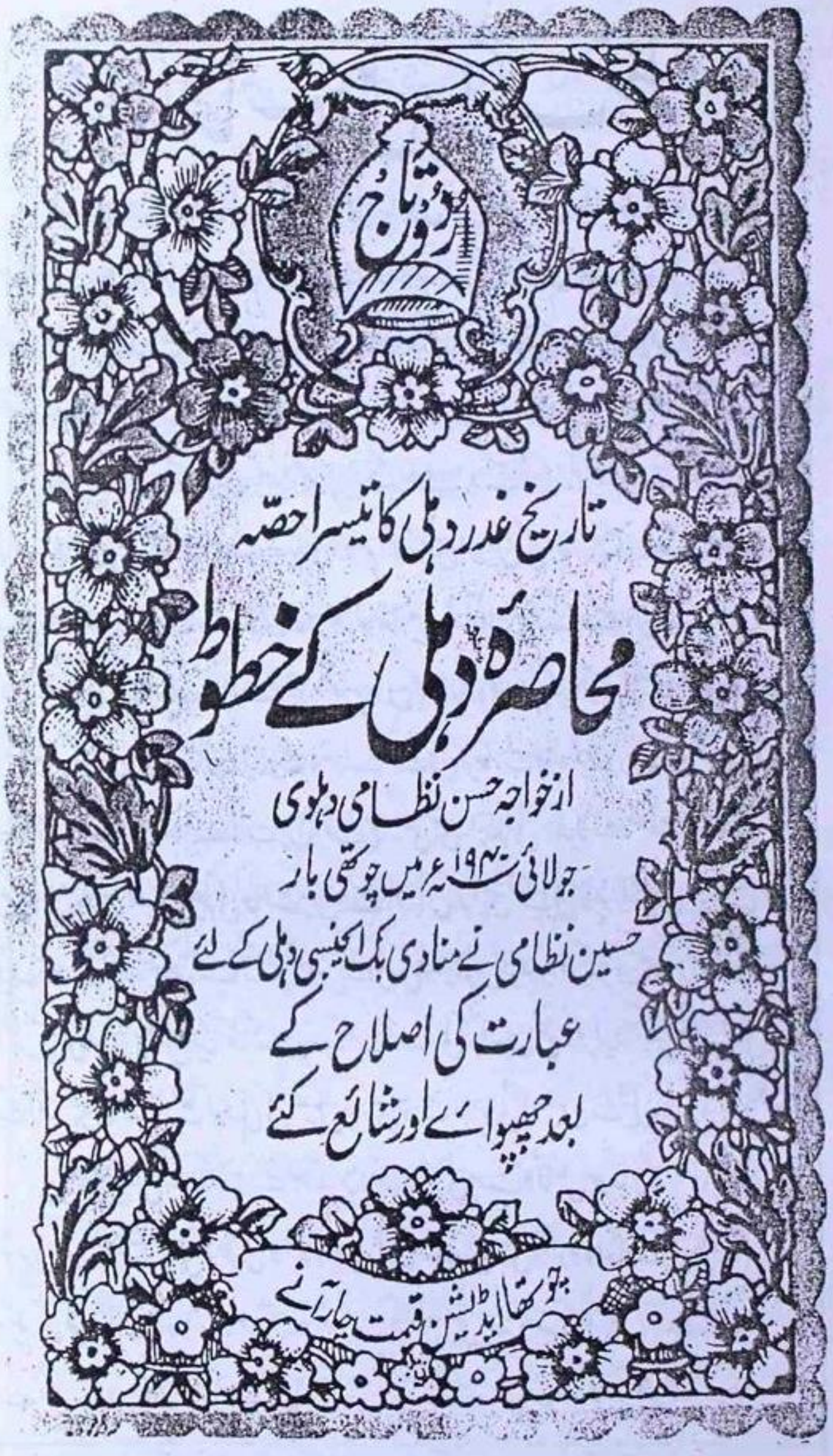
روداد تاج
تاریخ غدر دہلی کا تیسرا حصّہ
محاصرۂ دہلی کے خطوط
از خواجہ حسن نظامی دہلوی
جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں چوتھی بار
حسین نظامی نے منادی بک ایجنسی دہلی کے لئے
عبارت کی اصلاح کے
بعد چھپوائے اور شائع کئے
چوتھا ایڈیشن قیمت چار آنے

خطوط محاصرۂ دہلی پر ایک نظر

اب میں ان خطوط پر ایک نظر ڈالنی چاہتا ہوں۔ ان خطوط میں بظاہر کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی۔ اور غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ان کے اندر کی کچھ باتیں کم کر دی گئی ہیں یعنی اصلی قلمی خطوط میں اس مطبوعہ عبارت کے سوا کچھ اور مضمون بھی ہوگا۔ جو عوام کے قابل نہ سمجھ کر قلم زن کر دیا گیا۔

یہ خط ایک ہولناک وقت کی یادگار ہیں۔ جبکہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے انگریزوں اور ان کی باغی فوجوں کو تہلکہ میں ڈال دیا تھا۔ یہ تہلکہ حکام انگریزی اور ان کی افواج تک محدود نہ تھا بلکہ رعایا پر بھی اس کا اثر پڑا تھا۔ رعیت کے جو افراد غدر میں شریک ہو گئے تھے ان کو تو یہ خوف تھا کہ دیکھیے اگر ہم کامیاب نہ ہوئے اور انگریزوں کا دوبارہ غلبہ ہو گیا تو ہم کو کیسی کیسی سزائیں دیجائیں گی اور جو لوگ شریک بغاوت نہ ہوئے تھے ان کو غارت پیشہ لٹیروں کا ہر وقت خوف لگا رہتا تھا۔ جنہوں نے سارے ملک میں آفت مچا رکھی تھی۔ ابتدائی خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انگریز بھی اس وقت امید و بیم کی حالت میں تھے اور ان کو اپنی فتحیابی کا پورا یقین نہو سکتا تھا۔ ایک خط سے مترشح ہوتا ہے کہ کسی شخص نے دہلی کی فصیلوں کو بودا اور کمزور سمجھ کر محاصرہ کرنیوالی انگریزی فوج پر طعن کیا تھا کہ اس نے اب تک دہلی کو کیوں فتح نہ کر لیا۔ لیکن محاصرہ کی فوج کے افسر ہی جانتے تھے کہ دہلی کی فصیل بودی ثابت نہ ہوئی اور اس نے فیل سے زیادہ توپوں کا مقابلہ کیا

ہر شخص جو ان خطوط کو پڑھے گا انگریز افسروں کی ہمت کا قائل ہو جائیگا۔ انہوں نے کثیر توپوں اور بے شمار باغی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اور ہمت نہ ہاری۔ اگر وہ بغاوت کی عام حالت کو دیکھ کر گھبرا جاتے اور انتظام نہ کرتے تو ایک انگریز بھی ہندوستان میں زندہ نہ بچتا۔ ان خطوط سے انگریزوں کی دلیرانہ خصلت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کمی تعداد، کمی اسلحہ، کمی رسد اور کمی

سے ذرا نہ گھبرائے اور آخر تک مستقل مزاج بنے رہے۔ اور یہی چیز تھی جس نے ان کو آخر کو فتحیاب کر دیا۔

یہ خطوط اس تاریخی نکتہ کو بھی ظاہر کرتے ہیں جو انگریزوں کے دوبارہ قبضۂ ہندوستان کا راز ہیں۔ اور وہ صرف یہی ہے کہ تمام ملک کے انگریز باوجود خط و کتابت کی مشکلات کے ایک دوسرے کے مشورے سے فائدہ اٹھاتے۔ اور ایک دوسرے کی مدد حاصل کرتے تھے چنانچہ محاصرۂ دہلی کے انگریز افسروں نے جو وقتاً فوقتاً مسٹر بارنس کو یہ خطوط بھیجے وہ اس بات کی شہادت ہیں کہ ہر انگریز اپنے خیالات مسٹر بارنس پر ظاہر کرتا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر بارنس کی پوزیشن محاصرہ دہلی کے وقت افواج محاصرہ کو بہت ضروری نظر آئی تھی۔ کیونکہ مسٹر بارنس پر پنجاب کی ریاستوں اور پنجاب کی رعایا کا وفادار رکھنا اور پنجابی ریاستوں سے فوجوں اور سامان کی مدد حاصل کرنا اور محاصرۂ دہلی کی مادی اعانت کرنے کا بوجھ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ محاصرۂ دہلی کا ہر انگریز افسران کو فوجی حالت اور فوجی ضروریات سے آگاہ کرتا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مسٹر بارنس پر محاصرہ کی افواج سے زیادہ ذمہ واری کی مشکلات کا بار تھا۔ اور وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں ایسے لایق ثابت ہوئے کہ ایک طرف مغربی ریاستیں پنجاب کی وفادار رہیں اور دوسری طرف محاصرۂ دہلی کی افواج کو مسلسل مدد ملتی رہی۔

ان خطوط سے ایک تاریخی قصہ پر روشنی پڑتی ہے جو دہلی میں بہت مشہور ہے اور وہ یہ ہے کہ دہلی والے حکیم احسن اللہ خان صاحب پر شبہ کرتے ہیں کہ وہ انگریزی افواج کے قلعہ اور بہادر شاہ کے دربار اور شہر دہلی میں جاسوس تھے مگر ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب پر پورا اعتماد انگریزی افسروں کو نہ تھا اور وہ ان کی خیر خواہی پر شبہ کی نظر رکھتے تھے۔

حکیم صاحب نے دہلی اور رعایا کی بہتری اسی میں سمجھی تھی کہ دوبارہ انگریزی تسلط قائم ہو جائے تاکہ باغی فوجوں کے مظالم ختم ہوں اس واسطے ممکن ہے کہ انہوں نے انگریزی افواج کو کچھ مشورے دئے ہوں۔ مگر وہ بادشاہ [illegible] رہے۔ اور انہوں نے

[illegible] مقدمہ میں بھی ان کی شہادت پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ [illegible]
باتیں کرتے ہیں۔ اور ان کو نہ انگریزوں کی حمایت منظور ہے نہ بہادر شاہ کی۔ باقی غیب کا علم
خدا کو ہے۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے شہر والے کو بدنامی سے بچاؤں۔

سبز پوش عورت۔ مسٹر ہڈسن نے انبالہ کے ڈپٹی کمشنر کو خط لکھتے وقت جس قیدی عورت کا
حوالہ دیا ہے اس کی کیفیت اہل دہلی کے لئے تعجب خیز ہونی چاہئے غدر و بغاوت سے
مجکو اور اہل دہلی کو قطعی اتفاق نہیں ہے اور اس لحاظ سے ہم اس سبز پوش عورت کی ذرا
بھی تعریف نہیں کرنی چاہتے۔ لیکن اس معاملہ میں ایک دوسرا پہلو بھی غور کرنے کا ہو سکتا
ہے اور وہ یہ ہے کہ دہلی کی عورت کیسی بہادر تھی جو ہتھیار باندھ کر میدان جنگ میں
گئی اور انگریزی فوج نے تسلیم کر لیا کہ وہ اکیلی پانچ مرد سپاہیوں کی برابر ہے۔
گو اس عورت کا کام اچھا نہ سمجھا جائے۔ مگر اس کی ذاتی بہادری اور دلیری پر اہل دہلی
فخر کرنے کا حق رکھتے ہیں اور ان کو فخر کرنا چاہئے۔

بہادر شاہ کا مقدمہ اور محاصرۂ دہلی کے اندرونی خطوط وغیرہ بھی شائع ہو گئے
امید ہے کہ ان خطوط کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اکتوبر سنہ ۱۹۱۹

حسن نظامی

ضمیمہ نمبر ۱

جب جنرل سر ہنری ولاک نے کمانڈر انچیف نے جارج کارنک برنس رجو دریائے ستلج کی مغربی ریاستوں کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے کے نام ۱۴ جون ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

از کیمپ بالا کے دہلی۔ مورخہ ۱۴ جون ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر برانس

میں یہاں سے ابھی تک دہلی کی جانب دیکھ رہا ہوں اور ہر گھڑی مجھے یہ امید ہوتی ہے کہ ہماری توپیں قلعہ کی دیواروں کی توپوں کو خاموش کر سکتی اور مجھے اس قابل بنا سکتی ہیں کہ کامیابی کی معقول امید کیساتھ قریب پہنچکر اس مقام پر قبضہ کر لوں۔ لیکن ان (باغیوں) کی توپوں کی زیادتی میری ہمت پست کئے دیتی ہے۔ پس اب (جیسا کہ واقعہ ہے) میرے سامنے (اور مجھے کسی چیز کا خوف نہیں) سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں کہ میں ایک اچانک اور زبردست حملہ کر دوں مگر ان روشن راتوں میں یہ کام آسان نہیں معلوم ہوتا۔

میں صرف چھ توپوں کا انتظام کر سکا ہوں۔ اور ان کے چلانے والے بھی بالکل ناتجربہ کار ہیں۔ یہ (باغی) حیوان آتش بیانہ روز باہر نکلتے ہیں اور دو دفعہ تو میں نے انہیں خاصی کمی کیساتھ واپس بھیجا۔ لیکن میرے سپاہی بھی خسارہ اٹھاتے ہیں۔ اور اس لئے مجھے ان کی بہت کچھ ہمت افزائی کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آٹھویں تاریخ سے لیکر اب تک اوپر تلے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں وہ آٹھویں تاریخ کے بعد سے اپنے نقصانات کا اندازہ دو ہزار سے زیادہ کرتے ہیں لیکن مجھے شک ہے کہ اس میں وہ تعداد شامل نہیں کی گئی جس کا پتہ نہیں لگتا۔

جب آپ تفاریت انیز طریقہ سے دہلی کی فصیلوں کا ذکر کر رہے تھے تو میں نہیں سمجھ سکتا

۱؎ ۱۸ جون ۱۸۵۷ء کے مرحلے کے نیچے ہوئے درج ہے۔ اچانک اور زبردست حملے کے سلسلہ میں اسی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ روشن راتوں سے ۱۸ جون کی راتیں ہیں جنہیں چاند کے شعلوں نے روشن کر دیا ہو۔ ان الفاظ سے چاندنی راتیں نہ سمجھنا چاہئے۔ مترجم۔

[illegible] ہر جگہ سے اب ہمیں کمک پہنچ رہی ہے اور ان کے پیچھے تقریباً ہزار سپاہی بھی موجود ہیں۔ ایسی صورت میں داخلہ آسانی کیساتھ نہیں ہو سکتا۔ اور میرے انجینیر کہتے ہیں کہ ہم باقی ماندہ خندقیں بنا کر قلعہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور میرے توپخانہ والے بھی یہ کہتے ہیں کہ ہم ان توپوں کو جو میرے پاس ہیں نہیں چلا سکتے۔ پس اب میرے پاس ایک تدبیر رہ گئی ہے اور اسے بھی پوری طرح آزما لینا چاہئے۔ اگر اس میں [illegible] بھی ناکامیابی ہوئی تو میرے پاس کوئی محافظ فوج باقی نہ رہے گی اور یہ (گویا) بالکل تباہی کے آثار ہوں گے۔ ہندوستان کے لئے کونسی بات کم مضرت رساں ہے۔ یہ کہ امدادی فوج (کمک) کے انتظار میں تصفیہ اوقات کی جائے یا ناکامی کے خطرہ کو برداشت کیا جائے؟

وہ باغی اپنی دوسری آمد (حملہ) کی تیاریاں کر رہے ہیں اور اس لئے مجھے اپنے مراسلہ کو (جلد) ختم کر دینا چاہئے۔ مسز بارنس سے میرا سلام کہہ دیجئے۔

آپ کا صادق۔ ایچ۔ ایچ۔ برنارڈ

مراسلہ نمبر ۲۔ جسے جنرل سر ہنری برنارڈ نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۷ جون ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

۱۷ جون ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر بارنس

کسی غیر معمولی قسم کے بے حس شخص نے میری برساتی غائب کر دی۔ یہ میرے پاس فقط ایک ہی تھی۔ ہمارے بنگلہ میں دو صندوق ہیں جو معمولی دیودار کی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ان کے اندر ٹین منڈھا ہوا ہے۔ سب سے چھوٹے میں ایک بہت بڑا بھورے رنگ کا (جنٹل) کوٹ (رکھا ہوا) ہے اگر آپ براہ مہربانی بکس کھول کر کوٹ میرے پاس بھیجدیں تو آپ میرے ساتھ بہت بڑی نیکی کریں گے۔

فی الحال ہم زبی کے مقابلے پڑے ہوئے ہیں یہ جیسا کہ کسی نے مذاقاً کہا ہے ہم ابھی تک زبی کے عقب میں ہیں جو دیواریں (فصیلیں) کہ میدانی توپوں کے ذریعہ منہدم کی جانیوالی تھیں ۲۰۰ پونڈ وزنی گولوں کے مقابلہ میں جوں کی توں نہایت مضبوطی سے قائم ہیں ہم محل پر گولہ باری کرتے رہتے ہیں اور ابھی تک کئے جا رہے ہیں۔ رائفلز پلٹن کے ایک گورے نے ایک ہندوستانی سپاہی کو نشانہ بندوق بنایا اور اس کی ۸۴ اشرفیاں بھی چرا لیں مجھے امید ہے کہ انگور باقی عنقریب پک رہے ہیں۔

انہوں نے ہم پر کوئی حملہ نہیں کیا اور اس لئے میرا خیال ہے کہ وہ آج حملہ کرینگے اور پھر ایک اور چپت کھائیں گے۔

ہڈسن کو زکام ہے اور ہلکی سی سوجن بھی ہے لیکن آج کسی قدر افاقہ ہے گریٹ ہیڈ کے صاحبزادے کو بھی ہلکا سا بخار ہو گیا تھا۔ مگر اب حالت بہتر ہے لفٹننٹ مرے کے صاحبزادے کو جو چاندماری کے اسکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ اب گائڈز میں بھرتی کر دیا گیا ہے۔

ایک مہاوت کمسریٹ کے بہترین ہاتھی کو بادشاہ کی خدمت میں تحفہ نذر کرنے کے لئے کل دہلی لیگیا تھا۔ کرزن تمہیں سلام کہتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگ ہماری پوجا کرنے کیلئے ابھی تک نہیں آئے

جنرل ریڈ بہتر ہیں اور اس لئے وہ اب اپنے سفر واپسی پر روانہ ہو جائیں گے۔

میری خواہش ہے کہ وہ لفٹننٹ[1] مرے کو اس مہم کے ختم ہو جانیکے بعد مدراس بھیجدیں اسلئے کہ جنرل گرانٹ کے ماتحت بریگیڈیئر کی پوزیشن میں رہ کر کام کرنا کسی طرح ان کے شایان شان نہوگا

---

[1] اس سے غالباً مراد یہ ہے کہ واقعات کی نشوونما توقعات کے مطابق عمل میں آرہی ہے۔

[2] لفٹننٹ ڈبلیو ایس آر ہڈسن جو بعد میں "ہڈسن آف ہڈسن ہارس" کے نام سے مشہور ہوئے۔

[3] لفٹننٹ دلہوزس گریٹ ہیڈ (اکل انجینیر)

[4] لفٹننٹ اے ڈبلیو مرے (جو ۱۸۵۷ء میں این ایل آئی میں تھے) ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی میں مقتول ہوئے

[5] آنریبل آرکرزن جو کمانڈر انچیف کے فوجی سکریٹری تھے اور جو بعد میں ارل ہوک کے لقب سے ملقب ہوئے۔

[6] جنرل ریڈ وہ صاحب ہیں جو جولائی ۱۸۵۷ء کے دن جنرل برنارڈ کے ہیضہ سے انتقال کر جانے پر کمانڈر انچیف کی حیثیت سے ان کے جانشین مقرر ہوئے

مراسلہ نمبر ۳ جیمز جنرل سر ہنری بارنارڈ کمانڈر انچیف نے چارلس گرفتھ بارنس کے نام

۱۸ر جون ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا

۱۸ر جون ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر بارنس [1]

میں نے ابھی آپ کی چٹھی پڑھی اور اس سے مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ اس لئے کہ آپ نے اس تجویز کو پسند کیا کہ میں اپنی مختصر سی فوج کو لیکر دہلی میں داخل ہونیکا خطرناک تجربہ کروں اس طرح سے کہ میرا کیمپ، ہسپتال، ذخائر، خزانہ، الغرض میری فوج کا سارا سامان بالکل غیر محفوظ حالت میں پڑا رہ جائے۔

مجھے اقرار ہے کہ جو پولٹیکل مشیر میرے ساتھ کام کر رہے ہیں ان کی ترغیب وہی سے متاثر ہو کر میں اچانک اور زبردست حملہ کی تجویز پر رضامند ہو گیا تھا جس میں مذکورہ بالا تمام امور کا خطرہ دامنگیر تھا۔ صرف حسن اتفاق سے یہ تجویز عمل میں آنے سے رک گئی۔ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کا فضل ذکر ہو اسلئے کہ جو کچھ میں نے سنا ہے اور جن اشخاص سے مشورہ کرنا میرے فرض منصبی میں داخل تھا۔ انکی آرا کا خیال کرنیکے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا۔ کہ فتح اتنی ہی مہلک ثابت ہوتی جتنی کہ شکست۔

---

[1] سپاہیوں کی جنگ کی تاریخ مصنفہ کے میں اس مراسلہ کے اقتباسات کئے گئے ہیں اور وہاں غلطی سے یہ لکھدیا گیا ہے کہ یہ ملحقات برنارڈ کی ایک چٹھی سے اخذ کئے گئے ہیں جو انہوں نے سر جان لارنس کو لکھی تھی۔ اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقل لارنس کو بھی بھیجی گئی ہوگی اور بالآخر کاغذوں میں پڑ گئی اور انہیں کوئی ایسی یادداشت ملی جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ وہ کہاں سے دستیاب ہوئی۔

[2] بارڈے گریٹ ہیڈ جو پہلے میرٹھ کے کمشنر تھے اور اب میدانی فوج کے سیاسی مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

[3] ۱۱ر جون کو جنرل برنارڈ کی خدمت میں ایک اطلاع بھیجی گئی تھی جس میں کابلی دروازہ اور لاہوری دروازہ پر فوری حملہ کرنے کی مصلحت پر زور دیا گیا تھا۔ رپورٹ پر چار ماتحت افسروں ادلبرفورس گریٹ ہیڈ میونسپل چینی (انجینیر) اور ہڈسن (محکمہ خفیہ) کے دستخط ثبت تھے۔ موخر الذکر بعد میں ہڈسن آف ہڈسنز ہارس کے نام سے مشہور ہوئے۔

بہت زیادہ غور و تامل کے بعد برنارڈ نے اسکیم کو منظور کر لیا۔ جلد ۱۲ تاریخ کی رات کو تاریکی میں کیا جانے والا تھا۔ لیکن جب مقررہ وقت پہنچی تو معلوم ہوا کہ محوزہ نہر کیلئے جو فوج منتخب کی گئی تھی اس کا ایک اہم حصہ موجود نہیں ہے (بقیہ صفحہ ۳)

[illegible] ہوئی ہو وہ کوئی [illegible] اس [illegible] تھی اور اس دغابازی کے ہوتے ہوئے جس نے ہمارا چاروں طرف [illegible] کر رکھا ہے۔ میرے سامان جنگ کی کیا حالت ہوتی؟ (اگر عام ہلّہ کر دیا جاتا)

اس خیال سے کہ فوجی قانون میرا رہنما ہے (اگرچہ اس شور و شغب کا مقابلہ کرنے کیلئے جو اس بنا پر بلند کیا جائیگا کہ ہم دہلی کے سامنے کیوں بیکار اور معطل پڑے ہوئے ہیں اخلاقی دلیری کی سخت ضرورت ہے) تاہم میں صرف بہترین اغراض حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ ضرب لگانے کے لئے مناسب موقع کا احتیاط کیساتھ مجھے انتظار ہے۔

مسٹر گریٹ ہیڈ نے جو اہم تجویز پیش کی تھی وہ یہ تھی کہ دوآبے پر قبضہ حاصل کر لیا جائے دہلی سے علیگڑھ افواج بھیجی جائیں لیکن اگر میں شہر میں بھی ہوتا تو بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا قلعہ اور سلیم گڈھ ابھی تک میرے پیش نظر ہیں اور شہر پر قابض رہنا اور دو ہزار سے کم سپاہیوں کی مدد سے ان (مقامات) پر حملہ آور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ میں ایک شخص کو بھی علیحدہ نہ کروں۔ حالت یہ ہے کہ دہلی توپوں سے پٹی پڑی ہے اور وہاں وہ سپاہی مقیم ہیں جو اگرچہ کھلے میدان میں چنداں اہمیت نہیں رکھتے تاہم پتھر کی فصیلوں کے پیچھے رہ کر کچھ نہ کچھ کارگزاری بالضرور دکھا سکتے ہیں اور جنہیں بھاری توپوں کے استعمال سے بھی کچھ واقفیت ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ ہفتہ کے دن گولہ باری کی صحت و درستی سے ہمیں نیچا دکھا دیا) پس "انبالہ والی فوج اور تیرہ توپیں رکھنے والی دو پلٹنیں" اسپر کبھی اپنا قبضہ نہیں جما سکتیں اور اس کی موجودہ طاقت کا بہت ہی کم اندازہ کیا گیا ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲) [illegible] اس لئے وہ اپنے ۳۰۰ سپاہیوں کو جو کہ مقررہ مقام پر نہ آ سکے۔ بدستور اس طرح [illegible] کے لئے [illegible] حالت میں مضبوط رہا تھا اور اس لئے [illegible] فوج کو اپنے کوارٹر میں [illegible] کر لے گئے۔

۵۴ نواب لفٹننٹ گورنر صوبجات شمال مغربی۔

باؤلی کی سرائے پر ہم ایک معرکہ سر کر چکے ہیں۔ جہاں باغی اس وقت تک ہمارا خوفناک مقابلہ کرتے رہے جب تک کہ ان کی توپیں ان کے قبضہ میں رہیں اس کے بعد سے ہم پر پیہم حملے ہو رہے ہیں۔ ہر حملہ اتنے جوش و خروش سے کیا جاتا تھا۔ مگر بھاری نقصان لیکر پسپا کر دیا جاتا تھا۔ اور اب ہم اس پوزیشن پر قابض ہو گئے ہیں جہاں سے اس مقام کو منہدم کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک بہترین پالیسی یہ ہے کہ اسے مشکل کام کی طرح اصلی رنگ میں دیکھا جائے اور یہ امر اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے کہ اسے کافی فوج کے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔

ذرا ایک مرتبہ ہم شہر میں پہنچ جائیں پھر تو بازی ہماری ہے بشرطیکہ ہم اس پر قبضہ رکھ سکیں اور پھر جب کبھی مسٹر کالون کو جس کسی مقصد کیلئے فوج کی ضرورت ہوگی وہ انہیں مہیا کر دیجائیگی۔

تاخیر سخت تکلیف دہ ہے اور روزانہ ان حملوں میں سپاہیوں کا ضائع ہونا نہایت دلشکن معلوم ہوتا ہے۔ میں بخیریت ہوں۔ البتہ پریشان بہت زیادہ ہوں لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جتنا زیادہ میں خیال کرتا ہوں اتنا ہی زیادہ مجھے بے معنی اور بے نتیجہ تجربہ کے عمل میں نہ آنے کی خوشی ہوتی ہے۔ اور یہ دیکھنے سے کچھ ڈھارس بندھتی ہے کہ آپ بھی میرے ہمخیال ہیں

میری توقع صرف اس قدر ہے (جسے اور لوگ اب غالباً معلوم کر لیں گے) کہ مجھے دہلی میں داخل ہو جانے کے علاوہ اور بھی کچھ کام کرنا تھا۔

یقین رکھئے کہ میں اب کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دونگا۔

آپ کا صادق۔ ایچ۔ ایچ۔ برنارڈ

کل ہم نے انہیں خوب سزا دی اور بھاری نقصان پر پہنچایا۔ انہوں نے کشن گنج ٹریولین گنج اور پہاڑ پور میں اپنے تئیں قائم کرنے اور توپخانہ جمانے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے دو مختصر دستوں کے ذریعہ جو میجر ٹومس ایچ اے اور میجر ریڈ (مسوری بٹالین) کی کمان میں تھے انہیں نہ صرف ان مقامات سے ہٹا دیا بلکہ سرائے کے بالائی حصہ کو ان سے بالکل صاف کر دیا۔ اور شہر کے اس حصہ سے ہم نے ان سب کو نکال دیا۔ سنا ہے کہ اس کا ان پر نہایت پست کن

اثر پڑا اور یہ کہ وہ بہت پریشان ہو رہے ہیں۔ لیکن فصیلوں سے جو گولہ باری وہ کرتے ہیں وہ دیسی صحیح اور زوردار ہے جیسی کہ پہلی تھی اور تاوقتیکہ ہم اپنے مقصد پر نہ پہنچ جائیں ہم کچھ مفید کارروائی نہ کر سکیں گے اور عملی کام کی یہ حالت ہے کہ اس وقت کے باوجود جو توپخانہ و سامان حرب وغیرہ کے حاصل کرنے میں برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میرے توپخانہ کا کمانڈنگ افسر صرف چھ توپوں کے چلانے کا انتظام کر سکتا ہے! اور میرے انجینیر کے پاس ریت کا ایک بھی تھیلا موجود نہیں۔ یہ درحقیقت حد سے زیادہ تکلیف دینے والی بات ہے۔ میں نے اس وقت تک کبھی باقاعدہ بورشین کرنے کا خیال نہیں کیا۔ جب تک کہ مجھے یہ امید نہ ہو گئی کہ جو توپیں بھی میرے خلاف لائی جائیں گی میں انہیں خاموش کر دونگا۔

لیکن اس کام کو انجام دینے کی غرض سے ان کے اور زیادہ قریب تک پہنچنے کی ضرورت ہے۔ تاخیر باغیوں کو ایک جگہ مجتمع کر دیتی ہے۔ اور حملہ کو نہایت زوردار بنا دیتی ہے۔ لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسی کارروائی مہلک اثرات بھی اپنے میں رکھتی ہے تاہم میں سچائی کے ساتھ یہ خیال نہیں کر سکتا کہ جب انہیں دہلی کے دروازے بند کرنے کا موقع دیا گیا تھا تو اس وقت ہم اس سے زیادہ کر سکتے تھے جتنا کہ ہم نے کیا۔

اگر میرٹھ کی فوج فی الفور دہلی میں گھس جاتی تو سب کچھ بچایا جا سکتا تھا۔ لیکن جب انبالہ والی فوج مقام مقصود پر پہنچی ہے تو موقع بالکل ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

سب سے بڑا میگزین اور سامان جنگ کا ڈپو اس سے پیشتر سے میرے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ میرے سپاہی اچھی طرح ہیں اور زخمی خاطر خواہ طریقہ سے روبصحت ہو رہے ہیں لیکن سب کے سب اس کام سے تھک گئے ہیں۔

ہمیشہ آپ کا۔ ایچ۔ ایچ۔ بی۔

مراسلہ نمبر ۴۔ جسے ہنری گریٹ ہیڈ مشیر سیاسی متعینہ افواج محاصرۂ دہلی نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۶ جون ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

[illegible]

[illegible] پیر کے دن پانی پت پہنچے گئے اور یہ خبر ہمیں نے اس وقت سنی جبکہ میں سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ ان کی موجودگی سے کئی روز تک وہ دہشت دفع ہوگئی تھی جو افسروں اور ڈاک کے ٹھیکہ داروں میں اس دھاوے کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی جسے دہلی کے ۲۰۰ سواروں کی پارٹی نے حال پر پہ کیا تھا۔ بقیہ ہر وہ تحصیلدار کی تلاش میں تھے تھسیل میں پٹیالہ کے سواروں کے مختصر دستے کے جتنے گھوڑے موجود تھے وہ سب کو لوٹ کر لیگئے جونہی کہ پنجاب کے بے قاعدہ سوار پہنچ جائیں گے۔ ہم ان کی اس کارروائی کا انتظام لے لیں گے۔

مجھے رہتک کو راجہ صاحب جیند کے چارج میں رکھنے سے بہت خوشی ہوگی۔ لیکن سراپچ برنارڈ (فی الحال) اپنی فوج کو علیحدہ نہیں کر سکتے، اور اس کے بغیر ان کے لئے حملہ کی کوشش کرنا بے سود ہوگا۔

اگر پٹیالہ کچھ فوج دے سکے اور آپ کو حصار کی جانب پنجاب سے افواج کی نقل و حرکت کی کچھ خبر نہ ملے، تو (اس صورت میں) میں بخوشی تمام اس امر پر رضامند ہو جاؤنگا کہ اس ضلع کو عارضی طور پر ان کی حفاظت میں دیدیا جائے۔ ایسا کرنا درحقیقت ان باشندوں پر رحم کھانا ہوگا جو ہانسی اور حصار دونوں سے امداد کے طالب ہو رہے ہیں۔ آپکی اس تجویز پر عمل پیرا ہونے سے مجھے بہت خوشی ہوگی اور اگر انتظام ہو جائے تو میں مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں خریطہ[1] لکھ دوں گا۔

میرا خیال ہے کہ نواب صاحب بہجر نے ناقابل علاج طریقہ سے سازباز کی ہے۔ لیکن ان کا علاقہ اعلیٰ کی اس پالیسی (سراپچ برنارڈ فی الحال) دفع الوقتی کرنی چاہیئے۔ نواب [illegible]

[1] سرکاری مراسلہ کا تحفہ

[illegible] ہے اور سابق [illegible] کا کوئی شہزادہ گدی پر بٹھا دیا گیا ہے باقی [illegible] وفاداری برقرار رکھنے میں سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔

ذخائر کی ہمارے پاس کافی سے زیادہ افراط ہے البتہ روپیہ کی کمیابی ایک ایسی مشکل ہے جس کی نسبت ہمیں امید تھی کہ دہلی کے سر ہو جانے سے جاتی رہے گی۔ خزانہ اور دفتر کمسریٹ کے جو صاحب افسر انچارج ہیں۔ میں ان کی چٹھیاں آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔

جب میں وہاں سے روانہ ہوا تھا تو اس وقت تقریباً ہم لاکھ تھے۔ میں بہت زور سے سفارش کرتا ہوں کہ جو فوجیں اب یہاں آ رہی ہیں ان کے ہمراہ آپ روپیہ کی ایک معقول مقدار ضرور بالضرور بھیج دیجئے۔

مجھے اپنا صادق یقین کیجئے۔ ایچ۔ ایچ۔ گریٹ ہیڈ

مراسلہ نمبر ۶۸ - جسے بریگیڈیر جنرل نیویل چیمبرلین ایجوٹنٹ جنرل نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

کیمپ مقابل دہلی۔ ۱۲ر جولائی ۱۸۵۷ء وقت ایک بجے دوپہر۔

مائی ڈیر بارنس۔

اب جبکہ کرنال ہمارے مستحفظ سامان حرب اور ذخائر کا ڈپو بن گیا ہے۔ ہمیں وہاں پیدل فوج کا ایک دستہ رکھنا چاہئے اور چونکہ اس کیمپ سے ہم ایک آدمی بھی نہیں دے سکتے ہمیں حسب معمول سپاہیوں کی بہم رسانی کے لئے پنجاب سے توقع رکھنی چاہئے براہ مہربانی اس مسئلہ کے متعلق لاہور سے نامہ و پیام کیجئے اور اگر اور سپاہی نہ دستیاب ہو سکیں تو کم سے کم سکھ سپاہیوں کی ۴ پلٹنوں کو حاصل کرنے کی سعی کیجئے۔ ہمارا عقب کھلا اور خاموش رہنا چاہئے اور یہ ہماری فاش غلطی ہوگی اگر ہم اپنے ذخائر کو غیر محفوظ حالت میں چھوڑ جائیں گے یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے مزید افواج کا مطالبہ کیا ہے اور میں اب بھی ایسا نہ کرتا لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ہم ایک آدمی کو بھی علیحدہ نہیں کر سکتے۔ ۹ر جون کو ایک سخت معرکہ میں ہمارے ۲۷۰ سپاہی

ضائع ہوئے جن میں مستقل مجبوں اور ہمیار سب شامل ہیں۔ اور اس خط کے تحریر کرتے وقت بھی ہم باہر نکلنے (یعنی حملہ کرنے) کے لئے آمادہ ہیں۔ چاروں طرف سے حملہ کی دھمکی دی جارہی ہے

میں نے انتخاب کرنال کی سفارش اس لئے کی تھی کہ اس کا ہمارے کیمپ سے کافی آسانی کیساتھ سلسلہ نام و پیام قائم کیا جاسکتا ہے اور نیز یہ کہ وہ شہر سے اس قدر فاصلہ پر ہے کہ اچانک حملہ کسی صورت میں نہیں کیا جاسکتا۔ میرٹھ۔ سہارنپور۔ اور مظفر نگر تک وہاں سے نام و پیام کیا جاسکتا ہے اور چونکہ وہاں کے نواب صاحب ہم سے برسر صلح ہیں اس لئے مقامی شورش کا بہت ہی کم امکان موجودہ موسم میں دریائے مارکنڈہ[1] کا کچھ بھروسہ نہیں اور اس لئے بارود اور ذخائر کو اس کے قرب وجوار میں نہ رکھنا چاہیئے۔

سننے میں آیا ہے کہ بعض باغی شکاری توپ کی ٹوپیاں استعمال کررہے ہیں (لہذا) تمام دوکانداروں اور تمام فرقوں کے دیگر اشخاص جو ان چیزوں کی تجارت کرتے ہیں ان تمام اشیاء کے چھین لینے کی فوری کارروائی عمل میں آجانی چاہیئے۔ تاکہ آتش گیر اور زود رسے پھٹنے والی بارود کی قسم کی کوئی شے وہ اپنے پاس نہ رکھ سکیں۔ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ مجموعی مقدار پر قبضہ کرلے اور ایک رسید دیدے۔

آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جو تھے لانسرز کے ہمعیار رکھوا لئے جائیں گے اور یہ کہ ہدین الہی سی نہیں آرہی ہے۔ جب تک آپ ہمارے عقبی حصہ ملک کو خاموش رکھے رہینگے اور ہمیں ذخائر و سامان دیتے رہیں گے ہماری حالت ٹھیک رہیگی یا کم سے کم ہم اس وقت تک مقابلہ کرتے رہیں گے۔ جب تک کہ وہ دن نہ آجائے کہ دوسرے اشخاص ہماری جگہ لینے کے لئے تیار ہوجائیں۔

آپ کا صادق تیویل چیمبرلین [2]

[1] کرنال اور انبالہ کا درمیانی دریا۔ [2] چیمبرلین کو جان لارنس نے دل پنجاب کے متحرک دستہ کا کمانڈر بنایا تھا لیکن کرنل چیسٹر کی وفات پر جو باؤلی کی سرائے والے معرکہ میں مقتول ہوگئے تھے وہ ایڈجوٹنٹ جنرل بنادئے گئے۔

مراسلہ نمبر ۶ جسے لفٹننٹ ہڈسن قایم مقام ایجوٹنٹ جنرل نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۹ر جولائی ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

کیمپ مقابل دہلی۔ ۱۹ر جولائی ۱۸۵۷ء۔

مائی ڈیر مسٹر بارنس۔

چیمبرلین نے مجھے آپ کی ۱۷ر تاریخ کی چٹھی دی تاکہ میں ایک دو باتوں کا جواب دوں کرنال کے ذخائر توپخانہ کا انتظام کپتان پنیج بل کے سپرد کیا جانے والا تھا مگر وہ بیمار ہو جانے کے سبب انبالہ ہی میں رہ گئے ہیں اس لئے میں نے توپخانہ کے کسی ڈپٹی اسسٹنٹ کمشنر کو یا فیروزپور سے ادائیگی فرائض کیلئے کسی مستقل کنڈکٹر کو بذریعہ تار بلا بھیجا ہے اگر کپتان پنیج بل صحت یاب ہو گئے تو بلاشبہ ابتدائی حکم رجسٹرڈ بیس کے ذریعہ پہنچایا گیا تھا بدستور قایم رہے گا۔

جو افسر کہ پرائیویٹ چھٹی پر گئے ہوئے تھے ان سب کو واپس آجانے کا حکم ۱۴ر مئی کو دیدیا گیا ہے اور اس حکم کو کچھ عرصہ کے بعد دہرا بھی دیا گیا تھا۔ اور ہمارے محکمہ کے کپتان بیکر نے یہ اطلاع دی ہے کہ اس حکم کی تعمیل ہو چکی ہے مجھے کسی ایسے افسر کا حال معلوم نہیں ہو سکا جس نے تعمیل نہ کی ہو۔ اگرچہ بعض نے بیماری کے سرٹیفکٹ حاصل کر لئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اب کرنال میں کافی فوج موجود ہے۔

اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں اگر آپ بریگیڈیر ہارٹلی سے یہ درخواست کریں کہ وہ پانچویں بٹالین کے دو افسروں کو کرنال میں کام کرنے کی غرض سے بھیجدیں بشرطیکہ انکی وہاں (واقعی) ضرورت ہو لیکن اگر کوئی افسر نہ مل سکے تو ایک (لفٹننٹ چیسٹر کے جونیر افسر) کو بآسانی نوشہرہ کی بٹالیں مقیم سہارنپور کے ساتھ کام کرنے کیلئے بھیجا جا سکتا ہے ہم نے دشمن کو کل سہ پہر کے وقت بلا کسی دقت کے سبزی منڈی کے باہر نکال دیا۔ ہمارے نقصانات ۱۲ مقتول اور ۶۹ زخمی تھے۔ افسروں کے کل کے مجموعی نقصانات یہ ہیں۔ لفٹننٹ کروزیئر (۵ دیں)

[illegible] ۶۱ ویں پیدل فوج [illegible] مرتے مرتے
مرے سامر کی وجہ سے مرے۔ لفٹنٹ جونز (انجینیرز) کی ٹانگ کاٹ ڈالی گئی۔ لفٹنٹ پالٹون (۶۱
ویں پیدل فوج) سخت مجروح ہوئے۔ اور لفٹنٹ چیپٹر (توپخانہ) خفیف طور پر زخمی ہوئے۔

اب اور ٹہچانوں کومت بھیجئے یہ چیمبرلین کی خواہش ہے اور اس کے لئے وجوہ ہیں بلاشبہ
آپ انہیں اس وقت بھیج سکتے ہیں جبکہ کوئی رسالہ آرہا ہو اور وہ بھی اس میں موجود ہوں
لیکن جتنے کم ہوں اتنا ہی بہتر ہوگا۔

آپ کا زیادہ مخلص۔ ایچ۔ اے۔ نارمن۔

مراسلہ نمبر ۷۔ جے۔ لفٹنٹ ڈبلیو ایس۔ آرہڈسن نے بے ڈگلس فارسیتھ ڈپٹی کمشنر
انبالہ کے نام ۲۹ر جولائی ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

دہلی کیمپ۔ ۲۹ر جولائی ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر وارسیتھ

جو بوڑھی خاتون بہ نفس نفیس اس مراسلہ کے ہمراہ آرہی ہے وہ محاصرہ دہلی کی مکمل و
مجسم داستان ہے۔

وہ ہمارے خلاف شہر میں جہاد کا وعظ کہتی تھی اور اپنے مواعظ و نصائح سے تعجب خیز
طریقہ پر مسلمانوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دیا تھا۔ بالآخر اُن کی عدم کامیابی سے متنفر ہو کر وہ
خود میدان جنگ میں اتر آئی اور سبز لباس پہن گھوڑے پر سوار ہو اور تلوار و بندوق سے مسلح
ہو کر اس نے سواروں کے ایک دستہ کی کمان لی اور ۷۵ دیں پیدل فوج پر حملہ آور ہوئی سپاہیوں کا
بیان ہے کہ اس ایک کا مقابلہ کرنا ۵ سپاہیوں کے مقابلہ سے زیادہ مہلک تھا اور وہ یہ بھی کہتے
ہیں کہ اس نے ان کے رفقا میں سے بہت سوں کو نشانہ بندوق بنا دیا۔ آخر کار وہ زخمی ہو کر
گرفتار ہو گئی۔ جنرل نے اول اول اُسے آزادانہ طور پر چلے جانے کی اجازت دینی چاہی تھی مگر
میں نے ان سے بمنت درخواست کی کہ وہ ایسا نہ کریں اسلئے کہ وہ پھر شہر میں فاتحانہ طریقہ سے

[illegible] یہ ظاہر کرے گی کہ وہ اپنی کرامت کی وجہ سے بچ گئی ہے اور اس طرح سے بوتش آف آرک کا سرتبہ حاصل کرے گی۔

مجھے اس کو آپ کے پاس بھیجنے کی اجازت مل گئی ہے تاکہ وہ جیلخانے میں بحفاظت تمام رکھی جائے۔ وہاں کہیں آپ مناسب خیال کریں تاوقتیکہ یہاں کا کام ختم نہ ہو جائے۔

کیا آپ براہ مہربانی اس امر کی نگہداشت رکھیں گے کہ اس کا طرز عمل قابل اطمینان ہے یہ کہتے ہوئے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت اس بڑھیا کوبوسٹ نے معقول اثر پیدا کر لیا تھا۔

آپ کا زیادہ مخلص ڈبلیو۔ ایس۔ آر ہڈسن

مراسلہ نمبر ۲۔ جے ہنری گریٹ ہیڈ مشیر سیاسی متعینہ افواج نزد دہلی نے جارج کارنک بارنس کو ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

کیمپ مقابل دہلی۔ ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر بارنس۔

مولوی رجب علی (صاحب) نے مجھ سے خواہش کی کہ میں آپ کو یہ اطلاع دوں کہ انہوں

نوٹ:۔ اس سبز پوش عورت کا ذکر خطوط ہذا کے آخر میں ذرا تفصیل سے درج کیا گیا ہے)

حسن نظامی

لے یہ جوان آرلینز کی کنواری عورت کے نام سے بھی شہرت رکھتی ہے۔ یہ فرانس میں ہینری کے قریب پیدا ہوئی تھی۔ سنہ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں۔ لیکن چونکہ وہ عین عالم شباب میں ۱۴۳۱ء میں جلا دی گئی تھی اس لئے بالضرور چند ہوئیں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوئی ہوگی۔ مارچ ۱۴۲۹ء کا واقعہ ہے کہ شہر آرلینز کو انگریز افواج نے محصور کر رکھا تھا یہ فرانس کے بادشاہ چارلس ہفتم کے پاس گئی اور کہا کہ مجھے غیب سے یہ کام سپرد ہوا ہے کہ میں شہر کو بچاؤں اور آپ کی تخت نشینی کا انتظام کروں۔ پارلیمنٹ کے سوال و جواب پر اسے وزیر جنگ بنا دیا گیا اور وہ پھر اپنے مشن کی تکمیل پر روانہ ہوئی اس نے ڈیوٹوائے اور ایلنکوں جیسے بہادر سپاہیوں سے خراج تحسین وصول کیا اور اپنی ذاتی دلیری اور بسالت سے افواج میں غیر معمولی جوش پیدا کر دیا۔ اس نے بالآخر آرلینز کو بچا لیا اور پھر چارلس کو تخت نشینی کے مراسم ادا ہوئے۔ اس کے بعد اس نے پیرس کی جانب اپنی توجہ مبذول (بقیہ آئندہ)

نے حکیم احسن اللہ (صاحب) کے نام ایک مراسلہ بھیجا تھا جو مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ اس سے کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے حکیم (صاحب) بادشاہ اور باغیوں کے منصوبوں کے اندرونی راز بتانے کے قابل ہو جائیں۔ مولوی (صاحب) کہتے ہیں کہ اس کے باعث حکیم (صاحب) کی سخت بے عزتی ہوئی (اس لئے کہ) وہ مراسلہ سپاہیوں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ جنہوں نے ان کے مکان کی تلاشی لے ڈالی۔ لیکن اس کا مشکل ہی سے یقین کیا جا سکتا ہے (کہ حکیم احسن اللہ خاں کی تلاشی لی گئی یا ان کو کچھ نقصان پہنچا)۔

کیمپ کی حالت میں نمایاں ترقی ہو گئی ہے۔ ہم ہر لحاظ سے آرام سے ہیں اور ابھی تک افواج کی صحت اچھی ہے جس کے لئے ہم (خدا کے) شکر گزار ہیں۔ دشمن کو تمام مقامات پر اور تمام جنگی چالوں میں کلیتہً ناکامی ہوئی ہے۔ جب تک کہ قلعہ شکن توپیں مع پورے ساز و سامان کے نہ پہنچ جائیں اس وقت تک کسی زبردست جنگی کارروائی کا فیصلہ کرنا بالکل بے سود ہے۔ اور اس وقت یہ معلوم ہو جائے گا کہ آیا جنرل ہاویلاک کا انتظار کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اب تک تو ہر بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی باغی فوجوں کا بہت جلد صفایا ہو جائیگا۔ مجھے آگرہ سے یہ خبر ملی ہے کہ ۲½ ہزار نیپالی افواج جنرل ہاویلاک سے لکھنؤ کے مقام میں ملنے والی تھیں ڈرمنڈ کو بالآخر آگرہ کے دیسی افسروں کی نالائقیوں کی سزا بھگتنی پڑی انہوں نے ان پر اعتماد کیا اور وہی اسٹیشن کو تباہ و برباد

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۱) کی لیکن اس میں اسے ناکامی ہوئی اور وہ زخمی ہو گئی۔ ۱۸۴۳ء میں اس نے کیپین کے مشہور شہر سے نکل کر ایک شیخوں مارا مگر گرفتار ہو کر انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ اسے رواں میں مقید کیا گیا اور اس سے سخت تشدد کا سلوک روا رکھا گیا 9 جنوری ۱۹۳۱ء کو اس پر مقدمہ چلایا گیا یہ عدالتی کارروائی محض برائے نام تھی اس لئے کہ جتنا وہاں انصاف کا خون ہوا ہے اتنا کہیں نہیں ہوا ہوگا۔ بوئے کے بشب کی گواہی پر اس پر جادوگری کا الزام رکھا گیا اور اسی جرم کی پاداش میں اسے ۳۰ مئی ۱۹۳۱ء کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اس وقت سے اسے تقدس کا درجہ دیدیا گیا اور مغرب کے مصوروں نے اس کی تصاویر بنا کر اسے غیر فانی بنا دیا ہے۔ مترجم

کرنے میں پیش پیش تھے۔ پانی پت میں ۲۲۳۰۰۰ (روپیہ) مرمحاصل میں موصول ہوا ہے اور میرٹھ والوں نے اپنے خزانوں کو بھرپور کرلیا ہے ہڈسن گائڈز (رہنماؤں) کے ساتھ باہر گئے ہیں اور وہاں وہ ان باغیوں کے دستہ کی دیکھ بھال کریں گے جو رہتک چلا گیا ہے ان باغیوں کا یہ ارادہ تھا کہ وہ ایسے چند دستوں کو باہر بھیجیں تاکہ وہ ملک کو شورش پر آمادہ کرسکیں لیکن کسی شخص نے کہا کہ احسن اللہ (صاحب) کی ایک چال ہے تاکہ وہ دہلی کی فوج کو (اسکے کچھ حصہ کو باہر بھیجکر) کمزور کردیں اور پھر شہر کو ہمارے قبضہ میں کرادیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ نے جیند کی افواج کے ذریعہ رہتک کے بعض حصوں کو قبضہ میں لانے کی تجویز پر (ابھی تک) عمل درآمد نہیں کیا ہوگا۔ بلاشبہ آپ کے پاس ایسی کارروائی نہ کرنے کے کافی وجوہ ہیں۔ بریگیڈیئر والٹیائل کو آگرہ میں برطرف کردیا گیا ہے اور کرنیل کاٹن اب ان کی جگہ براج رہے ہیں۔

آپ کا صادق۔ ایچ۔ ایچ۔ گریٹ ہیڈ

مراسلہ نمبر ۹۔ جسے ہنری گریٹ ہیڈ مشیر سیاسی متعینہ افواج نزد دہلی نے جارج کارنگ بارنس کے نام ۳۰ اگست ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

کیمپ۔ ۳۰ اگست ۱۸۵۷ء۔

مائی ڈیر بارنس۔

لی بیس کی خواہش ہے کہ گوہانہ میں مالگزاری جمع کرنے کی غرض سے ایک تحصیلدار کا تقرر کردیا جائے۔ میں انہیں فی الفور اس کارروائی کے کرنے کا مجاز نہیں بناتا اس لئے کہ مہاراجہ صاحب جیند کے انتظامات سے تصادم ہوجانے کا اندیشہ ہے لیکن اگر راجہ صاحب کچھ نہ کررہے ہوں تو میری خواہش ہے کہ آپ لی بیس سے کہدیں کہ وہ بہترین طریقہ سے مالگزاری جمع کرنے کا انتظام کردیں۔

مجھے یقین نہیں آتا کہ لکھنو کے لئے کسی قسم کا خطرہ موجود ہے۔ ہاویلاک بٹھو

[illegible] جب
ہیں [illegible] کہ باوجود خطرات کے آلہ بنوں قلعہ بند فوج کو چھانے کے
لئے حملہ کی ذرا سی بھی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ راہ ویلاک اپنی موجودہ کارروائی کو جاری
رکھتے آگرہ کی قلعہ کی فوج کے ایک دستہ نے علی گڈھ کے قریب اہم معرکہ سر کیا ہے۔
انہوں نے تین ہزار باغیوں کو مار بھگایا اور ان کے تین چار سو آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ بعد
کے سواروں میں سے کس کا نام خاص امتیاز کے ساتھ لیا گیا ہے۔ میجر ٹینڈی انسائن ہارس
اور تین پرائیویٹ فسر مقتول ہوئے۔ کپتان پیل کے ماتحت ایک بریگیڈ بھیجا جا رہا ہے
مدراس انفنٹری (پیدل فوج) کا ایک بریگیڈ کلکتہ پہنچ گیا ہے۔ مدراس کی افواج جبلپور
اور پنجور پر قابض ہو گئی ہیں۔

آپ کا صادق۔ ایچ۔ ایچ۔ گریٹ ہیڈ

مراسلہ نمبر ۱۔ جسے ہنری گریٹ ہیڈ مشیر سیاسی متعینہ افواج نزد دہلی نے جارج کا
رنک بارنس کے نام ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

کیمپ ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء۔

مائی ڈیر بارنس۔

اگر آپ روزانہ برقی مراسلات کو پڑھتے ہیں تو (ان کے مقابلہ میں) میری خبریں
باسی معلوم ہوں گی۔ قدسیہ باغ اور لڈلو کیسل، ۱۷ تاریخ کی رات کو قبضہ میں آ گئے تھے اور
اسی وقت موری (دروازہ) ۶۵۰ گز کے فاصلہ سے ۱۰ توپوں کی ایک بیڑی نصب کر دی گئی
تھی صبح ہوتے ہوتے چار توپیں چلنی شروع ہو گئیں اور شام تک سب کی سب مصروف کار
تھیں تو پخانہ پر ابتدا میں سخت گولہ باری کی گئی۔ اور قدسیہ اور لڈلو کی چوکیوں پر بھی حملہ

۱؎ ہز میجسٹی ملک معظم کے جہازات موسومہ پرل اور شینین (جو کپتان ولیم پیل کے ماتحت تھے)
ان میں سے مراد ہے۔

گیا گیا مگر ہمارا نقصان بالکل نہیں ہوا لفٹننٹ بائلڈ بریگیڈ (توپخانہ) و لفٹننٹ جرمین (انجینیر) مقتول اور لفٹننٹ بڈ (توپخانہ) زخمی ہوئے اور تقریباً ۳۰ سپاہی مقتول و مجروح ہوئے۔ گذشتہ شب سے لیکر صبح کے دس بجے تک صرف تین آدمی زخمی ہوئے موری (دروازہ) اور کشمیری (دروازہ) پر نشانہ بازی نہایت موثر رہی۔ گزشتہ رات کو ۲۲ چھوٹی توپیں نصب کی گئی تھیں اور ایک اور بھاری توپوں کی بیڑی بھی تیار ہے۔ اور جب یہ سب نصب ہو جائیں گی تو آتشبازی سخت خوفناک ہوگی۔ میرے بھائی (رابرٹس) مغربی حملہ کے انچارج (منتظم) ہیں مجھے ان کے پاس سے ابھی ایک دلچسپ اور ہمت افزا مراسلہ ملا ہے۔ وہ زبردست پیمانہ پر توپخانہ کے حملہ کو شروع کرنے کے لئے پرسوں کا دن منتخب کرتے ہیں۔ جس رفتار سے برائیڈ اپنی دس توپوں سے کام لے رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک موری (دروازہ) کا بہت ہی کم حصہ باقی رہ جائیگا۔

آپ کا صادق

ایچ۔ ایچ۔ گریٹ ہیڈ

مراسلہ نمبر ۱۱۔ جسے ہنری گریٹ ہیڈ مشیر سیاسی متعینہ افواج نزد دہلی نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

کیمپ۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء

ماٹی ڈیر بارنس۔

فی الحال موری دروازہ کا برج بھاری توپوں کے نصب کرنے کے قابل نہیں ہے تاہم ملکی توپیں وہاں سے کبھی کبھی دھوکہ دینے کی غرض سے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ کشمیری دروازہ کا برج موثر طریقے سے خاموش کر دیا گیا ہے اور اب وہ کھنڈرات کا ایک ڈھیر ہے اور توپوں کے جو گولے وہاں پھینکے جا رہے ہیں ان کی موجودگی میں اس

لہ لفٹننٹ (بعد فورس گریٹ ہیڈ) رائل انجینیرز۔

مقام پر کسی کو ٹکنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ برج کے دائیں حصہ والی فصیل میں بہت بڑا سوراخ کر دیا گیا۔ اور ہمارے گولے اس شگاف کو بتدریج وسیع کر رہے ہیں بائیں جانب کی شگاف ڈالنے والی بیٹری نے جو کسٹم ہاؤس کے کمپاؤنڈ (احاطہ) دیوار سے ۱۸۰ گز کے فاصلہ پر نصب کی گئی تھی صرف کل سے گولہ باری شروع کی ہے۔ اس توپخانہ کی تعمیر میں بے انتہا مصائب کا سامنا ہوا اور (جنگی) کارروائیوں میں تعویق بھی ہوگئی پہلے پہل اسے قدسیہ باغ میں نصب کرنے کا ارادہ تھا۔ جہاں وہ زیادہ حفاظت میں اور سرعت کے ساتھ تیار ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے اور فصیل کے درمیان نئی دشواریاں حائل نظر آئیں جو کسی نقشہ میں درج نہ تھیں اور (اس لئے) سامنے کی جانب بہت سی نئی زمین کو بھی ایسے فاصلہ سے درست کرنا پڑا۔ جہاں مزدوروں پر بہت شد و مد سے آتشبازی ہوتی رہی۔ بیٹری (توپخانہ) کل سہ پہر تک تیار نہ ہو سکی اور اب وہ پانی کے برج اور درمیانی دیوار کے خلاف استعمال کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ کام سخت محنت اور جانفشانی کا ہے ہر شخص کو کپتان فیگن کی موت کا افسوس ہے۔ جن کے بیٹری چلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سر میں گولی لگی۔ وہ حد سے زیادہ شجاع اور دلیر تھے۔ اور خطرہ میں خود کو ڈالنے سے روکے نہیں جا سکتے تھے گولی لگتے وقت ان کا نصف جسم خندق کے باہر تھا اور وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ نشانہ بازی کہاں سے کی جائے۔ جن خطرات اور دشواریوں پر قابو حاصل کیا گیا ہے وہ سخت خوفناک ہیں۔ توپخانہ کے افسروں کو آرام کرنے کا ذرا سا بھی موقع نہیں ملا اور جب سے توپخانے مصروفِ جنگ ہوئے ہیں وہ شب و روز کام میں لگے ہوئے ہیں۔ شہر کی براہِ راست آتشبازی میں معتدبہ کمی آگئی ہے۔ لیکن دشمن غیر متوقع مواقع پر جدید توپیں چڑھانے میں بڑا ماہر اور ہوشیار معلوم ہوتا ہے اور وہ اس میدان سے جو ہماری دائیں جانب واقع ہے خوفناک قسم کی تباہ کرنے والی آتشبازی کر رہا ہے۔ اور ہماری بائیں جانب دریا کی طرف سے دو توپوں کے ذریعہ بھی اس کی

گولہ باری ہوئی تھی۔ [illegible] بھی ہماری تمام مغربی چوکیوں پر گولے اور بم پھینک سکتا ہے ان تمام دقتوں کے باوجود ہماری کارروائیاں ترقی کر رہی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہلہ کل یا پرسوں شروع ہو جائیگا۔ کمانڈنگ افسروں کو کل ہدایات مل گئیں۔ تمام مقامات پر حفاظتی تدابیر کا پورا پورا انتظام کر لیا گیا ہے۔ صرف باہر نکلکر ان کے اچانک حملوں کی روک تھام کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ اور وہ ان حملوں کا (کچھ بھی) انتظام نہیں کر سکتے محصور فوج میں سے سپاہیوں کے فرار ہو جانے کے متعلق مجھے کوئی بادثوق اطلاع نہیں ملی ہے۔ بی سرہ بچوں کا مکمل نہیں ہے لیکن کوئی قوت ہماری افواج کی جانبازانہ بہادری میں مزاحم نہیں ہو سکتی اور تمام امور کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارے نقصانات بھاری نہیں خیال کئے جا سکتے۔ بعض افسروں کے نام اوپر بیان کر دئے گئے ہیں ان کے علاوہ حسب ذیل نقصانات ہوئے ہیں۔

زخمی

میجر کیمیل	...	...	توپخانہ
لفٹننٹ ارل	...	...	〃
〃 گبی	...	...	〃
چانسلر	...	...	۵۷ ویں
ریڈل	...	...	۹۵ ویں دیسی پیدل فوج
لاگ ہارٹ	...	...	〃
ایبٹن	...	...	۶۰ ویں رائفلز

مجھے اور کسی کا نام یاد نہیں آتا۔ ولیم ایڈورڈز فتح گڑھ کے قریب کسی گاؤں میں پڑویں اور ان کے بال بچوں سمیت بحفاظت تمام زندہ ہیں مجھے غریب یاوری کھتارن ہل کا افسوس ہے وہ اچھا آدمی تھا۔

[illegible] ہیں۔ انہوں نے موقع سے [illegible] فائدہ اٹھا کر لیا ہے اور میں اپنے نظام کو کسی طور پر از سر نو مرتب کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا آئی۔ پی گرانٹ اگر کنوار عدالت کے ماتحت مضبوط کر سکتے یا نہیں۔ میرے آدمیوں نے بسا اوقات مسٹر بارنس کا ذکر کیا ہے اور وہ ان کی نیت و مزاج معلوم کرنے کے ہر وقت شائق رہتے ہیں۔

مجھے یقین کیجئے آپ کا صادق

ایچ۔ ایچ۔ گریٹ ہیڈ

مراسلہ نمبر ۱۲۔ جسے مسٹر ہیڈ شہر سیاسی متعینہ افواج نزد دہلی نے جارج کارنگ بارنس کے نام ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

دہلی۔ ۱۶ ستمبر

مائی ڈیر بارنس۔

میں نے لڈلو کیسل کی بلندی سے ہلہ کا مشاہدہ کیا۔ میں نہیں خیال کر سکتا کہ کوئی شخص زیادہ عرصہ تک ان چند لمحات کی پریشانی کو برداشت کر سکتا ہے۔ جو دستہ کے سروں کے غائب ہونے اور اس کے شگاف تک پہنچنے کے لئے گزرنے ضروری ہیں جو آتشبازی فصیلوں سے پانی کے برج والے سوراخ کے خلاف کی جا رہی تھی وہ ایسی شدید تھی کہ صرف دو سیڑھیاں کھائی (خندق) تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں میرے بھائی ولبی تو پخانہ سے اس نشان تک جاتے جاتے زخمی ہو گئے۔ گولی ان کے دائیں ہنسلی سے گزر کر سینہ کے پار اتر گئی۔ دوسرے بھائی [illegible] تمام خطرات برداشت کرنے کے بعد بچ گئے اور خدا کا شکر کہ وہ اب بالکل تندرست ہو رہا ہیں۔ کشمیری دروازہ کی فصیل کے سوراخ تک سیڑھی لگا کر پہنچے اور دروازہ کو بارود کے ذریعہ اڑا دیئے اور اندر

[illegible]

[illegible] لاہوری دروازہ کے [illegible] تک پہنچ گیا۔
دو توپیں ہو گئے۔ سامان بھی تیار تھا۔ توپوں کو [illegible] کے پہیے کابلی دروازہ
پر لگا دیا گیا۔ گرنیل لیمیل کا دستہ جو جانباز اور بہادر سپاہیوں کی زیر کمان تھا۔ نہایت شاندار طریقہ
سے جامع مسجد پہنچ گیا۔ ان کا انگریز افسر گولی کا نشانہ بنا گیا۔ اور زینہ کے تھیلے پیچھے رہ گئے۔

اور آرمی ٹینڈی اور براؤن (انجینیرز) کے ماتحت بھیجے گئے۔ اول الذکر مقتول اور
موخر الذکر زخمی ہو گئے۔ لاہوری دروازہ والے حصے سے کوئی امداد نہیں آئی اور اس لئے
کیپسل کو پسپا ہونا پڑا۔ پہلے بیگم کے باغ کی جانب سے وہ ایک گھنٹہ تک اپنے قبضہ
میں رکھ سکے اور زال بعد گرجا کے احاطہ میں۔ یہ ایک نازک موقع تھا۔ ہمارے سپاہی
تھک کر چور ہو گئے تھے۔ بہت سے افسر ناکارہ ہو گئے تھے اور گھبراہٹ بہت زیادہ
پھیل گئی تھی اور یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ریڈ کا دستہ کشن گنج پر قبضہ کرنے میں بالکل ناکام
رہا۔ توپیں لائی گئیں اور بڑے بڑے بازاروں کی جانب موڑ دی گئیں اور اس طرح
پانڈے کا آخری موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

افسوس ہے کہ جموں کی فوجیں جب سے اپنے پہاڑی مقامات سے نکلی ہیں، نہ
صرف بالکل ناکام رہیں بلکہ کشن گنج میں پانڈیوں کے مقابلہ میں ان کے ہاتھ سے
ہم توپیں بھی جاتی رہیں۔ اور اس کی وجہ سے انہوں نے ریڈ کے بازوؤں کو خطرے
میں ڈال دیا۔ اگرچہ خبر صحیح ہے تو دیوان صاحب ہی نے فرار ہونے میں سبقت کی تھی
[illegible] کی کارگزاری بہت اچھی رہی۔ آج ہماری پوزیشن حالت میں
بہت کچھ ترقی ہوئی ہے۔ میگزین پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔ اور اب ہمارا تصرف کابلی دروازہ

[illegible] سے متعلق تھے۔ [illegible] کرنل نیڈورڈ [illegible] جو آٹھویں پیش اور دوسرے
دستے کے ایک حصے کے کمانڈر تھے۔ [illegible] کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ مترجم۔

سے کیمپ بھرے ہوئے ہیں۔ اس فوج کی چوکیوں تک وبا پھیل گئی ہے۔ جو میکزین پر قابض ہے شہر کے اس سارے حصہ کو باشندوں نے خالی کر دیا ہے اور اس لئے وہاں سے جو روپیہ پیسہ مل سکیگا اپنے قبضہ میں لے لیا جائیگا۔ پنڈیوں کی ایک معقول تعداد قتل ہوئی اور میرا خیال ہے کہ بہت ہی کم لوگ بچنے پائے ہیں۔ لیکن کسی عورت کو دیدہ و دانستہ ایذا نہیں پہنچائی گئی۔

کیمپ کی حفاظت کشن گنج کی ناکامی سے ایک حد تک خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ اس پر حملہ کا اندیشہ تھا مگر ہوا نہیں۔ سلیم گڈھ اور شاہی محل پر گولے برسائے جا رہے ہیں میرا خیال ہے کہ کوہل کامیابی یقینی ہے۔ ہماری فوج میں مقتول و مجروح دونوں کا شمار ۵۰۰ سے کم نہ ہوگا۔ نکلسن کی جان کا سخت اندیشہ ہے۔ ان کے نقصان کی تلافی ناممکن ہے۔ کرنل کیمبل (۴۲ ویں) بھی ناقابل ہو گئے ہیں۔ پورے کرنل جو رہ گئے ہیں ان کے یہ نام ہیں۔ لائنگ فیلڈ (۱ ویں) جونز (۶۱ ویں) ڈینس (۴۲ ویں) جنرل ولسن کی بہت کچھ ہمت افزائی کی گئی ہے۔

مسٹر کاؤں ۹ ویں کو انتقال کر گئے۔

مسٹر ریڈ نے سینٹر سولین ہونے کی حیثیت سے اس امر کے متعلق ایک غیر معمولی مراسلہ گزٹ شائع کیا ہے کہ انہوں نے شمال مغربی صوبجات کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ برتر یاک پاس اس کے علاقہ کی وسعت کے مساوی سلطنت موجود ہے۔

آپ کا ایچ ایم گزٹ بیڈ سے

---

[1] مسٹر کیمبل اس وقت تک زندہ تھے۔ [2] [illegible]

مراسلہ نمبر ۱۲۳ بنام سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب۔ نے مراج کارنک بارنس کے ہمراہ ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

لاہور ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر بارنس

آپ نے جو پیاس روپئے ڈاک بنگلہ میں اس غریب لڑکی کو دئے تھے میں انہیں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود تک بحفاظت تمام پہنچ گئی ہوگی۔ میں نے سانڈرس کو لکھ بھیجا ہے کہ مولوی رجب علی (صاحب) کو بھیجدیں جو غریب اپنی خدمات کے باوجود مجرب نرغہ میں پھنس گئے ہیں۔ مجھ ملول کو پنجاب میں واپس بلا لینے سے خوشی ہوگی اور وہاں میں ان کے فوائد کا خاص خیال رکھوں گا۔

طوفان ختم ہوگیا اور ہمیں سانس لینے کی فرصت ملی اور جب میں گزشتہ واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ہم لوگ کس طرح سے ابتک جوں کے توں زندہ موجود ہیں۔ صرف خدا تعالیٰ کے فضل سے ہم زندہ بچے ہیں۔ یقیناً یہ بات ہماری توقعات سے زیادہ نکلی کہ تمام پنجابی پلٹنیں وفادار ہیں ہزارہ کے بارہ میں مجھے ابھی اطمینان نہیں ہوا۔ مری میں بھی اہم معاملات درپیش ہونے والا تھا اور جیسی کہ میں نے توقع کی تھی معاملات ابھی تک پورے طور پر طے نہیں ہوئے ہیں پنڈی میں ایک اور فوج بھیج رہا ہوں اور اس فوج کو ہشارہ دینا چاہتا ہوں جو لدھیانہ میں ابھی بھرتی کی گئی ہے۔ گورنمنٹ میں ہر انتظامی پھیلی ہوئی ہے۔ دنگل بہت گھنا ہے اور باغیوں کو بڑی آسانی سے وہاں جائے پناہ مل سکتی ہے۔ جہاں بیگمیں انہوں نے فوج کی کمان کی تھی سخت بزدلی نکلی۔ اس نے کہ جب بہ معاش ان کے قبضہ میں تھے

واقعہ نویس مصنف مراسلہ ہذا ابھی نہیں ملا ہوئے کہ

[illegible] کچھ بھی نذر کرنے سے۔ اب انہیں بخار چڑھ آیا۔ جلد انہیں [illegible] بھیج دیا جائے
گا۔ پھر کہیں میں امید کر سکتا ہوں کہ سب معاملات ٹھیک ٹھاک ہو سکیں گے۔

سکھوں کی ان دو پلٹنوں کا کیا حشر ہوا انہیں کٹس[1] نے بھرتی کیا تھا؟ مجھے
امید ہے کہ انہیں چھوڑ نہ دیا گیا ہوگا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں لوگوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف کرنے کا عادی
نہیں ہوں۔ اب مجھے اپنی غلطی معلوم ہو گئی ہے لیکن جو کچھ بھی میں کہتا ہوں اس سے
میری مراد بھی وہی ہوا کرتی ہے اور میری رائے میں تو آپ نے بہت اچھا کیا کہ ڈویژن کو
کو دائیں جانب رکھا اور فوج کو امداد دی۔ آپ کی چوکی سخت خطرہ میں تھی۔

پٹیالہ، نابھہ اور جیند[2] کے لئے جو انعامات ہمیں تجویز کرنے چاہئیں۔ ان پر ذرا
اپنے ذہن میں غور و خوض کر لیجئے۔ انہیں بالفرد انعام و اکرام دینا چاہئے۔ اگر وہ
وفاداری نہ کرتے تو ہم کہاں کے رہتے؟

آپ کا صادق

جان لارنس

---

[1] جی۔ ایچ۔ ایم۔ رکٹس ڈپٹی کمشنر لدھیانہ۔

[2] نواب صاحب جھجر اور رئیس دادری (جنہیں بغاوت کرنے کا الزام تھا) ضبط شدہ جاگیریں ان تینوں
میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔

(حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی کی اجازت اور شکریے کے ساتھ)

تبسم کاشمیری

سن ستّاون کی دلّی

It was the morning of 11th May, 1857 when the rebel forces from Meeruth crossed the Jumna boat bridge, entered in the city and marched towards the red fort. The King of Delhi Bahadur Shah was enjoying the horizon, while sitting in the musamman burj. The rebel forces forcefully entered in the fort and reached in the Diwan-e-Aam. They explained the causes of rebellion and requested the King for his patronization which he agreed half heartedly, heagreed under their unbearable pressure. This paper reveals the story of Delhi in 1857. Delhi was a peaceful city till 10th May, 1857. The people were enjoying their life under the symbolic kingship of Bahadur Shah. The city was in the firm control of East India Company. But on the 11th May Delhi became a centre of the revolutionary forces who were coming from all parts of India and they were steadily growing in large numbers. This paper tells the story of the revolution from its earliest days to its last days of September, 1857. The present study has focused the day to day struggle of the freedom fighters. In the second week of September the British army received military help, they made a strong offence, defeated the freedom fighters, captured the city, imprisoned the King and destroyed the city and the civilians. The present study is based on the contemporary sources.

۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کا دن دلّی میں معمول کے مطابق گزرا تھا۔ شہر کی زندگی روزمرہ کے دستور کے مطابق رواں دواں رہی تھی۔ دلّی بنک کاروبار کے لیے وقت پر کھلا اور بند ہوا تھا۔ شہر کی خبروں اور سرکاری احکامات پر مشتمل 'دلی گزٹ' صبح کے وقت حسبِ معمول شائع ہوا تھا۔ دلّی کی کچہری اپنے اوقات کار میں مصروف رہی تھی۔ دلّی کے شمال میں دھیرج پہاڑی (The Ridge) پر دیسی پلٹنوں اور انگریز افسروں کی پریڈ قاعدے کے مطابق ہوئی تھی اور وہاں فوجی بینڈ بجتے رہے تھے۔

جیمس سکنر (James Skinner) کے بنائے ہوئے سینٹ جیمس چرچ (St. James Church) میں شہر کی کرسچین آبادی دستور کے مطابق ہفتہ وار عبادت کی رسوم ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی۔ اس موقع پر ان کے ساتھ بچے اور خواتین بھی آتی تھیں اور اس طرح سے یہ چرچ ان کے سماجی میل ملاپ اور گپ شپ کا ذریعہ بھی بن گیا تھا۔

سرِشام دلّی کلب حسبِ معمول پُر رونق ہونے لگا تھا۔ دن بھر کی لو اور گرمی سے تھکے ماندے یورپین کلب میں داخل ہونے لگے تھے، ان لوگوں کے لیے دلّی کلب کی یخ بستہ بیئر (Bear) شادمانی کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ تاش یا شطرنج کھیلتے، دلّی کی زندگی کے مسائل پر بات چیت کرتے، کلکتہ، بیرک پور اور برہام پور کی فوجی ہلچل پر تشویش اور کارتوسوں کے مسئلے پر دیسی فوجیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ لوگ اس رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تھے۔

یہ اتوار کا دن تھا، اس لیے دلّی شہر کی جدید درس گاہ 'دلّی کالج' میں ہفتہ وار تعطیل تھی۔ طلبہ اور اساتذہ اپنے اپنے گھروں میں آرام کرنے یا درسی تیاریوں میں مصروف رہے تھے۔ شہر کی عدالتیں اور سرکاری دفتر بند تھے، اسی لیے اس صبح مٹیا محل کی سڑک سے مفتی صدرالدین آزردہ کی حویلی سے ان کی فٹن برآمد نہ ہوئی تھی۔ اس صبح مفتی صاحب نے سحری کھانے کے بعد نماز ادا کی اور پھر معمول کے وظائف کے بعد استراحت کر رہے تھے۔ لال قلعے کے روز و شب دستور کے مطابق بسر ہو رہے تھے۔ بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا۔ عدالت کا دربار لگتا تھا۔ امیر، وزیر، بخشی، ناظر، وکیل، میر عدل، میر منشی، محرر، متصدی وغیرہ ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے تھے۔ اپنے اپنے محکموں کے کاغذات پیش کرتے تھے۔ میر عدل دار الانصاف کے مقدمے پیش کر رہا تھا۔ عرض بیگی داد خواہوں کی عرضیاں حضور میں گزار رہا تھا۔ حکم

احکام جاری ہورہے تھے۔ دارالانشا سے کسی کے نام شقہ، کسی کو فرمان لکھا جاتا تھا۔[2]

چوں کہ یہ رمضان کا مہینہ تھا اس لیے دن کے اوقات میں دُکانوں کی رونق کم کم تھی۔ سہ پہر کے بعد جب سورج کے سائے لمبے ہونے لگے تو دلّی کے خاص خاص بازاروں میں چھڑکاؤ گاڑیاں آہستہ آہستہ چھڑکاؤ کر کے زمین کے جھلسے ہوئے سینے کو ٹھنڈا کر رہی تھیں۔ دُکانیں کھل چکی تھیں۔ بازار آباد ہوتے جارہے تھے۔ چاندنی چوک میں گہما گہمی کا آغاز تھا۔ پالکیاں آجارہی تھیں۔ گھوڑسوار دُکانوں کی سیر کرتے ہوئے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ جوہریوں، کپڑا فروشوں اور بناؤ سنگھار والوں کی دُکانیں جگمگانے والی تھیں۔ جمنا کے پُل کی طرف بڑھتے ہوئے قافلے شام ہونے سے پہلے پہلے شہر میں داخل ہونے کی تیاریاں کررہے تھے۔ شہر کے گنبد اور بلند مینار ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنوں سے چمکنے لگے تھے اور شفق پہ دور تک نارنجی روشنی کا غبار پھیلتا چلا گیا تھا۔

غروبِ آفتاب کے بعد افطاری کی توپ چلنے سے کچھ پہلے لال قلعہ سے خدام شاہی سروں پر افطاری کے بڑے بڑے خوان اٹھائے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور شور مچ رہا تھا کہ قلعہ سے افطاری آگئی۔ روزہ داروں کے لیے یہ شاہی تبرک منّ وسلویٰ سے کم نہ تھا۔ مئی کا مہینہ تھا، شدید گرمی پڑرہی تھی اور روزہ داروں کے حلق میں کانٹے محسوس ہورہے تھے۔ اس امتحان میں روزہ دار ایک ایک پل گن گن کر کاٹ رہے تھے۔ کوری کوری جھجھریاں، صراحیاں، کاغذی آب خورے اور پیالے چھوٹے چھوٹے لٹکنوں پر رکھے ہوئے تھے۔ انگور، انار، فالسے اور دیگر میووں کے شربت گلاسوں میں رکھے گئے تھے۔ بادام پستوں کے نقل، چھوارے، کشمش وغیرہ طشتریوں میں تھے۔[3] بیسنی، روغنی، میٹھی روٹیاں اور کلیجے تندروں میں لگ رہے تھے۔ حسینی کباب اور تکے تیار کیے جارہے تھے۔[4]

سورج غروب ہونے کی اطلاع ملنے پر روزہ افطار کرنے کا وقت ہوا۔ بادشاہ نے توپ چلانے کا حکم دیا۔ ہرکاروں نے جھنڈیاں ہلائیں اور دھائیں کی آواز بلند ہوئی۔ مکہ کی کھجوروں یا چھواروں سے روزہ کھولا گیا۔ شربت پیے گئے اور میوے چکھے گئے۔[5]

۱۰ر مئی کی رات بھی دلّی شہر میں حسب معمول تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد شہر کی مساجد تراویح پڑھنے والوں سے پُررونق تھیں۔ لال قلعہ میں دیوانِ خاص کے اندر بادشاہ نے باجماعت نماز ادا کی۔ ڈیڑھ پارہ قرآن شریف کا تراویح میں سنا۔ پھر بیٹھک میں تشریف لائے۔

کچھ بات چیت کی۔ بھنڈا نوش کر کے پلنگ پر آرام کیا۔ ڈیڑھ پہر رات باقی رہی تو محل شاہی، نقار خانے اور جامع مسجد میں سحری کا پہلا ڈنکا سنائی دیا۔ سحری کے خاصے کی تیاری شروع ہوئی۔ دوسرے ڈنکے پر دسترخوان پر طعام چنے گئے اور تیسرے ڈنکے پر بادشاہ نے سحری کا خاصہ کھایا اور بھنڈا نوش کیا۔ پھر صبح کی توپ چلی اور کھانا پینا موقوف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد نماز صبح ادا کی[6] اور یوں ۱۱ر مئی کی اس صبح کا آغاز ہوا جو اپنے دامن میں ایک عظیم طوفان لے کر طلوع ہوئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کا شہر کمپنی کے سائے میں حسبِ معمول بیدار ہو کر نئے دن کی سرگرمیوں کا آغاز کر چکا تھا۔

علی الصبح دریائے جمنا دلّی شہر کی نازنیں عورتوں کے حسن و جمال سے تختۂ چمن بنا ہوا تھا۔ ہزاروں نازنینیں مہین مہین ریشمی ساڑیاں اوڑھے ہوئے کمر کمر پانی میں غوطے لگا رہی تھیں۔ اکثر شوخ کم سن، الھڑ پنے کے دن، آپس میں چھینٹم چھینٹا ہو رہی تھیں۔ ایک مصرجی مہاراج موٹے تازے ننگ دھڑنگ نانگوں میں لنگوٹی، سر پر چوٹی جٹا لٹکائے ایک پتھر کے چھوٹے سے چکلے پر ایک ہاتھ سے صندل گھستے جاتے تھے۔ دریا سے نکلنے والی نازنینوں کو وہ پیشانی پر صندل کا ٹیکہ لگاتے تھے اور ایک پنکھڑی تلسی ہاتھ پر رکھتے جاتے تھے۔[7]

۱۱ر مئی کا دن دلّی کے عام دنوں کی طرح سے ایک تھا۔ سب کچھ قاعدے اور دستور کے مطابق شروع ہوا تھا۔ صبح کے وقت چرچ میں روزانہ عبادت روزمرہ کے مطابق ہوئی تھی اور آنے والوں کا مختصر سا اجتماع فراغت کے بعد گھروں یا دفتروں کو فرائض کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ خزانہ اور محل شاہی میں ہفتہ وار ڈیوٹی دینے والے محافظین آج فارغ ہوئے تھے۔ شہر کے سول سرجن ڈاکٹر بالفور (Dr. Balfour) جیل اور ڈسپنسری کا چکر لگانے چلے گئے تھے۔[8] ۱۱ر مئی کو دلّی کے صدرالصدور نے صبح کا آغاز کس طرح کیا تھا اس کا ایک منظر دیکھیے:

> ''صبح کا وقت تھا۔ عدالت اور کچہریاں اس ٹھنڈے زمانے میں گرم ہوتی تھیں۔ منیا محل کی سڑک پر بڑی حویلی کے سربلند دروازے کے آگے مفتی صدرالدین صاحب صدرالصدور کی فٹن تیار کھڑی تھی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل تھی کہ سوائے صدرالصدور کی دولت سرا کے شہر بھر میں فٹن گاڑی نہیں تھی۔ کیوں کہ اس وقت فٹن عنقا سمجھی جاتی تھی۔ صدرالصدور صاحب چوں کہ فرنگیوں کے نوکر تھے اس

لیے یہ انوکھی چیز آپ کے پاس تھی۔ اس گاڑی میں دو گھوڑیاں جتی ہوئی تھیں۔ یکا یک مفتی صاحب دیوان خانہ سے باہر تشریف لائے اور فٹن میں سوار ہو گئے۔ سامنے کی بیٹھک پر آپ کا پیشکار بیٹھ گیا اور اس نے کوچبان سے کہا، کشمیری دروازہ میں ہو کر کچہری کو چلو۔ اتنا کہتے ہی فٹن چل دی۔ صبح کا سہانا وقت مردہ دلوں میں بھی امنگ پیدا کرتا تھا۔ گھوڑیاں فراٹے بھرتی اٹکھیلیاں کرتی چلی جاتی تھیں جو سامنے کشمیری دروازہ آ گیا۔ کوچمین نے گھوڑیوں کی رفتار کو تھوڑا سا دھیما کیا، دروازے کے برابر باہر کی طرف ایک سپاہی اوچکی بنا ہوا بندوق میں سنگین لگائے پہرہ پر کھڑا تھا۔ یہ قوم کا پوربیہ تھا اس لیے اس کا رنگ کالا اور قد بہت لمبا تھا۔ اس سنتری نے مفتی صاحب کو انگریزی قواعد کے موافق بندوق اور سنگین سے سلامی دی اور چند ہی منٹ میں مفتی صاحب اپنی کچہری میں پہنچ گئے۔ آپ کے کمرے میں دری چاندنی قالین کا فرش تھا۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے۔ دو رویہ وکیل مختار مدعی مدعا علیہ چاندنی پر حاضر ہوئے اور عدالت گرم ہوئی۔[9]

اس سمے لال قلعہ کا ثمن برج عکس شفق سے سنہری نظر آ رہا تھا۔ یہ بادشاہانِ تیموریہ کی خاص نشست گاہ تھی۔ یہ وہی برج تھا جہاں شاہ جہاں نمازِ فجر کے بعد جھروکوں میں بیٹھ کر درشن دیا کرتا تھا۔ اس دور سے یہ رسم بن گئی تھی کہ دلی کے بادشاہ ثمن برج کے جھروکوں میں بیٹھ کر درشنیوں کو درشن دیا کرتے تھے۔ اسی رسم کے مطابق ۱۱ مئی کو ظل سبحانی سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ ظفر ثانی فریضۂ صبح سے فارغ ہو کر جھروکوں میں بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ سواری کی تیاری تھی۔ تخت رواں جس کا سنہری ہودا تھا اس پر زربفت کی مسندیں لگی ہوئی تھیں اور کاشانی مخمل کا غلاف تھا، تسبیح خانہ کے صحن میں پڑا تھا، جہاں پر خواجہ سرا، خواص اور چند معزز درباری حاضر تھے اور ظل سبحانی کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ تسبیح خانہ کے چبوترے کے نیچے پچاس ساٹھ کہار سرخ بانات کی وردیوں اور سرخ پگڑیوں میں کمربستہ کھڑے تھے۔ ظل سبحانی نے اچانک جمنا کے پل کی جانب دیکھا تو حیران ہوئے کہ دریا کا کنارہ گرد و غبار، دھوئیں اور آگ سے تیرہ و تار ہو رہا تھا۔ میر بحری

کے بنگلے میں آگ لگ رہی تھی اور شعلے آسمان کی جانب بلند ہو رہے تھے۔ رسالدار کو حکم دیا گیا کہ سوار بھیج کر خبر دو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گھوڑ سوار ابھی رستے میں سلیم گڑھ کے پل پر ہی تھے کہ جمنا کی جانب سے بے تحاشا لوگ بھاگتے ہوئے ملے۔ ان سے یہ خبر ملی کہ دلّی پر کوئی غنیم چڑھ آیا ہے۔ اس نے میر بحری کو مار ڈالا ہے۔ بنگلہ پھونک دیا ہے۔ مال کا صندوق اور گولک لوٹ لی گئی ہے۔ اسی وقت بادشاہ کی طرف سے حکم جاری کیا گیا کہ دریا کا پل توڑ کر کشتیاں کھینچ لی جائیں تاکہ غنیم اترنے نہ پائے۔ شہر پناہ کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں۔ کوتوال شہر کو کہا گیا کہ وہ حفاظت کی غرض سے کلکتہ دروازے پر خود حاضر رہے۔[10]

۱۱ مئی کی خبریں دیتے ہوئے 'دلّی اردو اخبار' اطلاع دیتا ہے کہ حکام وقت کو داروغہ پل نے یہ خبر دی کہ آج صبح چند ترک سوار میرٹھ سے آئے، پل عبور کر کے انھوں نے ہم پر ظلم کیا۔ محصول گھر کو لوٹا اور اسے نذر آتش کر دیا۔ حکام نے اسی وقت جلدی جلدی مشورہ کر کے خزانے کے محافظین کو تیار رہنے کا حکم دیا اور کچہری کے تمام عملے میں یک دم کھلبلی مچ گئی۔[11]

مفتی صدرالدین کے پیش کار نے دوڑ کر ان کے کمرۂ عدالت میں یہ خبر سنائی:

''جناب عالی! غدر پڑ گیا۔ سرکار کمپنی کی فوج اس سے بگڑ گئی ہے۔ شہر میں دندناتی پھرتی ہے اور قیامت برپا کر رہی ہے۔ شہر کے سب دروازے بند کر لیے ہیں۔ حضور فٹن میں سوار ہوں اور کسی طرح شہر میں پہنچ جائیں۔ مفتی صاحب نے اس بیان کو حیرت سے سنا اور کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ غالیچہ پر سے اٹھے اور باہر تشریف لائے اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جب کشمیری دروازہ کے پاس پہنچے تو دیکھا دروازہ بند ہے اور وہی پوربیہ سنتری بدستور پہرہ پر کھڑا ہے مگر تیور خراب ہیں۔ اسے چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر رکھا ہے اور اس پر تقاضا ہے کہ دروازہ کھول دے۔ وہ اوّل تو کسی کی بات کا جواب ہی نہیں دیتا ہے اور جواب دیتا ہے تو یہ دیتا ہے 'ہمارے دھورے چابی نہیں اور تالا سیکر اندر ہا۔ ادھر سے کیسے کھولت جائے ڈلی ڈلی'۔ حالانکہ مفتی صاحب کی گاڑی کشمیری دروازہ کے پٹوں سے جا لگی تھی اور سنتری مفتی صاحب کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ مگر سلام نہ سلامی گویا ان تلوں تیل ہی نہ تھا۔ مفتی صاحب کے آدمیوں نے تیس منٹ تک

دروازہ پیٹا اور چیخے کہ 'صدر الصدور کھڑے ہیں اور روزہ منہ میں ہے اور لو چلنے لگی ہے دروازہ کھولو۔' مگر دربانوں کو سانپ سونگھ گیا تھا کوئی خبر نہ ہوئی، تنگ ہو کر صدر الصدور صاحب کے پیش کار نے اسی پوربیہ سے کہا 'ہزاری جی صدر الصدور صاحب بڑی تکلیف میں ہیں، آپ کہہ کر دروازہ کھلوا دیجیے۔' ہزاری کا لفظ سن کر پوربیہ سنتری پھولا نہ سمایا اور اس نے کہا 'اچھا ہجور۔' اور اس نے باہر سے دستک دی اور اندر والوں نے فوراً اتنا دروازہ کھولا کہ مفتی صاحب کی فٹن داخل ہوگئی۔ شاید فٹن کے پیچھے لگے ہوئے دو چار آدمی اور کشمیری دروزاہ میں گھس آئے اور دربانوں نے جھٹ پٹ دروازہ بند کر کے قفل ڈال دیا۔ اگرچہ مفتی صاحب سے کسی نے کچھ روک ٹوک نہیں کی مگر مفتی صاحب نے شہر کو لٹتے کھسٹتے بے گناہوں کو ظالموں کے پنجے میں گرفتار ضرور دیکھا۔ مفتی صاحب اس جاں گداز سیر کو دیکھتے آنسو بہاتے اپنے دولت خانہ میں داخل ہو گئے۔'' [۱۲]

جمنا کے پل کو روند کر دلّی میں داخل ہونے والے وہ سپاہی تھے جو میرٹھ سے بغاوت کر کے دلّی پہنچ رہے تھے۔ ہندوستان بھر میں انقلابی سرگرمیوں کے ذریعے کمپنی کو ہندوستان سے نکال پھینکنے کے جذبے سے سرشار ہو رہے تھے۔ ان سپاہیوں کو روکنے کی بہت کوششیں کی گئیں مگر وہ روکے نہ جا سکے۔ سپاہیوں کے اولین گروہ ۹ بجے صبح دلّی کے دروازوں تک آ پہنچے تھے اور جلد ہی انھوں نے لال قلعہ کے دیوانِ خاص اور تسبیح خانہ میں پہنچ کر بادشاہ بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی درخواست پیش کی۔ انھوں نے بادشاہ کے سامنے بیرک پور، برہام پور اور میرٹھ کے تمام واقعات عرض کیے۔ انگریزوں کے مظالم، ناانصافی اور ملک دشمنی کا ذکر کیا اور یہ کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ ہمارے سروں پر اپنا ہاتھ رکھیں۔ ہماری سرپرستی کریں۔ سپاہیوں کی اس استدعا کا واحد مقصد یہ تھا کہ بہادر شاہ مغلوں کی روایت کے مطابق ہندوستان کے شہنشاہ بن کر راج کریں اور ہندوستان میں دوبارہ ہندوستانیوں کی حکومت بحال ہو جائے۔ بہادر شاہ کے لیے صورتِ حال ابھی تک واضح نہ ہو سکی تھی۔ اسے سپاہیوں کی طاقت، وسائل اور صلاحیتوں کا کوئی اندازہ نہ تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی غیر یقینی صورتِ حال کے سپرد نہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے

انگریزوں کی عسکری طاقت کا اچھی طرح سے اندازہ تھا اس لیے وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جس کے سبب مستقبل میں اسے مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کا حال مطمئن تھا اور زندگی شادمانی سے بسر ہو رہی تھی۔ سپاہیوں کا ساتھ دینے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انقلاب کی ناکامی سے اسے ان تمام آسائشات سے محروم ہونا پڑے گا۔ لہٰذا بہادر شاہ نے اس موقع پر نہایت ہچی تلی تقریر کی اور انقلابیوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے گریز کیا اور اپنے آپ کو اس انقلاب سے الگ رکھنے کی کوشش کی:

> ''سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں تو فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جد و آبا کے نوکر چاکر اپنے خاندان نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضہ سے ملک نکل گیا۔ قوت لایموت کو محتاج ہو گئے۔ خصوصاً میرے جد بزرگوار حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی کو جب غلام قادر نمک حرام نے قید کر کے نابینا کیا ہے تو پہلے مرہٹوں کو طلب کیا گیا تھا اور انھوں نے اس نمک حرام کو کیفر کردار کو پہنچایا۔ حضرت بادشاہ کو قید سے چھڑایا۔ چند سال مرہٹے بادشاہ کی جانب سے مختار رہے۔ مگر بادشاہ کے صرف مطبخ کا بندوبست بھی نہ کر سکے۔ لاچار ہو کر میرے دادا نے منجانب سلطنت برطانیہ رجوع کیا اور انگریزوں کو بلوا کر اپنے گھر کا مختار فرمایا اور ملک ہندوستان ان کے تفویض کیا اور ان لوگوں نے حسب دل خواہ اخراجاتِ شاہی کا بندوبست کر دیا اور ملک میں امن و امان کا ڈنکا بجا دیا۔ اس روز سے آج تک ہم لوگ بہ عیش و عشرت تمام بسر کرتے چلے آتے ہیں۔ ہمیں کسی طرح کا فکر و اندیشہ دامن گیر نہیں اور مال خوش حالی و فارغ البالی و عیش و عشرت سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں اس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ خود کر لیتے ہیں۔ میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں مجھے ستانے کیوں

آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھ سے کسی طرح سے توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمھارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمھاری صفائی کرا سکتا ہوں۔''[۱۴]

دلی میں میرٹھ کے انقلابیوں کی آمد کی خبر یورپین حلقوں میں تیزی سے پھیل گئی۔ یہ خبر سب سے پہلے مجسٹریٹ ہچنسن (Hutchinson) کو موصول ہوئی جو اس وقت کچہری میں مصروف کار تھا۔ اس کے بعد جج لے باس (Le Bas)، کمشنر سائمن فریزر اور سب سے آخر میں تھیوفلیس متکاف تک بھی پہنچ گئی۔[۱۵] ہچنسن (Hutchinson) اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر چھاؤنی کی طرف گیا تا کہ شہر میں داخل ہونے والے سپاہیوں کی روک تھام کرنے کے لیے فوج کو تیار کروایا جائے۔ کمشنر سائمن فریزر (Simon Fraser) کا سرکاری دفتر اور رہائش کشمیری دروازے کے شمال میں لڈلو کیسل (Ludlow Castle) میں تھی۔ جب یہ خبر لڈلو کیسل میں پہنچی تو فریزر اس وقت غسل خانے میں تھا۔ خبر سن کر وہ اچانک چونک اٹھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے واقعات کے بارے میں آگاہی کے لیے اسے ۱۰ مئی کی رات اطلاع موصول ہوئی تھی مگر اس وقت شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ کل صبح تک کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے اس نے حفظِ ماتقدم طور پر اقدامات نہ کیے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ رات گیارہ بجے میرٹھ سے آنے والے سوار نے اسے ایک چٹھی لا کر دی تھی۔ فریزر اس وقت نیند کے غلبے میں تھا۔ معمولی چٹھی سمجھ کر جیب میں رکھ لی اور سو گیا۔ فریزر دلی کا کمشنر اور گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ اس حیثیت سے وہ سب سے ذمہ دار افسر سمجھا جاتا تھا۔ وہ فوراً بگھی میں بیٹھ کر قلعے کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں انقلابیوں نے اس پر حملے کیے مگر وہ قلعے تک جا پہنچا۔ بہادر شاہ سے صلاح مشورے کے بعد اس نے انقلابی دستوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ انھیں خدا اور انجیل کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ بغاوت سے باز آ جائیں۔[۱۶] مگر سپاہی اس کی باتوں سے متاثر نہ ہو سکے۔ اسی دوران میں ایک سپاہی نے طیش میں آ کر کمشنر فریزر پر گولی چلا دی۔ نشانہ خطا گیا، گولی تسبیح خانہ کے ایک ستون سے جا ٹکرائی۔ قلعے کے کمان دار کیپٹن ڈگلس (Captain Douglas) کی رہائش قلعے کی

بالائی منزل پر تھی۔ فریزر اوپر جانے والی سیڑھیوں پر تلوار تھامے کھڑا تھا۔ قلعے کے محافظ دستے کا ایک اردلی مغل بیگ آگے بڑھا اور اس نے تلوار کے ایک ہی وار سے اسے گرادیا۔ اس کے بعد سپاہیوں نے کام تمام کردیا۔ ڈگلس (Douglas) کی رہائش گاہ میں اس روز کچھ مہمان بھی قیام پذیر تھے۔ اس کے مہمان جننگز (Jennings) نے صبح کے وقت نیلی سکوپ کی مدد سے پل کے پار سے آنے والی سپاہ کو کئی بار دیکھا اور خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ فریزر کے قتل کے بعد انقلابی سپاہ نے ڈگلس کی رہائش کا رخ کیا اور وہاں کپتان ڈگلس کے علاوہ کلکٹر ہچنسن (Hutchinson)، جننگز (Jennings) اور خواتین کو ہلاک کردیا۔

''دوپہر سے پہلے قلعہ کا صحن اور راہداریاں انقلابیوں سے پُر ہوچکی تھیں۔ وہ ننگی تلواریں لیے للکارتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بلا رہے تھے۔ یہ تھرڈ کیوالری، ۳۸ویں رجمنٹ اور میرٹھ انفنٹری (Meeruth Infantary) کے سپاہی تھے۔ دیوانِ عام میرٹھ سے آنے والے تھکے ہارے سپاہیوں کی بیرک (Barrack) بن گیا تھا جہاں وہ گند ڈال رہے تھے۔ پورے محل میں محافظ تعینات کردیے گئے تھے۔ بے بس بادشاہ کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے محل پر فوج نے قبضہ کرلیا تھا۔''[۲۰]

انقلابی سپاہ کی کارروائیوں سے دلّی شہر میں زبردست ہلچل مچ گئی تھی۔ سپاہی جگہ جگہ دوڑ دھوپ کرکے یورپین لوگوں کو تلاش کرکے تہِ تیغ کرتے جارہے تھے۔ پورے شہر میں جنگ جیسی حالت طاری تھی۔ 'دلی اردو اخبار' کے رپورٹر نے ۱۱رمئی کے ان چشم دید واقعات کو دیکھا تھا۔ ہم اس کی رپورٹ کے کچھ حصے یہاں درج کرتے ہیں جن سے ۱۱رمئی کا زندہ منظرنامہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

''کشمیری دروازے سے لوگ بلا تحاشا بھاگے چلے آتے ہیں۔ مگر چوں کہ حقیر کو تفریحِ طبع اور پاسِ خاطر اپنے ناظرین کا جان عزیز سے عزیز تھا۔ لہٰذا بے تکلف واسطے دریافت حال کے سیدھا اسی طرف روانہ ہوا کہ زیرِ کوٹھی سکنر صاحب (Skinner) پہنچ کر ایک آواز بندوقوں کی باڑ کی سامنے سے سنائی دی اور آگے چلا تو دیکھا کہ

صاحب بہادر پیدل شمشیر برہنہ درکف سراسیمہ و بدحواس بے تحاشا بھاگے چلے آتے ہیں اور پیچھے پیچھے ان کے چند تلنگے بندوقیں سر کرتے چلے آتے ہیں اور عوام شہر بھی کسی کے ہاتھ میں لکڑی اور کسی کے ہاتھ میں پلنگ کی پٹی، کسی کے ہاتھ میں بانس کا ٹوٹہ اس کے درپے چلے آتے ہیں۔ بلکہ بعضے بعضے آدمی شہر کے جی چلا کر دور سے مار بھی بیٹھتے ہیں۔ وہ سب انگریزوں کو لیے ہوئے جانب زینت باڑے سے نہر کی طرف لے چلے اور حقیر بجانب میدان نصیر گنج چلا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فخر المساجد کے آگے بیس پچیس تلنگے مسجد میں گئے اور پیہم بندوقیں مار کر سب کو بندوقوں کی راہ سے سیدھا ملکِ عدم پہنچا دیا۔ آگے بڑھے تو پیش گرجا گھر اور زیر کوٹھی کانس صاحب کو دیکھا کہ دو سو تین سو ترک سوار اور تلنگے کھڑے ہوئے ہیں اور ان میں متفرق ہو کر ادھر ادھر پھیلتے جاتے ہیں اور ایک ایک سے سوال ہے کہ بتلاؤ انگریز کہاں ہیں اور جو کوئی پتا نشان بتلاتا تھا ان ہی میں سے دو چار سپاہی فوراً اس کے ساتھ ہو لیتے تھے اور ایک آناً فاناً میں دیکھا گیا کہ جس کوچے میں دیکھو دو تین انگریز مرے ہوئے پڑے ہیں۔ ایک ایک کوٹھی میں گھس گھس کر انگریزوں کو مع زن و فرزند تیغ کیا اور جو بچ کر کسی کے گھر کوچہ و بازار کی موریوں میں جا چھپا وہ اس وقت بچ رہا۔ کوٹھیوں کا مال اسباب لٹ گیا۔ گرجا گھر اور کچہری کی تمام کرسیاں اور میزیں اور بلکہ فرش زمین وغیرہ سنگِ مرمر تک بھی لوگ اٹھا لائے۔ بعد تھوڑی دیر کے حقیر بطرف میگزین گیا تو مسجد نواب حامد علی خاں سے آگے بڑھ کر دیکھا کہ نکسن صاحب سر دفتر کمشنری کا لاشہ پڑا ہے اور کسی ظریف نے ایک بسکٹ بھی اس کے منہ کے ساتھ رکھ دیا ہے۔"[۲۱]

تقریباً دوپہر کے وقت دلّی بنک پر دھاوا بولا گیا، لوٹا گیا اور یورپین اسٹاف کو قتل کر دیا گیا۔[۲۲] بنک کے منیجر، بیوی اور خاندان نے بھاگ کر ایک عمارت کی چھت پر پناہ لی۔ مدافعت کا مظاہرہ کیا مگر بالآخر ہلاک ہوئے۔[۲۳]

دلی پریس کی انتظامیہ کا بھی یہی حال ہوا۔ اس صبح مطبع کے عیسائی کارکن کام کر رہے تھے مگر انتہائی دل برداشتہ اور خوف زدہ تھے۔ تار برقی صبح سویرے کی یہ خبریں لایا تھا کہ میرٹھ کے باغی دلی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور جلد ہی شہر کے دروازوں پر ہوں گے۔ دہلی گزٹ کا عملہ ہنگامی اشاعت میں یہ خبر شائع کر کے خود اپنی موت کے وارنٹ کا اعلان کر چکا تھا۔ دوپہر کے بعد دلی گزٹ پر بھی انقلابی سپاہ نے حملہ کیا، عملے کو ہلاک کر کے دفتر تباہ کر دیا۔[۲۴]

دلی کالج، دلی شہر کی سب سے ممتاز جدید علوم کی درس گاہ تھی۔ ۱۱ر مئی کی دوپہر کو یہ درس گاہ دلی کے شہریوں اور سپاہیوں نے لوٹ لی۔ اس درس گاہ کی میز کرسیاں، نہایت قیمتی سائنسی آلات، کتب خانہ، نقشہ جات وغیرہ لوگ لوٹ کر لے گئے۔ کمروں کی چوکھٹ اور دروازے تک نکال لیے گئے۔ مولوی ذکاء اللہ دلی کالج کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کالج کا کتب خانہ بری طرح لوٹا گیا۔ لٹیرے عربی، فارسی، اردو وغیرہ کی کتابیں گٹھریاں باندھ باندھ کر کتب فروشوں، مولویوں اور طلبہ کے پاس فروخت کرنے کے لیے لے گئے۔ ان لوگوں نے انگریزی کتب کے شیرازے توڑ کر ان کے پٹھے اتار لیے تا کہ جلد سازوں کے پاس پہنچ سکیں اور اوراق کو پھاڑ کر کالج کے باغ میں ڈھیر لگا دیے۔ آلات طبیعہ کو توڑ کر ان کا لوہا اور پیتل نکال کر لے گئے۔ عمارت کو آگ نہیں لگائی مگر کواڑ وغیرہ اتار کر لے گئے۔ سارا اسباب الماریاں، بنچ، کرسیاں، پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر کا گھر لوٹ لیا گیا۔[۲۵] دلی کالج کا پرنسپل ٹیلر بھی اسی ہنگامی حالت میں مارا گیا۔ دلی کے اعلا انتظامی افسروں میں سے شاید تھیوفلیس مٹکاف (Theophilus Metcalfe) ہی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ وہ دلی کے مشہور ریذیڈنٹ ٹامس مٹکاف (Thomas Metcalfe) کا بھتیجا تھا اور اس وقت شہر کا جوائنٹ مجسٹریٹ تھا۔ شہر کے اندر اس پر متعدد حملے ہوئے مگر وہ بچ گیا۔ شہر پناہ کے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ شہر کے باہر ایک عام آدمی نے اسے ایک پرانے غار میں پناہ دلوائی۔ انقلابی سپاہ نے غار کے اندر بھی اس کا پیچھا کیا۔ مٹکاف نے غار میں آنے والے ایک سپاہی کا سر قلم کر دیا جس پر سپاہیوں نے یہ سمجھ لیا کہ غار میں کوئی خبیث روح موجود ہے۔ سپاہی دہشت زدہ ہو کر واپس چلے گئے اور مٹکاف وہاں سے بچ کر آگے روانہ ہو گیا۔[۲۶] دلی کے کشمیری دروازے کے اندر کرنل جیمس سکنر (James Skinner) اپنے دور کی ایک داستانی شخصیت تھا۔ اس کی کوٹھی اپنی شان و شوکت کے سبب

بہت مشہور تھی۔ ۱۸۰۳ء میں دلی پر لارڈ لیک (Lord Lake) کے قبضے کے بعد سکنر (Skinner) کے اررگولر کیوالری یونٹس (Irregular Cavalry Units) سکنر ہاؤس (Skinner House) کے نام سے بہت مشہور تھے۔ اس نے نہ صرف فوج میں بڑا نام کمایا تھا بلکہ تجارت میں بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا۔[۲۷] اردو اخبار کے رپورٹر کے مطابق سکنر کی کوٹھی اس قدر لوٹی گئی کہ بیان سے باہر ہے۔[۲۸]

۱۱رمئی کے واقعات میں بہت اہم واقعہ دلی کے بارود خانے کا دھماکہ تھا۔ دلی کا معروف بارود خانہ کشمیری دروازے کے جنوب مشرق میں فصیل شہر کے ساتھ تھا۔ قلعہ سے دور نہ تھا۔ بارود خانے کی نگرانی یورپین افسروں کے سپرد تھی۔ شہر پر قبضہ کر لینے کے بعد سپاہیوں نے بادشاہ کی طرف سے یورپین عملہ کو بار بار یہ پیغام دیے کہ وہ عمارت کے دروازے کھول دے اور بارود خانہ انقلابی فوج کے سپرد کر دیا جائے۔ مگر ان پیغامات کا جواب نہیں دیا گیا۔ عملے نے ہر ممکن حد تک فوج کا مقابلہ کیا اور آخری حربے کے طور پر بارود خانے کو نذرِ آتش کر دیا۔ یہ شام چار بجے کا وقت تھا جب قیامت خیز دھماکے کی آواز سنائی دی تھی۔[۲۹] 'دلی اردو اخبار' کے مطابق شہر میں ایک زلزلہ بآوازِ مہیب معلوم ہوا تھا۔ یوں لگا کہ اسرافیل نے صورِ قیامت پھونک دیا ہو۔ غبار تیرہ و تاریک کرۂ ہوائی کی سطح تک چھا گیا اور اس میں سنگ ہائے دیوار مثل طیور و برگ ہائے درخت آندھی میں اڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔[۳۰] معین الدین کے بہ قول یوں لگا تھا کہ جیسے سو توپیں ایک ساتھ چھوڑی گئی ہوں۔[۳۱] دھماکے سے انقلابی کم مگر شہری لوگ زیادہ مارے گئے تھے۔ کم از کم پانچ سو لوگ ہلاک ہوئے تھے۔[۳۲]

۱۱رمئی کے انقلاب کے نتیجے میں دلی کے اندر کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور بہادر شاہ بادشاہ بن چکا تھا۔ مگر سپاہیوں کی بدنظمی، قیادت کے فقدان اور لوٹ مار کے واقعات کے باعث ۱۱رمئی کی شام آزادی کے جشن کی جگہ ایک ویران اور لٹے پٹے شہر کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ظہیر دہلوی نے شام کے وقت قلعے سے باہر نکلنے کے بعد جو منظر دیکھا وہ اس شام کا ایک تاثر پیش کرتا ہے:

> ''دیوانِ عام کے چوک میں ہوتا ہوا نقار خانہ کے دروازے سے نکل کر قلعہ کے لاہوری دروازہ سے باہر آیا۔ شام کی تاریکی پھیل گئی۔ جب میں اردو بازار کی سڑک پر آیا ہوں تو شہر میں سناٹا تھا۔ سڑک پر

ایک چڑیا نہ تھی۔ ایک عجیب بے رونقی تھی۔ شہر کھانے کو دوڑتا تھا۔ جابجا دوکانیں لوٹی پڑی تھیں۔ مکانوں کے دروازے بند تھے۔ روشنی کا نام نہ تھا۔ لالٹینوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ میں خونی دروازہ کے آگے ہوتا ہوا کوتوالی کے سامنے سے گزر کر چھوٹے دریبہ کے پھاٹک پر پہنچا اور چھوٹے دریبے میں چمڑے والوں، مٹھائی والوں اور بزازی کی دکانیں سب ٹوٹی ہوئی پائیں اور صراف کی دکان پر ایک افیونی فقیر برہمن زخمی پڑا ہوا تھا۔ وہ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ اس کی پشت کے اوپر تین زخم ہلکے ہلکے تلوار کے تھے۔''[۳۳]

۲۱ رمئی کو بھی شہر ہنگامی صورتِ حال میں گرفتار تھا۔ 'دلی اردو اخبار' جو انقلاب کا بڑا مداح تھا، کہتا ہے کہ شہر بہت لوٹا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ طریق اختیار کیے ہیں کہ تلنگوں کی صورت بنا کر شہر میں لوٹ مار کر رہے ہیں۔ انھوں نے میگزین اور انگریزوں کی کوٹھیوں سے بندوقیں، اسباب وآلات وغیرہ کی لوٹ مار کی ہے۔[۳۴] 'دلی اردو اخبار' اس بات کی مسلسل شکایت کرتا ہے کہ رعایا لوٹ مار کے سبب بہت تنگ، حیراں اور سرگرداں ہے۔ کیا شہری اور کیا باہر والے بیشتر لوٹ مار کر رہے تھے۔ تھانہ جات کی عمل داری اور طاقت پہلے کی نسبت عشر عشیر بھی نہیں رہی تھی۔[۳۵] شہر کی حالت یہ ہو چلی تھی کہ لوٹ مار کرنے والے پوربی سپاہیوں کو ساتھ لیے پھرتے تھے۔ جہاں کوئی مالدار گھرانہ دیکھتے تو سپاہیوں کو کھڑا کر کے اہل خانہ پر الزام لگاتے کہ یہاں میم چھپی ہوئی ہے یا انگریز موجود ہیں۔ اس بہانے سے وہ گھر کے اندر گھس کر تلاشی لیتے اور مال ودولت لوٹ لیتے تھے۔ یہ تو شہر کا حال تھا۔ ۱۲ رمئی کی صبح کو چھاؤنی میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ جلے ہوئے بنگلوں کے آثار موجود تھے۔ مال واسباب بکھرا پڑا تھا۔ یہاں تین دیسی پلٹنیں مقیم تھیں وہ توپ خانہ لے کر شہر میں آ گئی تھیں اور اپنے یورپین افسروں کو جہاں تک ممکن ہوا تہِ تیغ کر چکی تھیں۔ دلی شہر اور نواحی علاقوں کے تمام یورپین پہاڑی (Ridge) کے فلیگ اسٹاف ٹاور میں حفاظت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ دیسی سپاہیوں کو مکمل طور پر انقلابی روپ میں دیکھ کر اب ان کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ مقام محفوظ نہیں ہے۔ چناں چہ یہاں سے یورپین افسر مع ان کے خاندان چھپ چھپا کر انبالہ، میرٹھ اور کرنال جیسے مقامات کی طرف جاتے رہے۔

یورپین خاندانوں کے بہت سے بچوں اور عورتوں کو محل میں پناہ دی گئی تھی۔ بہادر شاہ کا حکم

تھا کہ ان کی حفاظت کی جائے مگر ۱۶ر مئی کو انقلابی سپاہ نے جوشِ انتقام سے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ ان کی تعداد پچاس تھی۔ اس حادثے سے خوف زدہ ہو کر سب یورپین فلیگ اسٹاف ٹاور سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۶ر مئی کے بعد دلی شہر اور چھاؤنی میں ایک بھی یورپین موجود نہ تھا۔[۳۶] دلی سے کمپنی کی حکومت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ شہر کا نظم و نسق اور انتظامی ڈھانچہ مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

ستمبر ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک (Lord Lake) کے دلی پر قبضہ کے بعد سے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء تک دلی شہر کمپنی کی انتظامیہ کے اہتمام سے چل رہا تھا۔ شہر کا کمشنر، مجسٹریٹ، ریذیڈنٹ اور دیگر افسران شہر کے انتظام، عدالتی نظام، امن و امان اور دیگر ضروری امور پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ اس میں قلعے سے متعلق معاملات بھی تھے (جو بہت حساس نوعیت کے حامل سمجھے جاتے تھے)۔ دلی شہر کا ریذیڈنٹ جو عموماً بہت منجھا ہوا افسر ہوتا تھا، یہ خدمات انجام دیتا تھا۔ بادشاہ، محل اور اہالیانِ قلعہ کی نقل و حرکت، دربار کے کوائف، شاہی خاندان کے عزائم حتیٰ کہ ان کے نجی معاملات کی بھی برابر خبر رکھی جاتی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ شاہی خاندان کسی بھی قسم کی منصوبہ بندی کا عزم کرے اور اس کی خبر ریذیڈنٹ تک نہ پہنچ سکے۔ قلعے کے اندر باہر اوپر سے نیچے تک ہر سطح پر کمپنی کے جاسوس اور گماشتے موجود رہتے تھے جو اپنے آقاؤں کو قلعے سے متعلق دن بھر کی روداد پیش کرتے تھے جس کی ایک مثال جیون لال ہے جو ہر شام قلعے کی رپورٹ شہر کے حکام کو پیش کیا کرتا تھا۔

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو شہر کا مجسٹریٹ تھیوفلیس مٹکاف (Theophilus Metcalfe) تھا۔ وہ ایک سخت گیر افسر تھا اور شہر کے امن و امان اور جان و مال کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ دلی کا کمشنر شہر کے مجموعی انتظامات کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ شہر کے تمام شعبوں کا جائزہ لیتا تھا۔ شہر میں عدل و انصاف کے لیے عدالتیں قائم تھیں جن میں یورپین جج مقرر تھے اور دلی شہر کے مفتی صدرالدین یہاں کے صدرالصدور بھی تھے۔ شہر میں لین دین اور روپے پیسے کی بچت اور حفاظت کے لیے دلی بنک موجود تھا جو شہر کے اقتصادی معاملات کے لیے یورپین طرز کی سہولتیں فراہم کرتا تھا۔ شہر اور سرکاری خبروں کی اشاعت کے لیے 'دلی گزٹ' (Delhi Gazette) تھا جس سے شہر کی ایک عمومی تصویر سامنے آجاتی تھی۔ اسی طرح سے کچہری اور خزانہ تھا جو شہر کی انتظامی اور مالی ضروریات کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شہر کے شمالی حصے میں دور تک چھاؤنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہیں دھیرج پہاڑی (Ridge) پر فلیگ

اسٹاف ٹاور (Flag Staff) تھا۔ چھاؤنی میں دیسی فوج کی پلٹنیں اور یورپین موجود تھے جو شہر کی حفاظت، مدافعت اور کمپنی کے استحکام اور تحکم کی علامت کا درجہ رکھتے تھے۔ چھاؤنی کی عسکری طاقت اور رعب و دبدبہ سے ہی دلی شہر کا عمومی ڈھانچہ خوش اسلوبی سے رواں دواں رہتا تھا اور شہر روزمرہ معمولات کے مطابق سوتا اور جاگتا تھا۔ کمپنی کے بنائے ہوئے اس ڈھانچے سے دلی شہر گزشتہ نصف صدی سے جاگیرداری تہذیب وثقافت کو سینے سے لگائے ہوئے اپنے دن پورے کر رہا تھا۔

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ کے سپاہی دلی میں داخل ہوئے تو یہاں کی صورتِ حال یکسر تبدیل ہوتی گئی۔ ان سپاہیوں نے پچھلی ایک صدی کا بدلہ لینے کے لیے غیر ملکی آقاؤں کو قتل کرنا شروع کیا یا ان کو شہر سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ان غیر ملکی آقاؤں کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی ان کا بنایا ہوا انتظامی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ شہر کا مرکزی انتظام، امن وامان، جان ومال کی حفاظت، انصاف، عدالتی نظام اور نوآبادیاتی چھاؤنی کی عسکری طاقت بھی بکھر کر رہ گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

۱۰ر مئی کی رات کو بہادر شاہ دلی کے علامتی بادشاہ کی حیثیت سے سویا تھا۔ مگر دوسری صبح باغی سپاہ نے اسے ہندوستان کا شہنشاہ بنا دیا تھا۔ اس بات کا گمان اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ کمپنی کا انتظام واہتمام ختم ہو جانے کے باعث جو بہت نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی، بہادر شاہ اس میں کوئی بھی کردار ادا کرنے سے گریزاں تھا۔ اس سیال سیاسی حالت میں وہ اندر سے خائف بھی معلوم ہوتا تھا کہ اگر انگریز آ گئے تو کیا ہوگا۔ اس لیے انقلابی سپاہ کے سامنے اس کا اندازِ تخاطب معذرت ہی کا تھا۔ وہ اس مشکل سے نکلنا چاہتا تھا مگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ مجبوراً اسے شہنشاہ بننا پڑا۔

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کے روز جب دلی کے لال قلعے میں بہادر شاہ کی شہنشاہی کا اعلان ہوا تو اس وقت شہر مکمل طور پر نراجیت کا شکار ہو چکا تھا۔ میرٹھ کے سپاہی، دلی چھاؤنی کی سپاہ اور شہر کے برے لوگ لوٹ مار میں لگ گئے تھے یا قتل و غارت کر رہے تھے۔ کمپنی کا انتظامی ڈھانچہ ٹوٹتے ہی یہ لوگ خود کو ہر قسم کی پابندی، قاعدے اور قانون سے آزاد سمجھنے لگے تھے۔ ان حالات میں شہر کا انتظام دلی کے بوڑھے شہنشاہ کی ذمہ داری بن گیا۔ کہولت کے باعث

اس کے لیے یہ بار گراں تھا۔ اس کے ساتھ ہی انقلابی سپاہیوں کی عسکری تنظیم کا کام بھی اسے سنبھالنا پڑا۔ اس کے بعد آنے والے ایام میں فوجی اخراجات کی ذمہ داری بھی اس کے سر آن پڑی۔ ایک بوڑھے بے اختیار شہنشاہ کے لیے واقعتاً ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا بہت ہی مشکل تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اسے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ تو ایک پنشن یافتہ شخص کی طرح گوشۂ عافیت میں زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ مگر ۱۱ر مئی کی سیاسی صورتِ حال نے اسے شہر، فوج اور مالیات سے متعلقہ تمام امور کو چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے پاس انتظام عامہ کو سنبھالنے کے لیے ذمہ دار افسر بھی نہ تھے۔ مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خاں اس کے خاص معتمد تھے مگر دونوں انگریزوں سے وفاداری رکھتے تھے۔ انھیں نئے انقلاب سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ بہادر شاہ کے شہزادے معاملات سلطنت کا کوئی تجربہ نہ رکھتے تھے۔ انتظامی اور عسکری تربیت ہی نہ ہو سکی تھی، اس لیے یہ لوگ کوئی قابلِ قدر خدمت انجام نہ دے سکے۔ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے دلی پر انگریزوں کے مکمل قبضے ۲۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء تک دلی شہر، عوام اور بہادر شاہ پے در پے مسائل اور مصائب کا شکار رہے۔ یہ سارے ایام انھوں نے شدید کشمکش میں گزارے۔

سپاہیوں کی انقلابی سرگرمیوں کے بعد دلی میں امن وامان، جان ومال اور نظم ونسق کو بحال کرنے کے لیے ایک دستور العمل کی ضرورت تھی۔ دلی کے نیشنل آرکائیوز میں ایک ایسا ہی دستور العمل موجود ہے۔ یہ جمہوری انداز کا دستور ہے۔ اس کے مطالعے سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دستور کے مرتب کرنے والوں کے ذہن برطانیہ کے دستوری تصورات سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ لوگ ہندوستان کے گورنر جنرل کی کونسل کے ڈھانچے سے بھی بہ خوبی آشنا تھے۔ ان مرتبین نے جس طرح انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ انگریزی بھی ضرور جانتے ہوں گے۔ دلی کا انتظام چلانے کے لیے ایک تنظیم بنائی گئی تھی جسے ''کورٹ آف ایڈمنسٹریشن یعنی جلسہ انتظام فوجی وملکی'' کا نام دیا گیا تھا جو دس ارکان پر مشتمل تھا اور اس کا ایک صدر مقرر کیا جانا تھا۔

دلی حکومت کا مرتب کردہ دستور کتنا موثر ثابت ہوا، اس بارے میں کہنا کچھ مشکل ہے۔ البتہ ہمیں دو ایسے موقعوں کے متعلق خبر ملتی ہے کہ جب کورٹ نے احکام جاری کیے اور سوچ بچار کی۔ ۸ر جولائی ۱۸۵۷ء کو کورٹ نے شہر کی لوٹ مار روکنے کے لیے احکام جاری کیے۔[۳۸]

اسی طرح سے حکیم احسن اللہ خان کے مکان کی حفاظت کے لیے کورٹ کی طرف سے متفقہ طور پر جاری کیے جانے والے حکم نامہ کا حوالہ ملتا ہے۔[۳۹]

شہر کی لوٹ مار دردِ سر بن گئی تھی۔ بہادر شاہ نے انقلاب کے دوسرے ہی دن شہر کے کوتوال کے نام حکم جاری کیا کہ لوٹ مار کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے۔[۴۰] تھانے داروں کو تاکید کی گئی کہ حاضر باش رہیں۔[۴۱] یکم جون کو شہزادوں کے نام حکم جاری ہوا کہ شہر کے انتظام کو دیکھیں۔[۴۲] چوں کہ بہادر شاہ کی حکومت شدید بحران سے گزر رہی تھی اس لیے بہادر شاہ حالات کے مطابق احکامات جاری کرتا رہتا تھا۔ کسی تجربہ کار اور مضبوط انتظامیہ کی عدم موجودگی میں سارا بوجھ ضعیف بادشاہ پر آپڑا تھا مگر وہ اس بڑھاپے میں بھی جو کچھ ممکن ہوسکتا تھا کرتا رہتا تھا۔ دراصل حکومت کا سارا انتظام Adhoc بنیادوں پر چل رہا تھا۔ فوج، انتظامیہ، عدلیہ اور مالیات کے سارے امور ہر آنے والے نئے دن کی ضرورت کے مطابق طے کیے جارہے تھے۔ بہادر شاہ کو جہاں بھی کچھ امید نظر آتی وہ حکم جاری کردیتا۔ ۲/ جولائی کو جب بخت خاں دربار میں حاضر ہوا تو اسے فوج کا سپہ سالار بنادیا گیا اور اسے کچھ خصوصی احکام بھی دیے گئے۔ ان میں یہ حکم بھی تھا کہ سپاہ کو قلعہ اور شہر سے نکال کر باہر رکھا جائے جہاں قیام کا بندوبست ہو۔ سپاہیوں کو سرزنش کی جائے۔ کوئی شخص رعایا کو تکلیف نہ دے۔ تنخواہ کا انتظام باقاعدہ کیا جائے۔ انتظام تحصیلات اور تھانہ جات پر نظر رکھی جائے۔[۴۳]

بخت خاں کے آنے سے حالات کچھ بہتر ہوئے، بہادر شاہ کی طرف سے اسے جنرل کا خطاب عطا کیا گیا۔ ایک ڈھال اور تلوار بھی ملی اور اسے کل افواج کا کمانڈر انچیف کردیا گیا۔ اس موقع پر حالات بہتر بنانے کے لیے بخت خاں نے جو کارروائیاں کیں ان کے بارے میں جیون لال اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:

> ''منادی کرادی گئی کہ پلٹنوں کے تمام افسروں کو ہدایت لینے کی غرض سے محمد بخت خاں کے پاس جانا چاہیے۔ مرزا مغل ایڈجوٹنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ محمد بخت نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ اگر کسی شہزادہ نے شہر کو لوٹنے کی کوشش کی تو میں اس کی ناک اور کان کٹوا دوں گا۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ 'تمھیں پورے اختیارات حاصل ہیں جو بہتر سمجھو کرو۔' اس حکم کی مطابقت میں شہر کے کوتوال کو اطلاع دے دی

گئی کہ اگر شہر میں مزید لوٹ مار ہوئی تو تمھیں پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا جو سپاہی لوٹتے ہوئے پکڑے جائیں ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ بخت خاں نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر میں حسب ذیل فوج کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہوں۔

چار پیدل فوجیں

سات سو سوار

چھ بھاری توپیں جنھیں کھینچنے کے لیے گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں

تین میدانی توپیں

چودہ ہاتھی

تین سو زائد گھوڑے جنھیں ہاپڑ کے سرکاری اصطبل سے حاصل کیا گیا ہے

ایک سو مجاہدین۔

فوج کو چھ مہینے کی پیشگی تنخواہ دے دی گئی۔ محمد بخت خاں نے کہا کہ میرے پاس چار لاکھ روپے موجود ہیں اور کہا کہ میں اب بادشاہ کو مزید امداد حاصل کرنے کی غرض سے تکلیف نہ دوں گا اور اگر میری فوجیں کامیاب ہوئیں تو میں زائد روپیہ خزانہ میں داخل کر دوں گا۔ بادشاہ نے بریلی کی فوج کی ضیافت کے لیے چار ہزار روپے دیے۔ فوجی دستوں کے تمام کمانڈروں کو حکم دے دیا گیا کہ جنرل بخت خاں سے احکام حاصل کریں۔ آگرہ کی فوج کے نام بھی اسی قسم کے احکام نافذ کیے گئے۔ جنرل نے منادی کرادی کہ تمام دکان داروں کو اپنے ہتھیار اپنے پاس رکھنے چاہئیں۔ جن اشخاص کے پاس ہتھیار نہ ہوں وہ ہیڈ کوارٹر سے طلب کر سکتے ہیں اور کسی حالت میں مکانوں کو غیر مسلح حالت میں نہ چھوڑا جائے۔ جو سپاہی لوٹ مار کرتا ہوا پکڑا جائے اس کے ہتھیار اس سے چھین لیے جائیں گے۔ جن اشخاص کے پاس گولہ بارود کا سامان ہو، انہیں چاہیے کہ وہ میگزین کے حوالہ کر دیں ورنہ سخت سزا دی جائے گی۔ پولیس کو حکم دیا گیا کہ جنرل کے دربار میں شہر دہلی کے تمام عمائدین کو شریک ہونے کے

لیے کہا جائے۔ جنرل نے میگزین کا معائنہ کیا اور حکم دیا کہ گولہ بارود، ذخائر اور سامان اسلحہ کو باقاعدگی سے ترتیب دیا جائے۔''[۴۴]

۳ر جولائی کو بادشاہ کی طرف سے جنرل بخت خاں کے اختیارات میں مزید اضافے کی منظوری دی گئی۔ اسے اختیار دیا گیا کہ لوٹنے والے اشخاص پر جرمانہ کردو اور مظلوم اشخاص کو تاوان دلاؤ۔ شہری انتظام، پولیس اور مال گزاری کے انتظامات اس کے سپرد کردیے گئے۔[۴۵] اسی روز ایک حکم کے ذریعے شہزادگان کو تمام فوجی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا گیا۔[۴۶] ۴ر جولائی کو بہادرشاہ کو خبر ملی کہ شہزادے شہر کی آبادی کو سخت تکلیف دے رہے ہیں۔ اگلے روز بادشاہ نے یہ حکم دیا کہ کوئی شہزادہ دربار میں شریک نہ ہونے پائے۔ تمام سرداروں کے نام احکام بھیجے گئے کہ تمام شہزادگان عتاب میں ہیں اگر وہ لوٹ مار کرتے پائے جائیں تو ان سے معمولی آدمیوں کا سا سلوک کیا جائے۔ ۷ر جولائی کو تمام پولیس افسروں کے نام احکام نافذ ہوئے کہ محمد قلی خاں کو پورے اختیارات دے کر شہر کا مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا ہے۔[۴۸]

بہادرشاہ کی انقلابی فوج کئی ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ دلی شہر کے اندر اتنی بڑی فوج کا قیام ممکن نہ تھا۔ شہریوں کے لیے زندگی کا یہ نیا تجربہ تھا۔ سپاہی لوٹ مار سے گریز نہ کرتے تھے اس لیے بالآخر تنگ آکر بہادرشاہ نے جنرل بخت خاں کی آمد سے بہت پہلے ۲۴ر مئی کو یہ حکم صادر کیا تھا کہ تمام فوجی پلٹنیں شہر کے باہر قیام کریں کیوں کہ شہر برباد ہو رہا ہے۔ شہزادگان کے لیے بھی یہ حکم تھا کہ وہ اپنی اپنی پلٹنوں کے ساتھ اپنے خیمے باہر لگائیں۔[۴۹] مگر اس حکم پر مناسب عمل نہ ہوسکا۔ جیون لال ۴ر جون کے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ سپاہیوں نے دلی دروازے کی دکانوں کو خالی کر کے ان کو بیرکوں میں بدل دیا ہے۔[۵۰] دلی میں جون سے اگست تک انقلابی سپاہی دوسرے شہروں سے اسلحہ، توپ خانے اور خزانے کے ساتھ مسلسل آتے رہے۔ ان ایام میں جب بھی کسی نئے لشکر کی آمد کی خبر ملتی، بہادرشاہ شہر کے کسی دروازے کے باہر اس کے قیام کا حکم دیتا تھا۔

بہادرشاہ کی نئی حکومت کے لیے انتظامی اور فوجی مسائل کے علاوہ کچھ اور سنگین مسائل بھی تھے، ان میں اہم تر مسئلہ تنخواہ کا تھا۔ سپاہی تنخواہ مانگتے تھے اور بہادرشاہ کے پاس اس مقصد کے لیے پیسہ موجود نہ تھا۔ تنخواہ نہ ملنے کے باعث سپاہی اور افسر بدتمیزی سے بھی گریز نہ

کرتے تھے۔ بہادر شاہ اکثر حالات میں شدید ردعمل کا اظہار کرتا تھا۔ بارود کی بھی کمی تھی۔ سپاہی پیٹ کے لیے روٹی اور توپ کے لیے گولی بارود چاہتے تھے۔ ان دونوں کا حصول بار بار آشوب کا باعث بنتا رہتا تھا۔

دلی کی نئی حکومت پیچیدہ مسائل کا شکار تھی اور دوسری طرف انگریز آہستہ آہستہ کرنال اور دوسرے مقامات پر جمع ہو رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے وہ دیسی سپاہ بھی حاصل کر رہے تھے۔ ان کا ایک ہی مطمحِ نظر تھا اور وہ تھا دلی کا دوبارہ حصول! ان کو پورا یقین تھا کہ وہ دلی پر دوبارہ قبضہ کر سکیں گے۔ کرنل کیتھ (Colonel Keith) نے ۳/اور ۱۳/جون کو اپنی بیوی کے نام خطوط میں بڑے یقین کے ساتھ لکھا تھا کہ ہمارا مقصد دلی کا حصول ہے اور اس کے لیے ہر شے کو قربان کر دینا چاہیے۔ فتحِ دلی کے بارے میں کیمپ کے اندر کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہے۔ مگر یہ فتح کب ہوگی اس کا فیصلہ ابھی ہونا ہے۔[۵۱]

دلی سے نکالے جانے کے بعد انگریزوں نے اپنی بکھری ہوئی فوجی طاقت کو بہت جلد منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان کے اندر شدید مزاحمت کے باوجود انھوں نے جلدی ہی ڈاک اور تار کا نظام بحال کر لیا تھا۔ شملہ اور کلکتہ سے ان کو برابر ہدایات موصول ہونے لگی تھیں۔ شمالی ہندوستان میں ان کی توجہ کا مرکز دلی شہر تھا اور وہ لوگ یہ سوچتے تھے کہ اگر ہم دلی پر قبضہ کر لیں تو بغاوت خود بہ خود سرد پڑ جائے گی۔[۵۲] چنانچہ دلی فتح کرنے کے لیے شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے انگریزی اور دیسی فوج کی تیاری شروع ہوگئی۔ سامانِ حرب، سپاہ اور خوراک کی وافر مقدار کے ساتھ ۲۴/مئی کو کمانڈر ان چیف جنرل آنسن (General Anson) انبالہ سے دلی کی طرف رخصت ہوا۔[۵۳] مگر راستے میں ۲۷/مئی کو ہیضہ سے دم توڑ گیا۔ اس کی جگہ ہنری برنارڈ (Henry Bernard) نے کمان سنبھال لی۔[۵۴] اسی روز بریگیڈیر ولسن (Brigadiar Wilson) نے میرٹھ سے دلی کی طرف کوچ کیا۔[۵۵] ۳۰/مئی کو اس کی فوج کے سات سو سپاہیوں نے دلی سے دس میل دور ہندن ندی کے قریب غازی الدین نگر میں سہ پہر کو پڑاؤ کیا۔ اس مقام پر دلّی کی انقلابی فوج نے تین ہزار سپاہیوں اور توپ خانے کے ساتھ بھرپور حملہ کر دیا۔ حکمتِ عملی یہ تھی کہ انگریز سپاہ کو دلّی پہنچنے سے پہلے ہی رستے میں برباد کر دیا جائے۔ دلّی کی سپاہ نے توپ خانے کو کامیابی سے استعمال کیا مگر انگریزی فوج کی شدید مدافعت اور بعد ازاں جارحانہ حملوں کی تاب نہ لا کر دلّی کی فوج نے میدان چھوڑ دیا اور دلّی کی طرف پسپا ہوگئی اور اپنے پیچھے پانچ توپیں چھوڑ گئی۔[۵۶] دلّی کی فوج

نے انگریزوں کو روکنے کے لیے دوسرا دفاعی مورچہ دلّی سے پانچ میل دور سرائے بادلی میں قائم کیا۔ درحقیقت یہ فیصلہ کن مقام تھا اگر انگریز یہاں شکست کھا جاتے تو پھر کچھ عرصے کے لیے فتح دلّی کا خواب ادھورا رہ سکتا تھا۔ مگر وہ لوگ نہایت منظم طور پر پورے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے پر تلے ہوئے تھے۔ ۷/جون کو کیپٹن ہوڈسن (Captain Hodson) ایک مختصر فوجی جیش کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے کے لیے نکلا تھا اور وہ قلعے کی دیوار کے قریب تک جا پہنچا تھا۔ اسی کی رپورٹ پر انگریز فوج نے آنے والے دنوں کا منصوبہ تیار کیا تھا۔[۵۷] ۸/جون کو دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ دلّی کے لشکر نے جان توڑ کر جنگ کی۔ توپچیوں نے عمدہ اور صحیح گولہ باری کی، مگر انگریزی فوج کے اچانک حملے سے ان کے قدم اکھڑ گئے اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد انقلابی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان کو کافی جانی نقصان ہوا۔ یہ کہا جاتا تھا کہ دلّی کی فوج کے ایک ہزار سپاہی واپس لوٹ کر نہ آسکے اور کئی سو شدید زخمی ہوئے۔[۵۸] دلّی کی ہزیمت خوردہ فوج مایوسی کی حالت میں شہر میں لوٹی مگر اس حالت میں بھی ان کے اندر سپاہیانہ شان قائم تھی۔ ان حالات کے ایک عینی شاہد کے مطابق:

> ''میں نے دیکھا کہ زخمی بکثرت شہر میں آرہے ہیں۔ ایک ایک زخمی کے ہمراہ تین تین چار چار پوربے لپٹے ہوئے اسے لیے چلے آتے ہیں۔ سڑک پر خون گرتا چلا جاتا ہے۔ تمام سڑک گلرنگ ہو رہی ہے اور خون کی افشاں بنتی چلی آتی ہے، جیسے ہولی میں زمین پر رنگ گرتا ہے۔ دو سوار میرے برابر سے نکلے میں نے دیکھا کہ ان کے سینوں پر گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے اور پشت پر بھبھاقے کھلے ہوئے تھے اور کلیجے اور پھیپھڑے کے ٹکڑے اور خون کے لختے پرچے پڑے تھے۔ دائیں ہاتھوں میں ان کے تپنچے اور بائیں ہاتھوں میں گھوڑوں کی باگیں تھیں اور کسی طرح کا کرب اور بدحواسی ان کے بشرے سے ظاہر نہیں تھی۔ اچھی خاصی طرح ان کے ہوش وحواس قائم تھے اور آپس میں باتیں کرتے چلے آتے تھے۔ مجھے آج تک اس امر کا تعجب ہے کہ اتنی دیر تک وہ زندہ اور سلامت کیوں کر رہے اور پانچ کوس تک زندہ کیوں کر چلے آئے۔ اس کے بعد ایک سوار گھوڑے کو بگٹٹ دوڑائے چلا آتا تھا اور

گھوڑے کی پیشانی پر گراب کے کاری زخم تھے اور خون اس میں سے اس طرح گرتا ہوا آتا تھا جیسے کہ لوٹے کی ٹونٹی سے پانی گرتا ہے اور اس کا تمام ماتھا اور تھوتھنی وغیرہ خون میں سرخ تھی۔ اس کے پیچھے ایک زخمی کو دیکھا کہ اس کا ہاتھ کہنی پر سے اڑ گیا تھا اور کٹے ہوئے بازو سے خون گرتا چلا آتا تھا اور اپنے پاؤں سے چلا آتا تھا اور دو ایک پوربیے اس سے کہتے ہوئے آتے تھے کہ ہم تم کو ہاتھوں پر اٹھا کر ڈیرے پہنچا دیں تو وہ کہتا تھا کہ نہیں میرے پاس نہ آؤ غرض کہ اسی طرح مجھے قلعہ پہنچنے تک صد ہا زخمی سوار پیدل ملے''۔[۵۹]

سرائے بادلی کی جنگ کے بعد انگریزی فوج کے لیے دلی جانے کا راستہ صاف تھا۔ ان لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو سکے دھیرج پہاڑی (The Ridge) پر اپنی چھاؤنی تک پہنچ جانا چاہیے۔ پہاڑی پر دلی فوج کا توپ خانہ موجود تھا۔ دفاع کے لیے سپاہی تھے، مگر یہ لوگ مختصر سی جھڑپوں کے بعد اپنا قبضہ چھوڑ کر شہر پناہ کے اندر جا پہنچے۔ ۸ر جون کو صبح کے نو بجے تھے کہ انگریزی فوج پہاڑی پر قابض ہو چکی تھی۔ دھیرج پہاڑی جسے انگریزوں نے Ridge کا نام دیا تھا، دلی شہر کے شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی اور شہر سے اس کی اونچائی ۲۴۰ فٹ تھی۔ اسی پہاڑی پر فلیگ اسٹاف ٹاور (Flag Staff Tower) تھا اور اس کے عقب میں انگریزوں کی چھاؤنی تھی۔ دلی کی انقلابی فوج کے لیے یہ پہاڑی دفاعی اعتبار سے بہت اہم تھی اور ہر قیمت پر یہاں قبضہ برقرار رکھنے کی ضرورت تھی۔ مگر انقلابی فوج میں اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا تھا۔ حالات کا تجزیہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلی کی دفاعی حکمتِ عملی کو شہر تک محدود کر دیا گیا تھا۔ یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ دھیرج پہاڑی کو بھی دفاعی منصوبے کا لازمی حصہ ہونا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پہاڑی کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا جاتا۔ اگر انگریز اس پہاڑی پر قبضہ نہ کر سکتے تو ان کے پاس اپنے دفاع کے لیے اس سے بہتر جگہ موجود نہ تھی۔ کیوں کہ یہ پہاڑی ہی تھی جو ان کے دفاعی مورچے کا کام دے سکتی تھی۔ چناں چہ موقع ملنے پر ایک بار جب وہ اس پر قابض ہو گئے تو اس کے بعد سپاہ دلی کی ساری طاقت اور ان کا جذبۂ حریت بھی انگریزوں کو اس جگہ سے نہ اکھاڑ سکا۔ آغاز میں ان کی حالت بہتر نہ تھی۔ فوج کی محدود نفری اور محدود سامانِ حرب کے ساتھ وہ بڑی احتیاط سے سپاہیوں کے حملے روکتے رہے۔ جوں

جوں ان کو مختلف اوقات میں عسکری کمک پہنچتی گئی وہ مضبوط ہوتے گئے اور بالآخر اتنے مضبوط ہو گئے کہ پہاڑی سے اتر کر دلی پر حملہ آور ہونے لگے۔ ۸/جون سے ۲۰/ستمبر (سقوطِ دلّی) تک کے ایام کی تاریخ دلّی شہر اور پہاڑی کے محاربات پر مشتمل ہے۔

انگریزوں کا پہاڑی پر قبضہ تو ہو گیا تھا مگر آغاز ہی سے انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کے لیے دلّی پر قبضہ کرنا کتنا مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسری بنگال رجمنٹ کے جونیر افسر لیفٹننٹ ایورٹ (Ewart) نے ۸/جون کو قبضہ کے بعد یہ لکھا تھا کہ میں جو سمجھتا تھا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم مختصر فوج کے ساتھ شہر پر قبضہ نہیں کر سکیں گے۔ بریگیڈئر اس سے متفق تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہماری فتح کا رستہ مشکل ہے اور ہم نہیں جانتے کہ کامیابی کے لیے ہمیں کتنی دیر تک لڑنا پڑے گا۔ پہاڑی پر موجود جونیر افسروں کا ایک گروہ یہ سمجھتا تھا کہ مزید رسد ملنے اور دفاع کو طاقت ور بنانے سے پہلے ہی دلّی پر حملہ کر دینا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکا دینے والے حملے سے سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔[61]

فوجی انجینئروں نے اس قسم کا ایک منصوبہ بنا کر جنرل برنارڈ (Bernard) کے حوالے کیا۔ فوج کے محتاط افسروں نے یہ رائے دی کہ اگر اس قسم کے حملے سے ہمارے فوجی دستے شہر کا محاصرہ توڑ کر اندر داخل ہو جائیں تو مزید کمک پہنچنے سے پہلے ہی ان کا صفایا ممکن ہو سکتا ہے۔ دو ہزار پیدل فوج کے دستوں کے لیے یہ کام دشوار ہوگا۔ چوں کہ تمام فوج حملے میں جھونک دی جائے گی اس لیے خالی رہ جانے والی چھاؤنی غیر محفوظ ہو جائے گی۔ بالآخر برنارڈ (Bernard) کو یہ منصوبہ سردست ملتوی کرنا پڑا اور وہ کمک کا انتظار کرنے لگا لیکن پہاڑی کے افسروں میں روز و شب دلّی پر حملے کے لیے بات چیت جاری رہتی تھی اور ایک عام تاثر یہ تھا کہ دلّی کا دوبارہ حصول روز بہ روز مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں جنرل برنارڈ سخت تھکاوٹ، مسائل کے فکر اور نیند کی کمی کے باعث ہیضہ کا شکار ہو کر مر گیا۔ اب کمانڈ بریگیڈئر ولسن (Wilson) کے سپرد ہوئی۔ وہ جب دلّی کی طرف دیکھتا تھا تو جنرل برنارڈ کی طرح یہ سوچتا تھا کہ مختصر فوجی طاقت کے ساتھ وہ دلّی پر کبھی بھی قبضہ نہ کر سکے گا۔

کیتھ (Keith) نے ۲۹/جون کے ایک مکتوب میں یہ لکھا ہے کہ بہت سے لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ دلّی شہر پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ نہیں کیا گیا، حالاں کہ یہ حملہ دیر سے متوقع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مٹھی بھر سپاہ کے ساتھ دلّی جیسے قلعے بند شہر پر حملہ کرنا جو ہزاروں مسلح

سپاہیوں کے دفاع میں ہے، پاگل پن ہے اور یہی رائے برطانوی کیمپ کے افسروں کی ہے۔ شہر کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی ہمیں نقصان پہنچنے کی صورت میں ہمارے خلاف اٹھ سکتی ہے۔[۶۳]

دلّی شہر کی فصیل سات میل تھی۔ گیارہ دروازے تھے جو پوری طرح مسلح تھے۔ چوبیس فٹ اونچی فصیل تھی اور اس کے آگے خندق۔ اس بڑے شہر کے حدود اربع پر قابو پانے کے لیے ولسن (Wilson) بالکل بے بس معلوم ہوتا تھا۔ پھر انقلابی سپاہ بڑی تعداد میں تھی۔ اس کے پاس کثیر مقدار میں توپیں تھیں۔ نہایت ماہر توپچی تھے کہ جن کے بارے میں برطانوی توپ خانے کے افسر یہ کہنے پر مجبور نظر آتے تھے کہ ہم ان کے نشانے کی تیزی اور صحت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

پہاڑی پر پنجاب سے کچھ کمک ملنے اور گورکھا یونٹ کے آنے سے حوصلہ افزائی ہوئی۔ گورکھاؤں کے ذمے ہندو راؤ ہاؤس کی حفاظت لگا دی گئی۔ یہ خاصی اہم اور بڑی عمارت تھی۔ باغی سپاہ نے یہاں پے در پے حملے کیے جو کہ پسپا کر دیے گئے۔ برطانوی افسران سے اتنے خوش تھے کہ ان کے ساتھ مل کر اپنے پائپ پیتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بھائی کہتے تھے۔[۶۴]

دلّی میں شدید گرمی تھی اور پہاڑی پر خیمے کے اندر درجۂ حرارت ایک سو تیس درجے تک جا پہنچتا تھا۔ جون کے آخر کی بارشوں نے کیمپ میں سیلابی حالت پیدا کر دی تھی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ پہاڑی پر کرکٹ کھیلی جاتی تھی جو بارشوں سے بند ہوگئی۔ Quotis کا کھیل بند ہوا اور اس کے ساتھ ہی گھوڑ دوڑ بھی ختم ہوگئی۔ فوجی بینڈ کے ترانے بھی خاموش ہوگئے مگر دلّی کی طرف سے ہونے والی گولہ باری جاری رہی۔

پہاڑی سے نیچے ٹوٹے ہوئے پیڑوں اور گھاس پھونس میں حملہ آور باغی فوجیوں کی لاشیں شدید گرمی میں پڑی سڑتی تھیں۔ پورے ماحول میں ان کی لاشوں کا تعفن اتنا شدید ہو جاتا تھا کہ برطانوی افسر اوڈی کلون (eau de cologne) میں رومال بھگو کر ناک کے آگے رکھتے تھے، مگر پھر بھی معمولی اثر نظر آتا تھا۔ کیمپ کے اندر صحتِ عامہ کی حالت خوف ناک تھی۔ ہیضہ اور دوسری بیماریاں عام تھیں۔ مگر پہاڑی پر خوراک اچھی اور وافر تھی۔ فیروز پور سے بھیڑوں کا ایک بڑا گلہ لایا گیا تھا۔ انبالہ کے میسرز پیک اینڈ ایلن (Peak & Allen)

نے پہاڑی پر ایک برانچ کھول دی تھی جہاں سے پاکٹ بکس سے لے کر ٹوتھ پاؤڈر، پین اور کاغذ، تمباکو اور صابن مہیا ہو سکتے تھے۔ بیر کی بوتلیں کثرت سے دستیاب تھیں۔[۶۵]

انقلابی فوج نے انگریزوں کو پہاڑی سے اکھاڑنے کے لیے مسلسل کوششیں کیں۔ ۸ر جون کو دوپہر کے بعد دو بجے انھوں نے ایک بھرپور حملہ کیا جو کامیاب نہ ہو سکا۔ شام پانچ بجے تک پہاڑی کیمپ توپوں کی گھن گرج سے خاموش ہو چکا تھا۔ انقلابی واپس جا چکے تھے۔[۶۶] ۱۲ر جون کو بھی انھوں نے انگریزی کیمپ کے دائیں بازو پر جان توڑ حملہ کیا مگر ناکام رہا۔[۶۷] اب انگریز فوج کو بہ خوبی احساس ہو گیا کہ وہ توپ خانے اور انجینئرنگ کے وسائل کی کمزوری کے باعث دلّی نہیں لے سکتے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ انقلابیوں کی توپیں اور ان کی کارکردگی برطانوی کیمپ سے برتر تھی۔ انقلابیوں کی طرف سے حملے جاری رہتے تھے اور پہاڑی سے جوابی گولہ باری کا سلسلہ معمول کے مطابق جاری رہتا تھا۔ ان جنگی محاربات کے بارے میں ہم ایک ہم عصر شہادت پیش کرتے ہیں جس سے اس جنگی فضا کا منظر کھنچ جاتا ہے:

> ''پہاڑی پر فریزر صاحب کی کوٹھی سے لگا کر باؤلے تک انگریزی فوج کے مورچے لگے ہوئے تھے، ادھر کشمیری دروازہ کے برج سے لے کر کابلی دروازہ کے سیاہ برج اور لاہوری دروازہ کے برج سے فراش خانے کی کھڑکی کے برج تک توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور باہم شبانہ روز گولہ باری ہوتی تھی اور شیل اور بم کے گولے شہر پر برستے تھے۔ بم کا گولہ خدا پناہ رکھے جس وقت پھٹتا تھا اور صدہا ٹکڑے اس کے اڑ جاتے تھے، اگر زمین پر پڑا تو دس گز زمین پیوست ہو کر پھوٹا اور تمام مکان کو اُڑا دیا۔ غرض کہ ایک قہرِ خدا تھا۔ دس دس گولہ برابر کاغذ کے پرچوں کی طرح شب کو اُڑتے چلے آتے تھے اور برابر پھٹتے چلے جاتے تھے۔ ادھر صبح ہوئی اور بگل بجنے شروع ہوئے اور فوج باغیہ کمر بندی کر کے لاہوری دروازہ کے باہر جا موجود ہوئی اور باہم گولی چلنے لگی۔ شام تک میدان داری رہی پھر اپنے اپنے ڈیروں پر آ موجود ہوئے۔''[۶۹]

برطانوی فوج ہر قسم کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے سراغ رسانی کے لیے بہت توجہ

صرف کررہی تھی۔ پہاڑی پر ولیم ہوڈسن (William Hodson) نے خفیہ خبر رسانی کے محکمہ کو بڑی چابک دستی سے چلا رکھا تھا۔ اس کے سپاہی مطلوبہ معلومات کے حصول کے لیے ہرروز پہاڑی سے شہر میں جاتے اور وہاں سے تازہ ترین خبریں اپنے مقرر کردہ جاسوسوں سے لے کر آتے تھے۔ جولائی کے وسط میں یہ خبریں آنے لگی تھیں کہ باغی سپاہی واپس بھی جارہے ہیں، ان کی تعداد ایک تہائی تک کم ہوچکی ہے۔ شہر والے ان سے پریشان ہیں۔ تنخواہوں کے مسئلے ہیں اور بارود کی قلت ہورہی ہے۔ ان خبروں سے متاثر ہوکر ہوڈسن (Hodson) دلّی پر جلد از جلد حملہ کرنے کی ترغیب دے رہا تھا مگر افسروں کی رائے یہ تھی کہ اس قسم کے حملے کا وقت گزر چکا تھا۔[۷۱] برطانوی فوج سے لندن میں یہ توقعات کی جارہی تھیں کہ وہ جلد سے جلد دلّی پر قبضہ کرلے گی، مگر یہاں حالت یہ تھی کہ انقلابی سپاہ کی مدافعت اور جارحیت زوروں پر تھی جس کے باعث پہاڑی پر حالات مشکل ہورہے تھے۔ ۲۷/جولائی کو انجینئرنگ کور کا افسر آرتھر موفٹ لینگ (Arthur Moffat Lang) لاہور سے دلّی پہنچا تو اسے یہ محسوس ہوا کہ دلّی فیلڈفورس (Delhi Field Force) کی حالت یہ ہے کہ وہ دلّی کا محاصرہ کرنے کی جگہ خود محصور ہوگئی ہے۔[۷۲]

ولسن (Wilson) کے اپنے خیالات بدل رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح پہاڑی پر متمکن رہنے میں کیا دانائی ہے۔ وہ اپنی افواج کی واپسی کے امکانات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ وہ اس فوج کو ملک کے دیگر حصوں میں استعمال کرنے کے حق میں تھا۔ اس کے اسٹاف کے افسر اس رائے کے حامی بھی تھے مگر بریڈ اسمتھ اس بات پر قائم تھا کہ دلّی کو چھوڑنا اور پنجاب کے ساتھ مواصلات کو ختم کرنا ایک بڑی غلطی ہے۔[۷۲] وہ اس بات پر مسلسل زور دیتا رہا تا آں کہ ۱۴/اگست کو پنجاب سے کمک پہنچ گئی اور اس کے ساتھ بریگیڈئر نکلسن (Nicholson) بھی تھا جس نے پہاڑی کے دل شکستہ ماحول کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور اس کی آمد کے ساتھ ہی انگریزوں کے کیمپ میں دلّی پر قبضے کا خواب حقیقت بنتا ہوا نظر آنے لگا۔ جان نکلسن (John Nicholson) کے ساتھ 4200 سپاہیوں کا لشکر آیا تھا۔ وہ ایک سخت جان افسر تھا، اس کا کہنا تھا کہ غدر 'چیچک کی طرح' ہے، اسے جتنی جلدی ممکن ہو کچل دینا چاہیے۔[۷۳] وہ باغی سپاہیوں کی کھال کھنچوانے اور ان کو چار چوب کرنے کے لیے مشہور تھا۔

پہاڑی پر برطانوی کیمپ کو مسلسل کمک پہنچ رہی تھی۔ ۴/ستمبر کو ہاتھیوں کا ایک قافلہ بھاری توپوں کے ساتھ آپہنچا۔ یہ توپیں دلّی شہر کا دفاع توڑنے کے لیے منگوائی گئی تھیں۔ بارود

کے کثیر ذخائر بھی سامان رسد کا حصہ تھے۔ اس اہم امداد کے باوجود برطانوی فوج کا کماندار آرچڈیل ولسن (Archdale Wilson) متذبذب تھا کہ حملہ کرے یا نہ کرے، وہ حملے کی ناکامی کے باعث ہونے والی تباہی سے خوف زدہ تھا۔ آخر کار دلّی کا پروگرام تیار کرلیا گیا۔ یہ منصوبہ طے ہوا کہ فصیل شہر کا وہ حصہ جو برطانوی کیمپ سے نزدیک تھا اسے توپ خانے اور بارودی سرنگوں کی مدد سے اُڑا دیا جائے اور جوں ہی موقع ملے فوج فصیل کے شگافوں سے شہر میں داخل ہو جائے۔

اب صورت یہ تھی کہ ادھر تو پہاڑی پر برطانوی کیمپ فیصلہ کن حملے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ یہ لشکر ہر قسم کے ہلکے اور بھاری ہتھیاروں سے مکمل طور پر لیس ہو چکا تھا۔ بڑھتے بڑھتے ان کی فوج کی تعداد 13000 (تیرہ ہزار) تک پہنچ چکی تھی۔ ان کی قیادت نہایت شاطر افسروں کے سپرد تھی اور وہ تن من کی بازی لگا کر دلّی فتح کرنے کا منصوبہ تیار کر چکے تھے۔ اس کے عین برعکس اس دور میں بہادر شاہ کی حکومت اور انقلابی فوج بدترین مسائل کا سامنا کر رہی تھی۔

اگست کے آخری ایام میں بہادر شاہ کی حکومت شدید مسائل میں الجھ گئی تھی اور ستمبر کے شروع سے اس حکومت کا الم ناک انجام صاف طور پر نظر آنے لگا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب پہاڑی (Ridge) پر قابض برطانوی فوج دلّی شہر پر حملہ کرنے کی آخری تیاریوں میں مصروف تھی۔ ان لوگوں کے عزائم پختہ تھے اور وہ فتح کے پورے یقین کے ساتھ دلّی شہر کے نقشے کو سامنے رکھتے ہوئے ایک زبردست حملے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں دلّی شہر کی سپاہ کا حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ مالی طور پر سپاہ پریشانی کا شکار تھی۔ وہ سپاہی جو ۱۱ر مئی سے قبل ہر مہینے کی مقررہ تاریخ کو تنخواہ وصول کرنے کے عادی تھے، اب اپنی تنخواہوں سے محروم تھے کیوں کہ بہادر شاہ کا خزانہ خالی تھا۔ فوج کو باقاعدگی سے تنخواہ کی ادائیگی کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے سپاہی اپنی ضروریات کو پورا نہ کر سکتے تھے اور وہ فاقہ کشی پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔ سن ستاون کے انقلاب کے دوران میں بعض فوجی سرداروں اور جاگیرداروں نے دلّی حکومت کی مالی مدد کی تھی مگر وہ کافی نہ تھی اس لیے بادشاہ شہر کے رؤسا سے مالی مدد مانگتا تھا یا پھر شہر کے مہاجنوں سے قرض لیا جاتا تھا۔ شہر والوں سے چندہ بھی اکٹھا کیا جاتا تھا اور اس سے فوجی اخراجات کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ فوجی بار بار یہ الزام لگاتے تھے کہ فوج کے لیے ملنے والی امداد کا ایک حصہ شہزادے خرد برد کر جاتے ہیں۔ اس لیے بہادر شاہ نے یکم ستمبر کو مجبور ہو کر یہ اعلان کیا تھا کہ شہزادوں کو چندہ

نہ دیا جائے۔ اگست کے وسط میں فوجیوں کا ایک گروہ مرزا مغل کو تنخواہ کی عدم ادائیگی کی بنا پر قتل کرنے گیا تھا اور شہزادہ ان سے ڈر کر روپوش ہوگیا تھا۔ ۶ ستمبر کی ایک رپورٹ کے مطابق بریلی کی فوج تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے کافی ہنگامہ کر رہی تھی۔

بہادر شاہ کی سپاہ کے لیے گولہ بارود کی فراہمی بھی مسئلہ بنی رہی۔ بارود ہر روز استعمال ہوتا تھا اور دلّی شہر میں بنایا جاتا تھا۔ ایک بڑا المیہ یہ ہوا کہ ۸ اگست کو انقلابی فوج کا بارود خانہ دھماکے سے برباد ہوگیا۔ یہ بارود خانہ بیگم ثمرو کی حویلی میں تھا جو چوڑی والان میں واقع تھی۔ وہاں سات سو من بارود ہر روز تیار ہوتا تھا۔ ۸ اگست کی سہ پہر کو اچانک دھماکہ ہوا جس سے کارخانے میں کام کرنے والے سات سو کاریگر دھماکے کی نذر ہوگئے تھے۔[75] اگست کے وسط میں صورت یہ تھی کہ روپے پیسے کی کمی کے سبب بارود خانہ بند پڑا تھا جو کچھ گولہ بارود وہاں تھا وہ بھی خراب ہو رہا تھا مگر اگست کے آخر میں بارود خانے نے دوبارہ کام شروع کر کے پچاس من بارود روزانہ تیار کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ صرف ایک روز کے استعمال کے لیے تھا۔[76] یکم ستمبر کو یہ خبر ملتی ہے کہ گندھک کی شہر میں شدید قلت ہے اس لیے بارود سازی رک گئی ہے۔[77] ستمبر کا مہینہ فیصلہ کن جنگ کا مہینہ تھا مگر اس مہینے میں بارود کی کمی تھی۔ انگریز دلّی پر آخری بڑے حملے کے لیے مورچے بنا رہے تھے اور ۱۳ ستمبر کو جنرل بخت خاں کے پاس بارود ختم ہو چکا تھا اور وہ توپ خانے کی کمان سے اپنی بڑی توپ کے لیے گولہ بارود حاصل کرنے کے لیے التجائیں کر رہا تھا۔ اس کی بڑی توپ بے کار کھڑی تھی۔ یہ توپ کشمیری دروازے تک مار کرتے ہوئے انگریزوں کے حملے کو پسپا کرتی تھی۔[78] اس توپ کے خاموش رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی فوج کشمیری دروازے کی فصیل پہ گولہ باری کر کے ایک بڑا شگاف ڈالنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور اسی شگاف سے بعد ازاں وہ لوگ شہر میں داخل ہوئے تھے۔

تنخواہوں کے نہ ملنے کے سبب انقلابی سپاہی بددل ہو کر آہستہ آہستہ فرار کا راستہ اختیار کرتے گئے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق شہر میں صرف پندرہ توپیں باقی بچی تھیں، ان میں سے چھ بریلی بریگیڈ کے پاس، پانچ نصیر آباد بریگیڈ کے پاس اور چار بادشاہ کے ذاتی دستے کے پاس تھیں۔ بارود خانے میں تقریباً ساٹھ من کچا بارود باقی تھا۔ گندھک کی از بس قلت مسئلہ بن گئی تھی۔ جو بارود بن رہا تھا وہ معیاری نہ تھا، اس لیے گوئل کے بارود سازوں

کو بلایا جارہا تھا تاکہ وہ یہاں آکر بہتر قسم کا بارود تیار کرسکیں۔[۷۹] ۱۶ر اگست تک صرف چار دنوں میں تین ہزار سپاہی فرار ہوگئے تھے۔ فرار ہونے کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ سپاہی فقیروں اور بیراگیوں کا بھیس بدل کر بھی بھاگنے سے گریز نہ کرتے تھے۔[۸۰] سقوطِ دلّی کے دنوں میں سپاہی تیزی سے شہر چھوڑکر جارہے تھے۔ صرف ۱۵ر ستمبر کو پوربی سپاہیوں کی دو پلٹنیں فرار ہوکر ریواڑی کی طرف چل دیں۔[۸۱] ایک دوسرے ریلے میں چار سو سوار رہتک کی جانب جارہے تھے۔[۸۲] بھاگنے والے سپاہیوں کی وجہ سے دلّی کی فوج بددل ہورہی تھی۔

مالی مشکلات، بارود کی قلت، تنظیم کی کمی اور قائدانہ صلاحیتیں میسر نہ آنے کی وجہ سے سپاہ دلّی کو بار بار ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ فوج کے اندر اتفاق اور قیادت کو تسلیم کرنے کا جذبہ نہ تھا۔ سردار باہمی رقابتوں اور کم تر درجے کی سیاست کا شکار تھے۔ وہ لوگ بہادر شاہ کا حکم ماننے سے گریز کرتے تھے۔ سپہ سالار جنرل بخت خاں کے احکام کی پروا نہ کرتے تھے۔ سپاہی شہزادہ مرزا مغل کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں مرزا مغل یہ چاہتا تھا کہ دلّی سے تمام افواج کو باہر بھیج دے اور جب دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج نہ ہو تو وہ خود انگریزوں سے جاملے اور انگریزی فوج شہر میں داخل ہوجائے اور صلے میں اسے دلّی کا بادشاہ مقرر کردیا جائے۔ اس الزام کے سلسلے میں ایک تحقیقاتی کمیٹی کا اجلاس بھی ہوا تھا۔[۸۳] ستمبر کے نازک ترین ایام میں اندرونی طور پر فوج کی حالت یہ تھی کہ تفرقہ مچا ہوا تھا، نصیر آباد اور میچ بریگیڈ شہزادہ مرزا مغل کے ساتھ تھے۔ بخت خاں کے بریلی بریگیڈ کے افسر اور مرزا مغل جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ اس بات کا بھی امکان ظاہر کیا جارہا تھا کہ شاید بریلی فوج کے افسر مرزا مغل کو قتل کردیں۔[۸۴]

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے قبل بہادر شاہ ظفر کو کمپنی کی طرف سے پنشن کے علاوہ دیگر مراعات بھی حاصل تھیں۔ ۱۱ر مئی کے بعد پنشن اور مراعات کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ آنے والے دنوں میں بہادر شاہ نے عیش و آرام کے ان دنوں کی مسرت کو یاد کیا۔ اسے اس بات کا قلق تھا کہ سپاہیوں نے اسے خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ اگر اس کا بس چل سکتا اور یہ ممکن بھی ہوتا تو وہ انگریزوں سے صلح کرنے میں گریز نہ کرتا۔ مگر انقلابی فوج نے اسے ہندوستان کا بادشاہ بنادیا تھا اور یہ بادشاہت اس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ سپاہیوں اور سرداروں کی نافرمانی، فوج کی نااتفاقی، مالی مشکلات کے آشوب اور دیگر مسائل نے اسے از بس دل

گرفتہ کر دیا تھا۔ سپاہی ہر روز تنخواہ کا مطالبہ کرتے تھے اور خزانہ خالی تھا۔ بہادر شاہ نے ہر ممکن حد تک ان کے مالی مطالبات پورے کیے مگر آخر آخر وہ انتہائی طور پر اعصاب زدہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے انجام کی تصویر بہ خوبی دیکھ چکا تھا، اس لیے ذہنی طور پر وہ بالکل شکست خوردہ انسان نظر آنے لگا تھا۔ حالات کے جبر کے ہاتھوں وہ بے حد مجبور اور مکمل طور پر لاچار ہو گیا تھا۔ شکست سے دو ہفتے پہلے فوج اور قلعے کے مابین مالی معاملات کے بڑھتے ہوئے تنازعات معمول بن چکے تھے۔ ہم ان تنازعات میں سے ایک کا منظر یہاں درج کرتے ہیں۔ یہ منظر نہایت افسوسناک تھا۔ یہ ۲ ستمبر کا واقعہ تھا:

> ''کچھ افسر اپنی تنخواہ کا مطالبہ کرنے شاہی محل گئے تھے۔ یہاں پر ہر عہدے کے تقریباً پانچ سو افسر، دیوان خاص میں شہزادہ مغل، مرزا ابوبکر اور مرزا خضر سلطان کو گھیرے کھڑے تھے اور بہ آواز بلند کہہ رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں ان کی تنخواہوں کی ادائیگی میں مداخلت کر رہا ہے۔ وہ شہزادوں کو قید کرنے اور حکیم احسن اللہ خاں کو قتل کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ان کی تنخواہیں نہ دی گئیں تو وہ شہر کو آپس میں تقسیم کر کے لوٹ مار شروع کر دیں گے۔ وہ اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے کافی دیر شور مچاتے رہے۔ مرزا مغل نے اپنی جان بچانے کے لیے آخر مرزا الٰہی بخش کو بلا بھیجا۔ وہ ان کو دلاسہ وغیرہ دے کر بادشاہ کے پاس لے گیا۔ بادشاہ نے کہا کہ اس کے پاس کوئی رقم نہیں ہے کہ وہ ان کو دے سکے۔ اس پر فوج کے افسروں نے دھمکی دی کہ وہ شاہی خاندان کے تمام افراد کو قتل کر کے محل اور شہر لوٹ لیں گے۔ یہ سن کر بادشاہ اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے تخت کی گدی ان افسروں کے سامنے پھینک کر حکم دیا کہ شاہی محل کے تمام نوادرات اور شاہی خاندان کی بیگمات کے زیور ان کے حوالے کیے جائیں۔ اس کے بعد وہ کعبے کی طرف رخ کر کے رونے لگا اور کہا کہ اسے اپنے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ اسے بھی اگر انگریزوں کے ساتھ قتل کر دیا جاتا تو اس کی اتنی بے عزتی نہ ہوتی۔ بادشاہ کو اس طرح زور

شور سے روتے دیکھ کر بیگمات اور وہاں پر موجود درباریوں کے بھی آنسو نکل آئے۔ فوج کے افسر اپنی لاچاری اور غربت کے باوجود یہ دیکھ کر شرمندہ ہوئے۔ اسی دوران مرزا مغل چالیس ہزار روپے لے آئے اور افسروں سے درخواست کی کہ وہ رقم اپنی تنخواہ کی ایک قسط کے طور پر لے لیں۔ بعد میں شہر کے معززین کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ سب محل میں جمع ہو گئے اور بادشاہ سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا۔'' ۸۵

ستمبر کے دوسرے ہفتے میں برطانوی فوج کا زور بہت بڑھ رہا تھا۔ فوجی رسد پہنچنے کے بعد یہ لوگ دلّی پر بڑے حملے کی تیاریوں میں تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے سراغ رسانوں سے بہادر شاہ کی سپاہ اور عسکری طاقت کا مسلسل جائزہ لے رہے تھے۔ وہ دلّی کی شہر پناہ کے ایک ایک حصے پر فوج اور توپ خانے تعینات کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دلّی پر حملے سے پہلے انھیں دلّی کے ہر علاقے اور ہر دروازے پر موجود عسکری قوت کا اندازہ ہونا چاہیے۔ اسی سلسلے میں ان کے مقرر کردہ ایک جاسوس نے بڑے حملے سے پہلے کمپنی کے محکمہ جاسوسی کو جو اطلاعات فراہم کی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دلّی کی سپاہ اپنی کم مائیگی اور اسلحہ کی کمزوری کے باوجود اپنی مدافعت کے لیے تیار تھی۔ ۱۰ر ستمبر کی اس اطلاع میں یہ معلومات دی گئی تھیں:

''آپ کے حکم کے مطابق میں کل شام شہر کے ہر حصے میں باغی فوج کا جائزہ لینے گیا تھا۔ قلعے میں اور لاہوری اور دہلی دروازوں پر پہرہ پہلے کی نسبت کافی سخت کر دیا گیا ہے اور انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر قسم کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ شہر کے ہر دروازے پر بھاری توپیں نصب ہیں۔ دیوانِ عام پر چار توپیں نصب کی گئی ہیں، ان کے ساتھ بارود کے چار چھکڑے بھی نصب ہیں۔ سلیم گڑھ کے قلعے کی حفاظت کے لیے مورچہ قائم کیا گیا ہے، اس کے چاروں طرف توپیں لگی ہوئی ہیں۔ کشمیری دروازے سے لے کر لاہوری دروازے تک فوج کا زبردست پہرہ ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ہر گھر میں نیچے سے لے کر اوپر تک سپاہی جمع

ہیں۔ کیولری کی فوج دریا کے کنارے لال ڈگی کے قریب متعین ہے۔ اس کی ایک بڑی تعداد دہلی دروازے کے قریب شاہی مسجد میں بھی موجود ہے۔ فوج کے کچھ سوار شہر میں بھی گشت کر رہے ہیں۔ شہر کے ہر دروازے پر ایک توپ نصب ہے۔ کشمیری دروازے میں اندر کی طرف چار توپوں کا مورچہ قائم کیا گیا ہے۔

ہر جگہ توپوں کی تعداد پہلے کی نسبت بڑھا دی گئی ہے۔ دیواروں پر پہرے کی تعداد پہلے کی نسبت بڑھا دی گئی ہے۔ اور پہرہ بھی بڑی مستعدی اور احتیاط کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ شہر میں نہر کے تمام پل قائم ہیں۔ دہلی اور میرٹھ کی رجمنٹیں بھی شہر میں ہیں۔ غازی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں ان کی اب علاحدہ پلٹن بنا دی گئی ہے۔''[۸۶]

انگریزی فوج کا محکمہ جاسوسی معلومات کے حصول کے لیے کسی ایک ذریعے ہی پر انحصار نہیں کرتا تھا۔ یہ لوگ مختلف ذرائع سے بھی معلومات حاصل کرتے تھے۔ اپنی حکمت عملی بنانے کے لیے وہ ہر ممکن طریقے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالخصوص دلی پر حملے سے عین پہلے وہ بڑی تندہی سے اس کام میں مصروف تھے اور ان کے جاسوس معلومات حاصل کرنے میں پوری کوشش کر رہے تھے۔ ۱۰ر ستمبر کی ایک رپورٹ ہم نے اوپر درج کی ہے، اب ۱۰ر ستمبر ہی کی ایک اور رپورٹ بھی درج کرتے ہیں جس سے سپاہِ دلی کی تیاریوں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے:

''شہر کے تمام دروازوں خصوصاً کشمیری، کابلی، لاہوری اور اجمیری کا دفاع مضبوط کر دیا ہے اور ان سب پر اب پہلے کی نسبت بڑا سخت پہرہ مقرر ہے۔ انگریزی فوج کی گولہ باری نے کشمیری دروازہ، کابلی دروازے اور پانی پت والے برج کے مورچے کو خاموش کر دیا ہے۔ شاہی برج بالکل تباہ ہو گیا ہے۔ برج سے لے کر گرجا گھر تک شہر کی دیوار مسمار ہو چکی ہے۔ باغیوں نے کابلی دروازے کو اینٹوں اور پتھروں سے چُن دیا ہے۔ لال دروازے کے صرف پھاٹک بند

ہیں۔قلعہ گھاٹ کے دروازے کا بھی یہی حال ہے، بڑی سخت تیاری کی جارہی ہے۔ مدرسہ غازی الدین خاں پر بارہ توپیں چڑھا دی گئی ہیں۔ کل حملے کی توقع کرتے ہوئے کوتوالی کے نزدیک لاہوری دروازے کی طرف جانے والی سڑک پر دو بھاری توپیں کھڑی کردی گئی تھیں اور ایک دوسری توپ لالہ ہرنرائن کے گھر پر چڑھا دی گئی تھی لیکن بعد میں ان تینوں توپوں کو وہاں سے ہٹالیا گیا۔

کشمیری اور لاہوری دروازوں کے درمیان چوراہے پر بھی مورچہ بندی کی جارہی ہے۔ یہاں پر بھی کچھ بھاری توپیں لاکھڑی کی جائیں گی۔ باغیوں نے شاہی برج کے نیچے ریت کے بوروں کا مورچہ قائم کرلیا ہے۔شہر کی فصیل میں جو شگاف پڑ گئے تھے انھیں بھی ریت کے بوروں سے بند کردیا ہے۔ شاہی قلعے میں فوج کی دو رجمنٹیں موجود ہیں، ان میں سے ایک سلیم گڑھ پر پہرہ دینے کے لیے مقرر ہے۔ بادشاہ کا حفاظتی دستہ بھی اررگولر کے دوسو سواروں کے ساتھ قلعے میں موجود ہے۔ دیوانِ عام پر تین بھاری توپیں نصب کردی گئی ہیں۔ قلعے کی دیوار کے سامنے دہلی اور لاہوری دروازوں پر بھی ایک ایک توپ نصب ہے۔"[۸۷]

۱۲ر ستمبر کو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ باغی سپاہ نے کشمیری دروازے کے اندر سڑک کے دونوں طرف پتھر چُن کر مورچے قائم کرلیے ہیں۔ کشمیری اور کابلی دروازے کے درمیان بھی ایک مورچہ قائم ہے۔شہر کی فصیل پر توپیں لگا دی گئی ہیں۔ ۱۶ر ستمبر کی ایک رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ بے شمار سپاہی اب بددل ہوکر اپنے گھروں کو جارہے ہیں۔ باقی فوج دلّی میں رہ کر چار دن مسلسل انگریزوں کا مقابلہ کرے گی اس کے بعد وہ اپنے سامان کے پیچھے بھاگ نکلے گی۔ یہ فوج مورچوں سے اپنا سامان نکال کر گوالیار کی طرف روانہ کرچکی ہے۔ اگر انگریزی فوج نے ان کا پیچھا کیا تو ان کا حفاظتی دستہ مقابلہ کرے گا۔ چوں کہ انگریزی فوج پہلے ہی تھکی ہوگی وہ زیادہ دور تک ان کا تعاقب نہ کرسکے گی۔ شاہی قلعے کی فوج اپنے مورچوں پر لڑکر جان دینے کے لیے تیار ہے۔"[۸۸]

ستمبر ۱۸۵۷ء میں حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے، مگر ان ابتر حالات کے باوجود دلّی کی فوج میں ایسے دلیر سپاہیوں اور جاں باز افسروں کی کمی نہ تھی جو بھوک ننگ اور آلاتِ حرب کی قلت کے باوجود انگریزی فوج سے مرتے دم تک لڑنے کا تہیہ کر چکے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے دلّی کا دفاع کرنے میں خون کا آخری قطرہ تک بہادیا تھا۔

انگریزی فوج نے ۸ر ستمبر کو کشمیری دروازے، موری دروازے اور کابلی دروازے سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر کافی تعداد میں فصیل شکن توپیں نصب کر کے فصیل اور قلعے پر گولہ باری شروع کردی تھی۔ ایک طرف سے انگریزی مورچوں کی گولہ باری سے شہر پر آگ برس رہی تھی اور دوسری طرف شہر کی دیواروں سے ان مورچوں پر جواباً آگ برسائی جارہی تھی۔ میجر ریڈ (Major Reid) کے بہ قول اس نے بنگال آرٹلری کے توپچیوں سے زیادہ نشانہ باز توپچی اپنی زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ یہ وہی توپچی تھے جو شہر کی لرزتی ہوئی دیواروں سے انگریزوں کے مورچوں پر آگ برسا رہے تھے۔ انگریزوں کے بھاری توپ خانے کی اندھا دھند بمباری ۱۳ر ستمبر تک برابر جاری رہی۔ اس بمباری کا مقصد کشمیری دروازے کی مضبوط فصیل میں ایک بڑا شگاف ڈالنا تھا اور یہ مقصد پورا ہو چکا تھا اور ۱۳ر ستمبر کو پچاس فٹ چوڑا شگاف نمودار ہو چکا تھا۔[۸۹] اسی شام کو نکلسن نے انجینئر لینگ (Lang) کو فصیل کا معائنہ کرنے کا حکم دیا۔ رات دس بجے توپ خانہ خاموش ہوا اور لینگ نے معائنہ کر کے تصدیق کردی کہ فوج شگاف کے ذریعے شہر میں داخل ہوسکتی ہے۔[۹۰] اب شہر پر حملہ شروع کیا گیا، یہ حملہ چار مختلف حملہ آور دستوں نے شروع کیا تھا۔ اس بڑے اور فیصلہ کن حملے کی کمان نکلسن (Nicholson) کے سپرد تھی۔ شہر کی فصیلوں اور اندرونِ شہر سے انقلابی فوج شدید مزاحمت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ گولہ بارود کی کمی کے باوجود ان لوگوں نے بڑی جاں بازی کا مظاہرہ کیا جس سے انگریزی فوج کو نقصان پہنچا۔ ۱۳ر ستمبر سے ۱۸ر ستمبر تک خوف ناک جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ان ایام کے بارے میں ظہیر دہلوی نے چشم دید واقعات قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''لاہوری دروازے سے لگا کر کابلی دروازے کی نہر تک تمام تیلی واڑہ کے میدان میں پھیلی ہوئی ترمن تھی اور انگریزی فوج کے اور اس کے درمیان فقط ایک نہر حائل تھی اور برابر دونوں طرف سے

بندوق کی باڑ جھڑ رہی تھی اور پہاڑی کے مورچوں کی توپیں اور دستی توپ خانے داغ رہے تھے۔ علیٰ ہذا القیاس پوربیوں کی طرف سے لاہوری دروازے کے برج کی توپیں گھوڑ چڑھی اور بیل براتری توپ خانے سب چل رہے تھے۔ گولہ، گراب اور باڑوں کا دونوں طرف سے مینہ برس رہا تھا۔ اس دن شہر کی زمین اور مکانات اور سب دیوار و در لرز رہے تھے۔ بندوقوں کی باڑیں متصل جاری تھیں۔ لڑائی کیا قیامت کے آثار نمودار تھے اور مصداق اِذا زُلزِلَتِ الارضُ زِلزَالَھا کا آشکار تھا۔ خدا جانے طرفین سے تین سو توپ چل رہی تھی یا چار سو توپ کی باڑھ جھڑ رہی تھی، اس کا علم خدا کو ہے۔ غرض کہ یہ کیفیت صبح کے پانچ بجے سے شروع ہوئی تھی اور دس بجے تک یہ قیامت برپا رہی۔"

شہر کی فصیل کو پار کر کے انگریزوں کی فوج کے دستے بالآخر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک جا پہنچے تھے۔ ان دستوں کا مقابلہ شہر کے لوگوں نے کیا:

"ایک بزن انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آ پہنچا تھا اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے، ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں۔ مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے انھوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آ کر کشت و خون کریں گے، آؤ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اُتر کر ان سے سمجھ لیں۔ یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر سے اترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقیں سر کیں مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ ایک غل شور برپا اور بلوہ ہو گیا۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے لے کر دوڑ پڑے۔ اس بزن میں سے کچھ مارے گئے جن کی لاشیں موجود ہیں اور باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے۔ میں یہ تماشا دیکھتا ہوا بڑے دریبے میں ہو کر

خونی دروازے سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہنچا۔ میں نے جامع
مسجد سے لگا کر کوتوالی تک لاشیں برابر پڑی دیکھیں۔''[۹۱]

انقلابی فوجیوں نے انتہائی دلیری کے ساتھ تمام معرکوں میں مقابلہ جاری رکھا تھا اس لیے ایک مرحلے پر انگریزی فوج کا کمان دار ولسن (Wilson) حملہ ختم کر کے کیمپ میں واپسی کا منصوبہ بنا رہا تھا مگر اس مرحلے پر نکلسن (Nicholson) نے (جو ایک جنگ میں شدید زخمی ہو کر اپنے خیمے میں پڑا مر رہا تھا) زبردست مخالفت کی اور حملہ جاری رکھنے پر زور دیا۔[۹۲] ۱۸ر ستمبر کو دلّی شہر میں صبح نو بجے سورج گہن دیکھا گیا۔[۹۳] دلّی کے لیے اسے سقوط کی علامت سمجھا گیا۔

۱۹ر ستمبر کا دن اہلِ دلّی اور لال قلعے پر بہت بھاری تھا۔ انگریز شہر کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر چکے تھے اور ان کی آخری منزل قلعہ تھا۔ اس روز بہادر شاہ نے اہلِ خاندان کو الوداع کہا۔ بہادر شاہ کی بیٹی کلثوم زمانی بیگم نے اس دردناک رات کے واقعات بیان کیے تھے، اس کا کہنا تھا کہ جس وقت میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لٹنے کا وقت آیا تو دلّی کے لال قلعے میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ در و دیوار پر حسرت برستی تھی۔ اجلے اجلے سنگِ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ ہم سب اسی یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظلِ سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔ آدھی رات کے وقت سناٹے کا عالم طاری تھا۔ گولوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے۔ حضور مصلے پر تشریف رکھتے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی۔ میں جھک کر تین بار مجرا بجالائی۔ حضور نے نہایت شفقت سے فرمایا، کلثوم! لو اب تم کو خدا کو سونپا۔ قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں پر کیا کروں ساتھ رکھنے میں تمھاری بربادی کا اندیشہ ہے۔ پھر حضور نے رعشہ سے کانپتے ہوئے دستِ دعا اٹھائے اور دیر تک بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے رہے۔[۹۴] ۱۹ر ستمبر کو علی الصبح بہادر شاہ نے لال قلعے کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر درگاہ نظام الدین اولیا کا رُخ کیا[۹۵] جہاں وہ کچھ دیر کے لیے رُکا۔ اس وقت بادشاہ پر عجیب ہراس اور مایوسی کا عالم طاری تھا۔ چند مخصوص خواجہ سراؤں اور کہاروں کے سوا کوئی آدمی ساتھ نہیں تھا۔ فکر و اندیشہ سے بادشاہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور گرد و غبار سفید داڑھی پر جما ہوا تھا۔ بادشاہ نے درگاہ کے خدام میں سے شاہ غلام حسن سے کہا کہ مغلیہ حکومت کا

چراغ دم توڑ رہا ہے اور کوئی گھڑی کا مہمان ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک صندوقچہ اہلِ درگاہ کے سپرد کیا، جس میں حضورؐ کی ریش مبارک کے پانچ بال تھے جو قسطنطنیہ کی فتح کے بعد امیر تیمور کو سلطان یلدرم بایزید کے خزانے سے ملے تھے۔ درگاہ میں بہادر شاہ نے بھوک مٹانے کے لیے کچھ طلب کیا تو ایک خوان بیسنی روٹی اور سرکے کی چٹنی کا آراستہ کر کے پیش کیا گیا جسے بادشاہ نے تین وقت وقفے کے بعد کھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور پھر یہاں سے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ حاصل کی۔[۹۶]

شہر پر قبضہ مکمل کرنے کے بعد ۱۹ر ستمبر کی رات کو لال قلعے کے سامنے توپیں لگا دی گئی تھیں۔ اگلے روز دلّی بنک کے ویرانے سے انگریزی فوج توپوں کی گولہ باری کے سائے میں قلعے کے دروازوں تلے بارود بچھانے کے لیے بڑھی مگر یہاں انھیں مدافعت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد قلعے کا آدھا دروازہ دھماکے سے گر پڑا۔ اس کے بعد فوج کا ایک کپتان فریڈ میسی (Fred Maisey) اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلیم گڑھ میں ہے اس لیے یہ پارٹی پُر جوش انداز میں یہ سوچ کر آگے بڑھے کہ وہ بادشاہ کو گرفتار کر سکیں گے، مگر وہاں بادشاہ نہ تھا۔ یہ لوگ پھر لال پردے کے راستے سے آگے بڑھے۔ وہ شاہی خاندان کے افراد کو تلاش کرتے رہے، ان کا خیال تھا کہ وہ لوگ اب بھی قلعے کے اندر تھے۔[۹۷]

دیوانِ خاص کے فرش پر برطانوی سپاہیوں کے بوٹوں کا شور تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ یہاں کی ہر شے لوٹی جا رہی تھی۔ وحشی سپاہی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے تھے۔ بندوق کی گولیاں تالے توڑ رہی تھیں۔ ایک گروہ عجیب قسم کے صندوقچے کھول کر جواہرات تلاش کر رہا تھا۔ دوسرا گروہ مصوری کے نمونے، کتابیں، بندوقیں، پستولیں لوٹ رہا تھا۔ کچھ لوگ مٹھائیاں اور شربت اٹھا رہے تھے۔[۹۸]

۲۰ر ستمبر کی رات کو برطانوی سپاہیوں نے جامع مسجد میں رقص کیا اور سکھوں نے فتح کی خوشی میں گولیاں چلائیں۔ جنرل ولسن اور اس کے ہیڈ کوارٹر کا اسٹاف لال قلعے کے دیوانِ خاص میں منتقل ہو گیا جہاں فتح کی خوشی میں اس رات انڈوں اور سور کے گوشت کا کھانا شاہجہاں کی بنائی ہوئی پُر شکوہ عمارت میں کھایا گیا اور ملکہ وکٹوریہ کے نام پر شراب پی گئی۔[۹۹] شاہجہاں کے دیوان خاص میں انگریز افسر اور سپاہی دوڑ دوڑ کر دیوانہ وار تختِ شاہی پر بیٹھ رہے تھے۔[۱۰۰]

سنگِ مرمر کے در و دیوار رات بھر برطانوی افسروں کے نعروں اور قہقہوں سے گونجتے رہے اور وہ دیوانگی کے عالم میں شراب کے نشے میں چور ہوکر ناچتے رہے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ایک طویل زمانے تک ہندوستان کی قسمت کے فیصلے ہوتے رہے تھے۔ جہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بہت سے شاہی آداب بجا لانے پڑتے تھے اور یہ مقام مغلوں کی عظمت اور جلال و جمال کی علامت تھا۔ ۲۰ ستمبر کی رات کو برطانوی سپاہ کے پاؤں اس مقام کو روند رہے تھے۔

۲۱ ستمبر کو ولسن کے لیے سب سے اہم مسئلہ اس ٹھکانے کی نشان دہی کا تھا جہاں دلّی کا آخری بادشاہ پناہ گزیں تھا۔ برطانوی سپہ سالار (ولسن) نے یہ کام محکمہ سراغ رسانی کے نگراں افسر کیپٹن ہوڈسن (Hodson) کے سپرد کیا تھا جو نہایت خودسر اور ازبس سنگ دل انسان تھا۔ ہوڈسن (Hodson) نے بہادر شاہ کی تلاش کا فریضہ منشی رجب علی کو تفویض کیا تھا جو مقامی سراغ رسانوں کا افسر اعلا تھا۔ اس کام میں مرزا الٰہی بخش کی مدد بھی حاصل تھی۔ رجب علی کے سراغ رسانوں نے یہ خبر مہیا کی تھی کہ بادشاہ منتخب اہلِ خاندان کے ساتھ مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہے۔ یہ اطلاع ہوڈسن (Hodson) کے ذریعے ولسن (Wilson) تک پہنچ چکی تھی اور ولسن (Wilson) نے بادشاہ کو گرفتار کرنے کا کام ہوڈسن (Hodson) ہی کے سپرد کیا تھا اور اسے بادشاہ اور خاندان کی جاں بخشی کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔[۱۰۱]

۲۰ ستمبر کو سقوطِ دلّی کے بعد جنرل بخت خاں اور دیگر سرداروں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ درخواست کی تھی کہ وہ لشکر کے ساتھ اودھ اور روہیل کھنڈ چلے جائیں جہاں جنگ کو جاری رکھا جائے گا اور ہندوستان بادشاہ کے نام پر جنگ کرے گا۔ اس تجویز کے خلاف مرزا الٰہی بخش نے بات کی۔ بادشاہ کو اس کے بڑھاپے اور زوال کا احساس دلا کر بددل کیا۔ نتیجتاً اس نے بخت خاں کا ساتھ نہ دیا اور مقبرہ ہی پہ رُکا رہا، جہاں ہوڈسن اور اس کے سپاہی گرفتاری کے لیے آپہنچے۔ ہوڈسن نے بادشاہ اور خاندان کے چند افراد کی جاں بخشی کا وعدہ کرکے اسے گرفتار کیا اور قلعے کی طرف روانہ ہوگیا جہاں بادشاہ اور ملکہ زینت محل کو ایک نہایت ادنیٰ مکان میں نظر بند کردیا گیا۔ برطانوی سپہ سالار ولسن (Wilson) نے ۲۲ ستمبر کی دوپہر کو لال قلعے کے محل شاہی سے ایک مکتوب لکھتے ہوئے اس مکان کو بادشاہ کے لیے honourable confinement کہا تھا۔ ہوڈسن نے شاہی خاندان سے جو ہتھیار حاصل کیے تھے اس میں سے شہنشاہ جہانگیر کی تلوار اسے ولسن نے لینے کی اجازت دی۔[۱۰۲]

بہادر شاہ کی گرفتاری کے بعد کمپنی کی افواج کے لیے دوسرا اہم مسئلہ شہزادوں کو گرفتار کرنے کا تھا۔ اس مقصد کے لیے بھی ہوڈسن (Hodson) کو مقرر کیا گیا تھا۔ اس مہم کا حال ہوڈسن کے بھائی نے اپنی کتاب 'Twelve years in India' میں لکھا تھا۔ ہوڈسن نے یہ کام نہایت مکاری اور سفاکی سے انجام دیا تھا۔ اس کے بھائی نے اس مہم کا حال یوں بیان کیا ہے:

"کیپٹن ہوڈسن اور لیفٹننٹ میکوڈ وول ضروری اجازت لینے کے بعد ایک سو چیدہ سواروں کو لے کر (ہمایوں کے) مقبرے کی طرف گئے اور وہاں پہنچ کر رجب علی اور شہزادوں کے ایک چچازاد بھائی (مرزا الٰہی بخش سے مراد ہے) جس کو جاں بخشی کے وعدے پر خریدا جاچکا تھا، شہزادوں کے پاس یہ منوانے کے لیے بھیجا کہ وہ خود کو غیر مشروط طور پر حوالے کردیں ورنہ انجام کی ذمہ داری ان پر ہوگی۔ مقبرے پر اس وقت تین ہزار مسلمان جمع تھے اور کچھ لوگ آس پاس کے علاقوں کے بھی تھے۔ یہ سب اسلحہ سے لیس تھے۔ بات چیت دو گھنٹے جاری رہی۔ آخر کار شاہزادوں کو خود کو انگریزوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے پر آمادہ کرلیا گیا۔ یہ فیصلہ ان کے جاں نثاروں اور عقیدت مندوں کے مشوروں کے خلاف کیا گیا۔ اس لیے کہ ایسے سب لوگ اپنی چیخ و پکار کے ذریعے اپنے غصے کا اظہار کررہے تھے اور شاہزادوں سے دو انگریز افسروں اور سکھوں کے خلاف (جن سے ان کی جانی اور مذہبی دشمنی مسلّم تھی) اعلان جنگ کی التماس کررہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد تینوں شاہزادے چاروں طرف سے بند رتھ میں (جو عام طور پر ہندوستانی عورتوں کے سفر کے لیے استعمال ہوتی ہے) بیٹھ کر باہر آئے۔ شاہزادوں کے چہروں سے کوئی فکر یا اندیشہ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے ہوڈسن کو سلام کرکے کہا انھیں یقین ہے کہ ان کا فیصلہ ایک باقاعدہ عدالت کے ذریعے ہوگا (اس کا مطلب ہے کہ ان سے یہی طے ہوا ہوگا) ہوڈسن نے ان کے سلام کا جواب دیا اور گاڑی بان کو دہلی چلنے کی ہدایت کی۔ لوگ شاہزادوں کے ساتھ ساتھ چلنے پر مصر تھے مگر ان کو منع کردیا گیا اور ان کو ہتھیار

چھوڑنے کی ترغیب دی گئی۔ اس میں کافی وقت صرف ہوا۔ جب یہ سب طے ہوگیا تو ہوڈسن رتھ کے پیچھے چلا اور دہلی سے ایک میل دور اور ہمایوں کے مقبرے سے پانچ میل دور ایک مقام پر ان سے جاملا۔ گاڑی کے گرد ایک ہجوم جمع تھا اور ڈر تھا کہ یہ لوگ حفاظتی دستے پر حملہ نہ کردیں۔ ہوڈسن نے اپنے گھوڑے کو درمیان میں لاتے ہوئے کہا: 'اس کی قید میں جو لوگ ہیں قصابوں سے کم نہیں۔ انھوں نے قتل وخون کے علاوہ عورتوں اور بچوں پر بے حد مظالم کیے ہیں۔' اس پر اسلحے سے لدے سکھ سپاہی جو ہوڈسن کے ساتھ تھے، جوش وخروش سے ہوڈسن کی حمایت میں نعرے لگانے لگے۔ یہ دیکھ کر لوگوں کا ہجوم پیچھے ہٹنے لگا۔ ہوڈسن نے رتھ کو سپاہیوں کے گھیرے میں لے لیا اور شاہزادوں کو باہر آنے کا حکم دیا۔ ان کے باہر آتے ہی ان سے ہتھیار چھین لیے گئے اور انھیں کپڑے اتارنے پر مجبور کیا اور انھیں دوبارہ رتھ میں بیٹھنے کو کہا۔ ان کے رتھ میں بیٹھتے ہی ہوڈسن نے بذاتِ خود ان کو گولیاں مار کر ہلاک کردیا۔ شاہزادوں کا اسلحہ، کپڑے اور زیورات سمیٹنے کے بعد ہوڈسن شہر پہنچا اور شاہزادوں کی لاشوں کو شہر کے تھانے کے سامنے ڈال دیا۔ (یہ لاشیں اس وقت تک وہاں پڑی رہیں جب تک حفظانِ صحت کا خطرہ لاحق نہ ہوگیا) یہ وہی جگہ تھی جہاں دوسو سال قبل اورنگ زیب نے سکھوں کے گرو تیغ بہادر کے سر کو رکھا تھا۔ اس حسن اتفاق پر سکھ بہت مسرور ہوئے۔ ہوڈسن بھی خاندانِ تیموریہ کے آخری چراغ بجھا کے بے حد مسرور تھا۔'' ۱۰۳

سقوطِ دلّی کے بعد لوٹ مار اور قتل وغارت کے سبب شہر کا منظر بے حد خوف ناک ہو چکا تھا۔ ان ایام میں ایک برطانوی افسر رابرٹس (Roberts) نے شہر کی دردناک حالت کا منظر پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے:

''لال قلعے کے لاہوری دروازے سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے۔ دہلی حقیقتاً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے

گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کردی تھی۔ ہر نعش تجزیہ و تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جارہے تھے یا سمجھ لیجیے کہ بے ارادہ زیرلب باتیں کررہے تھے تاکہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے۔ جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوئیں، وہ بڑے ہی خوف ناک اور انتہا درجہ رنج افزا تھے۔ کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو بھنبھوڑ کر کھا رہا تھا۔ کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پنجے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑپھڑاتے پروں سے ذرا دور ہوجاتا تھا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے، جیسے کسی کو اشارہ کررہا ہو۔ دراصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا۔ حد یہ کہ وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے۔ پوری فضا ناقابلِ تصور حد تک بھیانک تھی جو بڑی مضر اور مرض آور بدبو سے لبریز تھی۔''[۱۰۴]

سقوطِ دلی کے بعد دیسی اور برطانوی فوجیوں نے شہر کو بری طرح لوٹا۔ شہر کے باشندے اپنی جانیں بچانے کے لیے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس لیے ان کے اثاثوں کو لوٹنے کا پورا پورا موقع تھا۔ اس لوٹ مار کے بارے میں چارلس گریفیتھس (Charles Griffithius) کی یادداشتیں دیکھیے:

''ہمارے سپاہی (انگریزی اور دیسی دونوں) لوٹ مار کی غرض سے مکانوں میں داخل ہوجاتے اور اپنے کپڑوں میں بہت سی قیمتی چیزیں چھپا لیتے۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی رجمنٹوں کے بہت سے سپاہیوں کو جواہرات اور سونے کے زیور ملے

تھے۔ میری اپنی رجمنٹ کے سپاہیوں نے مجھے موتیوں کی لڑیاں اور وہ اشرفیاں دکھائیں جو انھوں نے لوٹ میں حاصل کی تھیں۔ افسروں اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے بڑی بڑی رقمیں دے کر فوج سے علاحدگی حاصل کر لی تھی۔''

''شروع شروع میں کئی ایک سپاہی لوٹ مار سے باز رہے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان سے کہیں بلند درجہ کے افسر لوٹ مار میں شریک ہیں تو ان کی دیانت بھی ختم ہوگئی۔ ہر شخص میں یہ خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ وہ لوٹ کھسوٹ کے مال سے اپنے آپ کو دولت مند بنا لے۔ جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ لوٹ مار کے ارادوں سے شہر میں جاتا تو میں دوسرے افسروں کو بھی لوٹ کی تلاش میں پاتا۔ یہ اتفاقی ملاقاتیں بہت دل چسپ ہوتی تھیں۔ دونوں طرف سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ ان کا مقصد لوٹ مار نہیں بلکہ محض سیر و تفریح تھا۔''

''ایک دن ایک چھوٹے سے مندر میں داخل ہوئے، یہ مندر چاندنی چوک سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ مندر کی عمارت کے درمیان ایک بہت بڑا بت تھا جسے ہمارے ہتھوڑوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بت نے جواہرات، ہیرے، لعل، زبرجد اور اشرفیاں اگل دیں۔ ہم نے بہت سی قیمتی چیزیں اپنے پاس رکھ لیں اور کچھ سامان پرائز ایجنسی میں بھیج دیا۔''

''ان واقعات کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ لیکن ان تین ہفتوں کی لوٹ مار کی یاد اب تک میرے ذہن میں باقی ہے۔ میری زندگی کے یہ واقعات پریوں کے قصوں یا الف لیلہ کی کہانیوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں۔''

''انگلستان کے جس شہر میں ہم رہتے تھے وہاں کے جوہریوں کی دکانیں مشرقی وضع کے زیوروں سے بھری پڑی تھیں۔ جوہریوں نے

یہ سارا سامان ہمارے سپاہیوں سے خریدا تھا۔"[۱۰۵]

۲۰ ستمبر کو کشمیری دروازے کے باہر انگریز افسروں اور ان کے مقامی سپاہیوں نے لوٹ مار کے مال کے بڑے بڑے ڈھیر لگا رکھے تھے۔ اس موقع پر کیپٹن گریتھس نے لوٹ کھسوٹ کے جو نظارے دیکھے ان کو وہ یوں بیان کرتا ہے:

"Each street was filled with a mass of debris, all lying in inextricable confusion... We entered several of the large houses belonging to the wealthier class of natives and found every one in the same condition, turned inside out, their ornaments torn to pieces, costly articles, too heavy to remove, battered into fragments... We saw parties of Europeans and native soldiers, all eager in pursuit of plunder, going from house to house, or diving down courts and alleys when they saw us approaching. Interference or remonstrance with these men would have been useless, if not dangerous; in their excited state they were no respectors of persons, and we deemed it the better judgement to take no notice of their actions ... To my certain knowledge many soldiers of the English regiments got possession of jewellery and gold ornaments taken from the bodies of the city inhabitants, and I was shown by men of my regiment strings of pearls and gold *mohurs* which had fallen into their hands... That many of the private soldiers of my regiment succeeded in acquiring a great quantity of valuable plunder was fully demonstrated soon after our retrun to England.

Although much, perhaps most, of the treasure unearthed was appropriated by those who discovered it, an enormous quantity was handed over to the prize agents who seem to have added to their collections by the most ruthless methods."(106)

کرنل بوشیر (Colonel Bourchier) نے دلّی پر قبضے کے بعد لال قلعے کی دیواروں سے شہر کو دیکھتے ہوئے اپنی ڈائری میں یہ لکھا تھا کہ تباہی کے دیوتا نے اس تباہی پر بھرپور جشن منایا ہے۔ کشمیری اور موری دروازے کے قرب و جوار کے مکان کھنڈرات بن گئے تھے۔ انگریز فوج کے تھکے ہارے سپاہی فتح کے بعد شراب کے نشے میں دیوانے ہو گئے تھے۔ شہر میں داخلے کے بعد انھیں جو کوئی انسان نظر آیا وہ مار ڈالا گیا۔ ایسے انسانوں کی تعداد کثیر تھی۔[107] شہر میں اس وقت کسی شخص کی جان محفوظ نہ تھی۔ تمام صحیح الجثہ اشخاص جو دکھائی دیے باغی قرار دیے گئے اور انھیں گولی مار دی گئی۔ دیگر لوگ بھی جنھوں نے بغاوت میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا تھا، قتل کیے گئے۔ شہر کے بہت سے نامی لوگ مارے گئے کیوں کہ ان کی نسبت غلطی سے سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ باغی ہیں۔

انقلابی سپاہیوں اور عام لوگوں کو بے دردی سے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ دلّی میں چاندنی چوک کی کوتوالی کے سامنے ایک حوض کے تین طرف پھانسیاں دی جاتی تھیں جہاں ایک طرف تماشائیوں کے لیے کرسیاں بچھی رہتی تھیں۔ تیسرے پہر فوجی بینڈ بجایا جاتا تھا اور مجرموں کی قطاریں پیش ہوتی تھیں۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوتے تھے۔ کچھ لوگ دار پر چڑھا دیے جاتے اور باقی موت کے منتظر رہتے تھے۔[108] جلادوں سے کہا جاتا کہ مجرموں کو دیر تک لٹکائے رکھیں تاکہ انگریز سپاہی باغیوں کی موت کا رقص دیکھ سکیں۔ انگریز سپاہی سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے پھانسی کے منظروں سے مسرور ہوتے۔[109]

> ''وہ گھٹا جو کالوں کی بغاوت کا لباس پہن کر آسمان جہاں آباد پر نمودار ہوئی تھی، اب اس سے خون کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا خاندان ہوگا جس کے گھر اور دران چھینٹوں سے محفوظ ہوں۔ رات کے وقت جب مامتا کی ماریوں کے نالے بلند ہوتے تھے تو سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ اور صبح کے وقت جب گھونگھٹ کی دلہنوں کے خاموش آنسو بیوگی کی فریاد کرتے تو در و دیوار ان کے ساتھ روتے۔ مصائب کے اس طوفان میں گنہگار اور بے گناہ سب بہہ رہے تھے۔ جہاں اطمینان و مسرت کی ریل پیل تھی وہاں کہرام مچے ہوئے تھے، دودھ پیتے بچے ہوں ہوں کرتے

اور حسن کی دیویاں دو دو دانوں کو ترستیں۔ مخبروں کا راج اور پھانسیوں کا بازار گرم تھا۔ ہر وقت ست ہی ست پر جان تھی کہ نہ معلوم کب گرفتار ہوں اور پھانسی لگ جائے۔ پھانسی کے پھندے منکاف صاحب کی جیب میں رہتے تھے اور وہ اپنے سامنے درخت میں بندھوا دیتے تھے۔ دو دو مجرم ایک ایک درخت کے نیچے پشت کی طرف مشکیں باندھ کر بٹھا دیے جاتے تھے اور صاحب کے حکم سے پھانسی ہو جاتی تھی۔"[۱۱۰]

بہادر شاہ ظفر کو گرفتاری کے بعد ایک نہایت معمولی جگہ پر بند کر دیا گیا تھا، جہاں ان کے ساتھ بڑی ذلت کا سلوک کیا جا رہا تھا۔ اسے کینڈل کوگ ہل (Kendal cog Hill) کی نگرانی میں دیا گیا تھا۔ کوگ ہل بہادر شاہ کو سور کہنے سے بھی گریز نہ کرتا تھا... مسز رتھ ایم. کوپ لینڈ (Ruth M. Coopland) نے بہادر شاہ کو سقوطِ دہلی کے کچھ دیر بعد دیکھا تھا۔ اس نے دلّی کے معزول بادشاہ کو جس حالت میں دیکھا تھا اس کا نقشہ وہ یوں بیان کرتی ہیں:

"In the afternoon Captain and Mrs Garston and myself, with another officer and his wife, went to see the King of Delhi, drove down the Corridor into a dirty street... We then came to a large ruined, broken-up garden, where we were joined by Mr. Omanney, a young civilian, who had charge of the king. We climbed some steep steps on to the terrace, where some more guards were walking before the door, and entered a dirty-looking house, then the abode of the 'king of kings', the descendant of a long line of Moguls, including Shah Jehan, Aurangzebe, and Timour. Pushing aside the purdah, we entered a small, dirty, low room with white-washed walls, and there, on a low charpoy, cowered a thin small old man, dressed in a dirty white suit of cotton, and rolled in shabby wraps and rezais, on account of the cold. At our entrance he laid aside the hookah he had

been smoking, and he, who had formerly thought it an insult for any one to sit in his presence, began salaaming to us in the most abject manner, and saying he was *'burra kooshee'* (very glad) to see us.

As we looked at him we thought how strange it was that this frail old man, tottering on the brink of the grave, could harbour such a plot and such deep revengeful feelings against us. His face was pale and wan, and his eyes weak and uncertain, seeming to shun our scrutiny: but an aristocratic expression of face reminded us of his noble descent. He had a venerable-looking white beard, and he swayed about in a frail decrepit way, exciting feelings that were a mixture of contempt, abhorrence, and pity; contempt, for the degraded position to which he had brought himself by his wild scheme of reinstating himself on a throne which he could only hope to enjoy for a passing year or two; abhorrence, that he could give up our poor countrymen to be brutally murdered, and even, it is said, feast his eyes and ears on their dying anguish; and pity, that he should have so short a time for repentance, and that the descendant of a line of kings, whose splendour and power were boundless, should be thus degraded.

We ladies, after gazing at the king and his son, Jawan Bukht, son of Zeenat Mahal, the king's favourite wife, who had a shrewd clever face for a boy about fourteen, were alllowed to see the queen, Zeenat Mahal-a favour not granted to the gentlemen. It seemed absurd to humour thus their silly prejudices, when they had spared no European in their power any indignity or insult. However, we raised the *'chick'* which separated the queen's room

from the king's and entered a very small bare, shabby room. Seated on a charpoy we beheld a large bold-looking woman with not the least sign of royalty of dignity about her. She seemed about forty, her complexion was tawny; and her face large and coarsely featured, with daring black eyes and wide mouth, and dark hair partially concealed under her white cotton *chuddar* (veil). She wore a cotton dress of black print and but few ornaments; her small and well-shaped hands and feet were bare. Judging from her looks, she seemed capable of inciting the king on the deeds of blood, which she was accused of having done. She began asking Mrs Garstone and the other lady about their husbands, and why Mrs Garstone had not brought her children, as she wished to see them; then, looking at my black dress, she sneeringly asked me what had become of my '*sahib*'. I was so angry at her look and tone of heartless contempt, that I said, '*Chupero*' (silence), and walked out of her presence...

I afterwards heard that the king and queen did not live on very good terms. She said that he would still consider himself a king, and when she sent for things from the bazar, he pronounced them not good enough for him; and that he would not smoke the tobacco when it came, because he did not consider it nice enough. He complained that she had plenty of concealed money and jewels, which she would not sacrifice to his comfort; so that Mr Omanney was obliged to allow him four annas a day,- about six pence.(112)

ایک تنگ اور بوسیدہ کمرے کی معمولی سی چارپائی پر لیٹے ہوئے شخص کو دیکھ کر کوئی یہ باور نہ

کرسکتا تھا کہ یہ مغلوں کی عظیم سلطنت کا آخری وارث بہادر شاہ ہے۔ انگریز افسر فخر کے ساتھ یہ بات سناتے تھے کہ دلّی کے آخری مغل بادشاہ نے انھیں چارپائی سے اٹھ کر سلام کیا۔ سن ستاون کی بغاوت فرو ہونے کے چند مہینے بعد 'لندن ٹائمز' کا مشہور صحافی ولیم رسل (William Russel) ہندوستان کے مختلف شہروں سے گزرتا اور لکھنؤ میں جنگ کے آخری مناظر کی رپورٹیں قلم بند کرتا ہوا دلّی آیا تھا۔ وہ دلّی کے آخری مغل بادشاہ سے ملنے کے لیے بھی گیا تھا۔ اس نے لال قلعے کے ایک ویران اور تاریک کمرے میں میلے کچیلے لباس میں ملبوس سر پر ایک معمولی ٹوپی پہنے ایک بیمار شخص کو دیکھا تھا جو پستہ قد تھا اور ضعیف تھا اور ایک برتن پر جھکا ہوا مسلسل قے کیے جارہا تھا۔ اس کی متلی ختم ہوئی تو وہ نقاہت سے ہانپنے لگا۔ رسل نے اس کمرے میں معزول بادشاہ کی چہیتی ملکہ زینت محل کی آوازیں پردے کے پیچھے سے سنیں۔ وہ بہادر شاہ کے متعلق بری باتیں کہہ رہی تھیں۔ زینت محل نے کہا کہ یہ بوڑھا بے وقوف آدمی اب بھی بادشاہ کی طرح بیٹھا ہے۔ میں اس سے قطع تعلق کرکے اسے چھوڑ جانا چاہتی ہوں۔ اس سے میں بہت تنگ ہوں۔ جب رسل بہادر شاہ کی اقامت گاہ سے باہر نکل رہا تھا تو زینت محل بدستور غصے سے بولتی جارہی تھی اور بہادر شاہ کی آواز سنائی دے رہی تھی کہ اے خدا! اس عورت کی فریاد سن۔[۱۱۳]

زینت محل کی فریاد نہ سنی گئی۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ وہ ہانپتا کانپتا بے دلی کے عالم میں مقدمے کی سماعت میں موجود رہا۔ شاہ جہاں کے بنائے ہوئے دیوانِ خاص میں یہ مقدمہ چلتا رہا تھا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران میں اکثر اوقات وہ گم سم بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس پر غشی طاری ہوجاتی تھی۔ یہ بات یقینی ہے کہ اسے اپنے انجام کا علم تھا۔ ۹ر مارچ ۱۸۵۸ء کو عدالت نے یہ فیصلہ سنایا:

> ''عدالت اس شہادت پر جو اس کے پیش نظر ہے متفق ہے کہ ملزم محمد بہادر شاہ سابق بادشاہ دہلی تمام جرائم کے مجرم ہیں۔ جو ان کے خلاف بیان کیے گئے ہیں۔''

۹ر اپریل کو میجر جنرل این پینی نے عدالت کے فیصلے کو منظور کرتے ہوئے سزا کی تصدیق کردی۔ بہادر شاہ کو جلاوطن کرکے رنگون بھیجنے کی سزا دی گئی۔ ۷ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو تین پالکی نما گاڑیوں کے قافلے کی صورت میں اسے دلّی سے رنگون جانے کے لیے روانہ کردیا گیا۔

دلّی کی کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسوؤں کی لڑیاں نہ بہہ رہی ہوں۔ بادشاہ نے اپنی سواری کے پردے اٹھا دیے۔ اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف تھے اور وہ اہلِ وطن کو خدا کے سپرد کر رہا تھا۔ اس کے بعد کا زمانہ جلاوطنی کی حالت میں رنگون میں گزرا جہاں چار سال کی اذیت ناک زندگی کا خاتمہ نومبر ۱۸۶۲ء میں ہوا۔ یہ ۷/نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون شہر کی ایک صبح تھی۔ اس روز پت جھڑ کے پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ صبح کے پانچ بجے تھے، اسی صبح کو ہندوستان کا جلاوطن معزول بادشاہ جسم و جاں کی قید سے آزاد ہوا۔ اس کی تدفین کا بندوبست نگران برطانوی افسر کی موجودگی میں ہوا۔ تجہیز و تدفین کے لیے ایک ملا کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کے جسم کو ساگوان کے ایک صندوق میں رکھ کر سرخ رنگ کے سوتی کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ۷/نومبر ہی کو شام چار بجے اسے اینٹوں کی ایک قبر میں دفن کر دیا گیا اور قبر کے اوپر مٹی ڈال کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

حوالہ جات:

۱۔ ناصر نذیر فراق دہلوی، 'لال قلعے کی ایک جھلک' انتظار مرزا، مرتب (دلّی اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء)، ص ۶۸

۲۔ منشی فیض الدین 'بزمِ آخر' کامل قریشی، مرتب: (دلّی اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء)، ص ۴۵

۳۔ بزمِ آخر، ص ۷۷

۴۔ بزمِ آخر، ص ۷۶

۵۔ مذکورہ حوالہ، ص ۷۸

۶۔ بزمِ آخر، ص ۷۵

۷۔ ظہیر دہلوی 'داستانِ غدر' (لاہور، اکادمی پنجاب، ۱۹۵۵ء)، ص ۶۷، ۶۸

۸۔ .....؟

۹۔ لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۶۸، ۶۹

۱۰۔ داستانِ غدر، ص ۸۹-۷۱

۱۱۔ عتیق صدیقی 'اٹھارہ سو ستاون-اخبارات و دستاویزات' (دلّی: مکتبہ شاہراہ)، ص ۴۰-۳۹

۱۲۔ لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۵۰

۱۳۔ داستانِ غدر، ص ۷۹

۱۴۔ مذکورہ حوالہ، ص ۸۰

۱۵۔ داستانِ غدر، ص ۷۹

۱۶۔ A narrative of Syed Mubarik Shah. refered by Micheal Edwards in Red year (London: Hamish Hamilton. 1973). p. 185.

۱۷۔ داستانِ غدر، ۸۱

۱۸۔ Norman & Mrs. Kieth Young. Delhi 1857 (Delhi: Gain Publishing House. 1988) p.22.

۱۹۔ John William Kaye. A History of the Great Revolt (Delhi: Gain Publishing House. 1988) p.79-80.

۲۰۔ Ibid. p.80.

۲۱۔ اٹھارہ سو ستاون ۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۴۱

۲۲۔ Great Revolt. V.II. p.81.

۲۳۔ ibid. p.82.

۲۴۔ اٹھارہ سو ستاون ۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۴۲

۲۵۔ مذکورہ حوالہ، ص ۴۰۱

۲۶۔ Delhi 1857. p.324.

۲۷۔ Christopher Hawees. Poor Relations (Richmond: Curzon Press. 1996) 99-1-1

۲۸۔ اٹھارہ سو ستاون ۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۴۵۔

۲۹۔ Great Revolt V.II. p.91.

۳۰۔ اٹھارہ سو ستاون ۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۴۲

۳۱۔ معین الدین حسن خاں، خدنگ غدر (دلی: شعبۂ اردو، دلی یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء)، ص ۶۷

۳۲۔ P.J.O. Taylor, A Companion to the Indian Mutiny of 1857. (Delhi: Oxford University Press. 1996). p.102.

۳۳۔ داستانِ غدر، ص ۱۱۷-۱۱۶

۳۴۔ اٹھارہ سو ستاون ۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۴۵

۳۵۔ مذکورہ حوالہ، ص ۴۴

۳۶۔ Great Revolt. V.II. p.100.

۳۷۔ اٹھارہ سو ستاون ۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۲۸۰

۳۸۔ مذکورہ حوالہ، ص ۳۰۶

۳۹ مذکورہ حوالہ، ص ۳۱۸

۴۰ مذکورہ حوالہ، ص ۱۴۵

۴۱ انھارہ سو ستاون ۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۴۷

۴۲ مذکورہ حوالہ، ص ۵۳

۴۳ مذکورہ حوالہ، ص ۶۱

۴۴ معین الدین حسن خاں، جیون لال، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، کے دو خفیہ روزنامچے (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۹ء)، ص ۴۳-۱۴۲

۴۵ مذکورہ حوالہ، ص ۱۶۴

۴۶ مذکورہ حوالہ، ص ۱۶۶

۴۷ مذکورہ حوالہ، ص ۱۴۶

۴۸ مذکورہ حوالہ، ص ۱۴۸

۴۹ انھارہ سو ستاون ۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۲۹۳

۵۰ دو خفیہ روزنامچے، ص ۱۲۵

۵۱ Delhi in 1857. p39.57.

۵۲ ibid. p.153.

۵۳ P.J.D. Tylor. What Really Happened During the Mutiny (Delhi: Oxford University Press. 1999) p.54.

۵۴ ibid. p. 56.

۵۵ ibid. p. 56.

۵۶ The Punjab and Delhi in 1857. p.286.

۵۷ ibid. p. 290.

۵۸ ibid. p. 295.

۵۹ داستانِ غدر، ص ۲۹-۱۲۸

۶۰ Delhi and Punjab in 1857. p.297.

۶۱ Christopher Hibbert. The Great Mutiny (England: Penguin. 1980) p.280.

۶۲ ibid. p. 281.

۶۳ ibid. p. 283.

۶۴ ibid. p. 283.

۶۵ ibid. p. 287-88

۶۶ The Punjab and Delhi in 1857. p.298.

۶۷ ibid. p.302.

۶۸ ibid. p. 305.

۶۹ داستانِ غدر، ص ۱۳۳

۷۰ The Great Mutiny, p.290-91.

۷۱ David Bloomfield. Lahore to Lucknow-Mutiny Journal of Arthur Moffott Lang (London: Leo Cooper. 1992) p.55.

۷۲ The Great Mutiny. p.291.

۷۳ John Harris. The Indian Mutiny (Hertordshire: wordnorth.2001) p.125-26.

۷۴ سلیم قریشی، غداروں کے خطوط (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۷۹

۷۵ داستانِ غدر، ص ۱۴۳

۷۶ مذکورہ حوالہ، ص ۲۰۶

۷۷ مذکورہ حوالہ، ص ۲۱۷

۷۸ اٹھارہ سو ستاون۔ اخبارات و دستاویزات، ص ۳۳۳

۷۹ غداروں کے خطوط، ص ۲۱۸

۸۰ مذکورہ حوالہ، ص ۱۶۴، ۱۷۱

۸۱ مذکورہ حوالہ، ص ۲۴۶

۸۲ مذکورہ حوالہ، ص ۲۴۹

۸۳ مذکورہ حوالہ، ص ۱۹۰

۸۴ مذکورہ حوالہ، ص ۲۱۵

۸۵ مذکورہ حوالہ، ص ۲۰-۲۱۹

۸۶ مذکورہ حوالہ، ص ۲۳۷

۸۷ مذکورہ حوالہ، ص ۲۳۸

۸۸ مذکورہ حوالہ، ص ۴۹-۲۴۴

۸۹ The Great Mutiny. p.300-301.

۹۰ Lohore to Lucknow. p.86.

۹۱ داستان غدر، ص ۹۱

۹۲ The Great Mutiny. p.309.

۹۳ Lahore to Lucknow. p.95-97.

۹۴ خواجہ حسن نظامی، بیگمات کے آنسو (لاہور: خواجگان پبلی کیشنز، س.ن) ص ۱۳-۱۲

۹۵ Mehdi Hasan, Bahadur Shah and the war of 1857 (Delhi: Atma Ram. 1958) p.280.

۹۶ بیگمات کے آنسو، ص ۸۰-۱۰۷

۹۷ William Dalrymple. The Last Mughal (London. Bloomsbury. 2006) p.376-78.

۹۸ ibid. p. 383-84.

۹۹ ibid. p. 384.

۱۰۰ Lahore to Lucknow. p.97

۱۰۱ The Great Revolt. p.634.

۱۰۲ ibid. p.655.

۱۰۳ غداروں کے خطوط، ص ۵۲-۵۰

۱۰۴ غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۵۷ء) ص ۲۰۴

۱۰۵ باری، کمپنی کی حکومت (لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۹ء)، ص ۳۹۸

۱۰۶ The Great Mutiny. p.319.

۱۰۷ Micheal Edwards. Red Year (London: Hamish Hamiton). p.59.

۱۰۸ کمپنی کی حکومت، ص ۳۹۷

۱۰۹ Red year. p.60.

۱۱۰ راشد الخیری، دلّی کی آخری بہار، ص ۳۷۔

۱۱۱ The Great Mutiny. p.318.

۱۱۲ Indra Ghose. Memsahibs Abroad (Delhi: Oxford University Press. 1998) p. 213-14

۱۱۳ William Howard Russel. My Indian Mutiny Diary (London: Cassell and Company. 1957) p. 172-76.

(غیر مطبوعہ)

ظہیر دہلوی

'داستانِ غدر' کے چند ورق

دلّی ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کی شام تک اور دلّی ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کی صبح سے

انقلابِ دہر نے دکھلائیں وہ نیرنگیاں
جب زباں پر لائیے اپنا نیا افسانہ ہے

اُف اُف کس قیامت کی گرمی ہے کہ جگر کباب ہوا جاتا ہے۔ الحفیظ الامان دھوپ کی تیزی العظمۃ لِلّٰہ ۔آسمان سے آگ برستی ہے گویا آفتاب سوا نیزے پر اُتر آیا ہے۔ پیاس کے مارے زبان نکل نکل پڑتی ہے۔ حلق میں کانٹے پڑے جاتے ہیں۔ زمین کا طبقہ کرۂ نار ہو رہا ہے۔ وقنا ربنا عذاب النّار ۔منہ سے بات تک نہیں نکلتی۔ نو بجے سے ٹٹیاں چھڑکی جاتی ہیں۔ پنکھا کھنچتا ہے مگر پسینوں میں شور بور ہوئے جاتے ہیں۔ دن کیا ہوتا ہے، حشر کا دن ہوتا ہے۔ پہاڑ کی طرح کاٹنا پڑتا ہے۔ ہونٹوں پر جان آجاتی ہے۔ رات کی تھمس۔ اللّٰھم احفظنا من کلِ بلاءِ الدُّنیا ۔چھڑکاؤ ہوتے ہیں۔ پنکھے جھلے جاتے ہیں۔ پلنگ تر کیے جاتے ہیں۔ تاہم کسی طرح نیند نہیں آتی۔ کروٹیں لیتے لیتے صبح ہو جاتی ہے:

بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

ابھی سلامتی سے جیٹھ کے تین دن گزرے ہیں۔ پندرہ روزے پندرہ برس کی برابری تصور کرنے چاہئیں۔ خدا خدا کر کے سولہویں شب نصیب ہوئی۔ رات کے دو بج چکے ہیں۔

تیسرے کا عمل ہے، ہوا میں کسی قدر خنکی آ گئی ہے۔ جس قدر صبح قریب آتی جاتی ہے، رات بھینی بھینی ہوتی جاتی ہے۔ روزہ دار سحری کو بیدار ہو کر خورد و نوش میں مشغول ہیں۔ پچھلا پہر سہانا وقت ہے۔ مسجد جامع کا نقارہ گونج گونج کر بیدار باش کی آواز لگا رہا ہے۔ خفتہ گانِ خوابِ غفلت کو جگا رہا ہے۔ چوکیدار گھر گھر جاگو کی آواز لگاتے پھرتے ہیں۔ محلّہ محلے جگاتے پھرتے ہیں۔ سولھویں رات کا چاند وسط سما سے ڈھل کر قریب غروب پہنچ گیا ہے۔ روزہ داروں کے گھروں میں عجب چہل پہل ہے۔ گھر گھر رتجگے کا سامان نظر آتا ہے۔ اب وہ وقت قریب آتا جاتا ہے کہ روزدارانِ شب بیدار روزہ کی نیت باندھ کر خورد و نوش سے دستبردار ہوں۔ گھڑی دو گھڑی بستر راحت پر دراز ہو کر استراحت فرمائیں۔ تناولِ طعام سے فارغ البال ہو کر پان کی گلوریاں کلّوں میں دبا کر قلیان کے گھونٹ کھینچ رہے ہیں۔ اکثر جوان شراشر سلفوں کے دم لگا رہے ہیں۔ آنکھوں میں نیند کا خمار ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُونگے جا رہے ہیں۔ ادھر آسمان کا رنگ بدلنے لگا ہے۔ آثارِ صبح نمودار ہوتے جاتے ہیں۔ صبح کا تارہ برآمد ہو چکا ہے مگر چاندنی کھل کھل کر اپنا روپ دکھا رہی ہے۔ دام تزویر بچھا رہی ہے۔ عاشقانِ جمالِ کبریا باوضو ہو کر سر سجادہ بکمال خشوع و خضوع تسبیح و تہلیل حمد الٰہی میں محو حال و قال میں ہیں کہ یکا یک توپ کے زناٹے کی آواز کانوں میں آئی۔ تین منٹ تک برابر زناٹا رہا۔ جلدی جلدی پان تھوک کر غرارے کیے۔ دانت مانجھے اور بِصَومِ غدٍ نَوَیتُ مِن شهرِ رَمَضان کہہ کہہ کر پلنگوں پر دراز ہوئے۔ ابھی کسی کو یہ خبر نہیں کہ صبح کو قیامت نمودار ہونے والی ہے۔ مصنف:

نہ رکھو آج کی کل پر کہ کل کس کو خبر کیا ہو
مریضِ جاں بلب کو صبر امیدِ سحر کیا ہو

اب مشرق کی جانب سے سفیدی کے بادل آسمان پر پھیلتے چلے آتے ہیں۔ مطلع خورشید کا رنگ جو گیا شنجرفی ہوتا جاتا ہے۔ قرصِ ماہتاب لبِ بام پہنچ کر تانبے کی تھالی کی طرح بدقلعی نظر آنے لگا ہے۔ جھاڑ فانوس کی روشنی جھلملی جھلملی نظر آتی ہے۔ چراغِ سحری بیمارِ جاں بلب کی طرح ٹمٹماتا ہے۔ دروازے شہر پناہ کے دیدۂ حیرت کی طرح نگراں ہیں۔ کوچہ بندی کے پھاٹک چشم انتظار کی طرح حیراں۔ صبح کا تڑکا نور ظہور کا وقت، سہانا سماں، ادھر گجر کی آواز ادھر مسجدوں میں اذانوں کا شور۔ ادھر مندروں سے ناقوس کی پکار، نقارخانوں سے دھیمی دھیمی نوبت کی ٹکور میں شہنائیوں کی سہانی بھیرویں کی دُھنیں جی کو بے کل کیے دیتی

ہیں۔ نسیمِ سحری کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے نرم نرم چل کر جاگنے والوں کو تھپک تھپک کر سلا رہے ہیں۔ بیگم کے باغ کے ہوا کے جھونکے بناس کی پتی خوشبو میں لپٹ لپٹ کر عطر مجموعہ کے کلخلخے سونگھا رہی ہے۔ چوکیدار شب بیدار دکانوں کے چبوتروں پر مردوں سے شرط باندھ کر بے خبر سو رہے ہیں:

چو صبح از دمِ گرگ برزد زباں　　بخفتن درآمد سگ و پاسباں
خروسِ غنودہ فرو کوفت بال　　دہل زن بزو بر تبیرہ دوال

لاہوری دروازے سے نگم بودھ کے گھاٹوں تک حسن کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ چاندنی چوک کی سڑک کہکشاں بنی ہوئی ہے۔ ہزاروں چاند کے ٹکڑے سیاروں کی طرح جگمگاتے چلے آتے ہیں۔ جس کو دیکھو آفت کا پرکالہ ہے۔ ایک سے ایک اعلا ہے۔ سینکڑوں پرستان کی پریاں ستواں نقشے چاند سے چہرے، چھریرے بدن، نازک اندام، گلفام سرو قامت، سیاہ پتلی، سیاہ بال، ابھرے ابھرے ہوئے سینے، مرگ کی سی آنکھیں، چیتے کی سی کمریں۔ سر سے پاؤں تک چاندی سونے میں لدی پھندی چلی آتی ہیں۔ کامدانی اور تن زیب کے دوہرے دوپٹوں میں سے کندن سے بدن کی رنگت پھوٹی پڑتی ہے:

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن میں ہے

اودی اور سرمئی اطلسوں کے گھیر دار لہنگے، چوڑی چوڑی ٹھپے کی سنجاف، پور پور طلائی انگوٹھی چھلے، نازک نازک پتلی پتلی حنائی انگلیوں میں چھوٹی چھوٹی گنگا جلیاں:

کیا چاہیے انھیں سرِ انگشت بر حنا
جس بے گنہ کے خون میں چاہیں ڈبولیاں

گوری گوری پیشانیوں پر کچھ کچھ بکھرے ہوئے بال، نیند بھری آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل، پتلے پتلے سرخ سرخ ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مسی کی دھڑی لاکھ لاکھ بناؤ دے رہی ہے:

یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا حسن والوں کا　　یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا مہ جمالوں کا　　یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا ذی کمالوں کا
یہ وہ زمیں ہے زمیں جس کی ذرا گلتی ہے　　یہ خاک وہ ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے

دریائے جمن میں نازنینانِ گلبدن کے جمگھٹوں سے تختۂ چمن نظر آتا ہے۔ دریا میں دوسرا دریائے پُرنور موجیں مار رہا ہے۔ حضور چاند دریا کے موجوں میں جھولے لے رہے ہیں۔ آسمان کے ستارے پانی میں دکھائی دے رہے ہیں۔ دریا کی موجیں شوقِ ہمکناری سے بے تاب دوڑی ہوئی چلی آتی ہیں۔ دریا کے حباب چشم بن کر ایک ایک کی صورت کو تک رہی ہیں۔ ہزاروں آسمانِ خوبی کے سیارے مہین مہین ریشمی ساڑیاں اوڑھے ہوئے کمر کمر پانی میں غوطے لگا رہے ہیں۔ اکثر شوخ کمسن الھڑ پنے کے دن آپس میں چہلم نباہنا لڑ رہی ہیں:

کچھ نرالا ہے جوانی کا بناؤ　　شوخیاں زیور ہیں اس سن کے لیے

کوئی پری پیکر مہ جمال جمنا کا اشنان کر کے کھڑے کھڑے بالوں کو مڑوڑی دے کر نچوڑ رہی ہے۔ کوئی خشک ساڑی باندھ کر گیلی ساڑی کو مڑوڑی دے رہی ہے:

فشر و پنجہ مرجاں ز ابرِ مروارید　　قمر ز جیب شبِ اشکبار پیدا شد

گھاٹ میں ایک مصری مہاراج موٹی تازی چوپرولی، ننگ دھڑنگ ٹانگوں میں لنگوٹی، سر پر چوٹی جٹا لٹکائے، توند پھیلائے، آلتی پالتی مارے ہوئے براج رہے ہیں۔ ایک پتھر کے چھوٹے سے چکلے پر ایک ہاتھ سے صندل گھستے جاتے ہیں۔ ایک جانب مہادیو کی بٹیا دھری ہے۔ مقابل میں اس کے گوری پاربتی کی مورت رکھی ہے اور سنگِ مرمر کا ایک نادیا بیل بیٹھا ہوا ہے۔ ایک کمل کے آسن پر کچھ پوجا پتری کا سامان سنکھ وغیرہ دھرا ہوا ہے۔ مہادیو پر کچھ دودھ کچھ پانی لنڈھا ہوا ہے۔ کچھ پھولوں کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ایک جانب کوڑی پیسوں کا ڈھیر ہوتا جاتا ہے اور ایک جانب اناج کا انبار ہے۔ نازنیناں پری پیکر جو نہا دھو کر دربار سے نکلتی ہیں تو لباس پہن پہن کر پہلے آ کر مہادیو کے درشن کرتی ہیں اور مصر جی مہاراج کو پالاگن کہتی ہیں۔ مصر جی مہاراج ایک ہاتھ کے انگوٹھے سے پیشانی پر صندل کا ٹیکہ لگا دیتے اور ایک پنکھڑی تلسی کی منہ میں دے دیتے اور وہ روانہ ہوتی جاتی ہیں۔

میرٹھ میں غدر کی ابتدا

صبح ہوئی، گجر بجا، مرغِ سحر کا غل ہوا　　کرنے لگے چمن چمن مرغ چمن نوا گری
مسجد و خانقاہ سے شور اٹھا صلوٰۃ کا　　دیر میں جا کے برہمن کرنے لگے ہری ہری

مرغانِ خوش الحان درختوں پر بیٹھے ہوئے حمدِ الٰہی چہچہا رہے ہیں۔ پٹری کے باغیچے میں چڑیوں کے چوں چوں کا وہ غل شور ہے کہ کان پڑی آواز نہیں آتی۔ مستانِ بادۂ توحیدِ عالم وجد میں جھوم رہے ہیں۔ عجب کیفیت کا وقت ہے۔ سرخیِ شفق اُفقِ آسمان پر پھولتی چلی جاتی ہے۔ مطلع خورشید گلناری ہوتا جاتا ہے۔ دامانِ سفیدہ چاک ہوکر آسمان کی رنگت نیلی نظر آنے لگی ہے۔ سورج کی گنگا جمنی کرنیں سنہرے روپہلے تاروں کی طرح پھیلی جاتی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں قلعۂ معلیٰ کے بلند منظروں کے سنہرے کلسوں پر پڑ پڑ کر اپنی چمک دمک دکھا رہی ہیں۔ بیٹھک کا سنہری برج عکسِ شفقی سے سنہری نظر آتا ہے۔ اس برج کو ثمن برج کہتے ہیں۔ یہ بادشاہانِ تیموریہ کی خاص نشست گاہ ہے۔ اس کے نیچے چھت اور چھتے میں سیڑھیاں ہیں اور دیوانِ خاص میں سے نیچے دریا کی طرف رستہ اترتا ہے اور نیچے اتر کر دریا کے کنارے پر بطور پشتہ ایک چبوترہ ہے جس کو پٹری کہتے ہیں۔ اس پر باغیچہ ہے جس کو پائین باغ دیوانِ خاص کہنا چاہیے، جس کا عرض تخمیناً بیس پچیس گز کے قریب ہوگا۔ سطح دریا سے پانچ چار گز کا ارتفاع ہے۔ ثمن برج وقتِ طلوعِ آفتاب مجازی آفتاب میں مشرق کی جانب سے آفتابِ دیگر کے قریب نظر آتا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ چودھویں تاریخ کا چاند وقتِ غروب وطلوعِ آفتاب کے مقابل میں دوسرا آفتاب ہوجاتا ہے۔ یہ برج اندر سے بہت چوڑا چکلا ہے اور ہشت پہل ہے۔ اس لیے اس کا نام مثمن برج رکھا گیا ہے جس کو اب ثمن برج کہتے ہیں۔ بادشاہ شاہجہاں بعد نمازِ صبح اسی کے جھروکوں میں بیٹھ کر درشنیوں کو درشن دیا کرتے تھے۔ چناں چہ وہ قاعدہ مستمرہ آج تک جاری ہے۔ اس کے شمالی، شرقی، جنوبی طرف کو پُرتکلف نفیس خوشنما غرفے ہیں، ان کو جھروکے کہتے ہیں۔ نیچے داہنی جانب کو ایک جنگلہ ہے جس میں میر فتح علی داروغہ کہاروں کا نشیمن ہے اور برابر میں دوسرا بنگلہ ہے۔ اس میں حمید خاں رامپوری جمعدار خاص برداران کا قیام ہے اور اس کی برابر میں چھوٹا چھپر اور ہے اس میں شیدی قمر جمعدار حبشیوں کا۔ اور اس پٹری کا طول قلعۂ معلیٰ کے طول کے برابر ہے اس پر پہرے داروں کے خس پوش مکان بنے چلے گئے ہیں۔ حضرت ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ ثانی فریضۂ صبح سے فارغ ہوکر جھروکوں میں بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ سواری کی تیاری ہے۔ تختِ رواں جس کا سنہری ہودا ہے اور چار ڈنڈے ہیں، اس پر زربفت کی مسند تکیے لگے ہوئے ہیں اور کاشانی مخمل کا غلاف پڑا ہوا ہے۔ وہ تسبیح کے صحن میں پڑا ہے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر باناتی پردہ پڑا ہے۔ تسبیح خانے کے صحن میں خواجہ سرا اور خواص بادشاہی وغیرہ اور چند معززین دربار میں حاضر ہیں۔

انتظار برآمدِ حضور ہے۔ تسبیح خانے کے چبوترے کے نیچے پچاس ساٹھ کہار جن کی نوکری ہے، سرخ بانات کی وردیاں اور سرخ پگڑیاں باندھے ہوئے کمر بستہ ایستادہ ہیں۔ ثمن برج کے نیچے پٹری پر کوئی دو سو خاص بردار سرمئی دستار اور سرمئی پٹکے باندھے ہوئے بغلوں میں تلواریں دبائے دست بستہ کھڑے ہیں۔ ایک جانب کو تیس جوان حبشی نوعمر گراں ڈیل سرخ کمخواب کی وردیاں سرخ مندیلیں سرخ پٹکے باندھے دست بستہ مودب کھڑے ہیں۔ نیچے پٹری کے پار رسالہ سواروں کا پرا جمائے ہوئے ایستادہ ہے۔ مہدیوں کے تختے میں میر فتح علی اور حمید خاں اور شیدی قمبر مسلح دست بستہ کھڑے ہیں۔ جھروکے کی جانب سب کی نگاہ ہے کہ یکا یک بالائے جھروکہ سے ہنکارے کی آواز آئی۔ میر فتح علی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔ اشارے (کذا) سے دریا کے پل کی جانب ایما ہوا۔ اب جو دریا کے پل کی جانب نگاہ کی تو دیکھا کہ دریا پار جو میر بحری کا بنگلہ ہے، اس میں آگ لگ رہی ہے اور شعلے اُڑ اُڑ کر آسمان کو جاتے ہیں۔ دریا کا کنارہ گرد و غبار اور دودِ آتش سے دھواں دھار و تیرہ و تار ہو رہا ہے۔ میر فتح علی نے رسالدار کو حکم دیا کہ سوار بھیج کر خبر منگاؤ کہ یہ روشنی کیسی ہے۔ رسالہ سے نکل کر دو سواروں نے جو گھوڑوں کی باگیں لیں تو گرد باد ہو کے گھوڑے زمین سے لیٹ گئے۔ آناً فاناً میں یہاں تھے یا وہاں تھے۔ ہنوز یہ موقع واردات پر نہ پہنچے تھے، سلیم گڑھ کے نیچے پل پر پہنچے تھے کہ دیکھا اُدھر سے بے تحاشا لوگ اور ملاح پل کے چپراسی بھاگے ہوئے چلے آتے ہیں۔

سوار: ہیں خیر تو ہے کیا آفت ہے جو اس طرح سراسیمہ، منتشر الحواس بھاگے آتے ہو؟

چپراسی: اجی جناب خیر تو بخیر فوج اتر آئی۔ میر بحری صاحب کو مار ڈالا۔ بنگلے کو آگ لگا دی۔ مال کا صندوق اور گولک لوٹ لی۔ ہم لوگ اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں۔

سوارانِ بادشاہی نے یہ سنتے ہی الٹی باگیں پھیر دیں۔ کوئی پانچ منٹ میں واپس آ کر خبر دی کہ کوئی غنیم دہلی پر چڑھ آیا ہے۔ اس کی فوج نے تاخت و تاراج پر کمر باندھی ہے۔ بنگلہ پھونک دیا۔ میر بحر کو مار ڈالا۔

پیش گاہ حضور پُرنور سے امیر فتح علی اور حمید خاں کو حکم ہوا کہ اپنی جمعیت لے جاؤ، پل توڑ دو، کشتیاں کھینچ لو کہ فوج اترنے نہ پاوے۔ دروازہ شہر پناہ کے بند کرا دو۔ سواروں کو روانہ کرو کہ بری صاحب کو لے کر جلد حاضر ہوں اور تمام ملازمانِ شاہی از کہہ تامہہ کو حکم حضوری دربار پہنچ جائے۔ کوتوال شہر کو حکم پہنچے کہ دروازہ شہر کا پورا پورا بند و بست رکھے۔ کلکتہ دروازہ

پر بذاتِ خود حاضر رہے۔ قلعہ دار صاحب کو حکم پہنچا دو کہ دروازۂ قلعہ کی پوری پوری حفاظت رکھیں۔ سوار کو رخصت نوکری والے جلد گھوڑے دوڑا کر شہر میں داخل ہوکر دروازہ راج گھاٹ معمور کرادیں۔

حسب الحکم تفاشیم فوراً تعمیلِ حکم ہوگئی۔ سوار جابجا روانہ ہوگئے مگر یہاں سے جو جمعیت شکست پل کے واسطے روانہ ہوئی تھی، اس کو حصولِ مطلب میں ناکامی حاصل ہوئی اور بے نیل مرام واپس آنا پڑا۔ ہنوز یہ سلیم گڑھ کے نیچے تھے کہ سامنے ملک الموت کی طرح سوار آتے دکھائی دیے۔ یہ پل تک نہ پہنچنے پائے اور وہ پل کے ادھر اُتر آئے۔ وہاں سے بہزار خرابی افتاں وخیزاں گریزاں سوارانِ باغیہ کے آتے آتے انھوں نے جھروکے کی ڈیوڑھی کا دروازہ لیا۔ چھتے میں داخل ہوکر دروازہ ڈیوڑھی معمور کردیا اور دیوانِ خاص اور تسبیح خانے میں حاضر ہوگئے مگر حضرت قدر قدرت ظل اللہ بادشاہ رعیت پناہ کمال جرأت وتہور کو فرما کے نہایت اوسان اور استقلال سے بجائے خود جس طرح بیٹھے تھے، بیٹھے رہے، ہرگز جنبش نہ کی۔ اور محل کی مستورات اور سُرادِقات عصمت میں ایک تہلکہ عظیم برپا ہوگیا مگر حضرت بہ نفسِ نفیس سب کو کلمات صبر وتسکین فرما کے تشفی دیتے رہے۔

اِدھر سوارانِ باغیہ کشتیوں کے پل پر سے اتر کر سلیم گڑھ کے نیچے ہوتے ہوئے زیر جھروکہ پہنچے اور مردمانِ آئندہ وروندہ گریزاں ہوکر کلکتہ دروازے میں داخل ہوئے۔ دروازہ والوں کو اطلاع دی کہ دروازہ معمور کردو۔

ادھر مگنہ مود دروازے پر خبر ہوگئی، نہانے دھونے والے گرتے پڑتے بھاگ کر شہر میں داخل ہوئے۔ وہ دروازہ بھی معمور ہوگیا۔ اسی اثنا میں محبوب علی خاں خواجہ سرا مختارِ بادشاہی اور حکیم احسن اللہ خاں آکر حاضر ہوئے۔ حضور انور نے محل میں یاد فرمایا کہ یکا یک سوارانِ نمک حرام بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوئے اور زیر جھروکہ آکر پرا جما کر ایستادہ ہوگئے اور حسب قاعدہ سلامی ادا کی۔ حضور لامع النور نے حکیم احسن اللہ خاں کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے دریافت کرو کہ تم کون لوگ ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ اور کس کے نوکر ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟

حکیم احسن اللہ خاں نے بموجب حکم تسبیح خانے میں آکر سوارانِ باغیہ سے استفسارِ حال کرنا شروع کیا۔ چند افسر سواران گھوڑوں پر سے اُتر کر پٹڑی پر آکر کھڑے ہوگئے اور زیر جھروکہ

سے ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا شروع کیا۔

باغی سواروں کا بیان

حضورِ جہاں پناہ سلامت۔ آپ دین و دنیا کے بادشاہ ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو بائیس صوبے کا مالک کیا ہے۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم و فرماں بردار ہے۔ ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت شمار ہوتی ہے۔ آج تک ہندوستان میں جو منادی پھرتی ہے تو یہی بیان کیا جاتا ہے، خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی کا۔ انگریز لوگ آپکی طرف سے مالک و مختار ہیں۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں۔ امید وار انصاف ہیں۔ ہم لوگ ملازم انگریزی ہیں۔ ہمیں لوگوں نے اپنی جانیں بیچ کر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے لگا کر کابل کے ڈیرے تک فتح کر کے چودہ سو کوس میں عمل داری انگریزی قائم کرادی اور ہمیں لوگوں کی استعانت و امداد سے تمام ہندوستان پر تسلط ہوگیا۔ یہ ولایت سے کوئی فوج ہمراہ لے کر نہیں آئے تھے۔ سب ہندوستانی فوج کی کارگزاری ہے۔ شہادت کے واسطے ہمارے پاس تمغے موجود ہیں۔ اب چوں کہ تمام ہندوستان پر قبضہ اور تسلط انگریزوں کا ہوگیا اور کوئی سرکش باقی نہ رہا۔ اب سرکار کی نیت میں فتور واقع ہوا اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئے اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کرلیں اور ابتدا اس کی فرقہ فوج سے ہونی چاہیے۔ چناں چہ باہم صلاح کر کے یہ تجویز قرار پائی کہ ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی گئی کہ جس میں ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے منہ میں دینا پڑے اور اس ٹوٹے کو جانور کی جھلی سے منڈھوایا گیا۔ اب نہ معلوم وہ جھلی دراصل کس کس جانور کی ہے۔ وہ بندوقیں ہم لوگوں کو دی گئیں کہ تم کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹ کر بندوقوں میں ڈالو۔ ہم لوگوں نے بالاتفاق ہندو اور فرقہ مسلمان نے تعمیل حکم سے انکار کیا کہ ہم ہرگز ہرگز ایسا امر نہ کریں گے، خواہ سرکار نوکر رکھے یا نہ رکھے۔ فرقۂ ہندو کو تو گائے کی جھلی کا اشتباہ واقع ہوا اور اہلِ اسلام کو سور کی جھلی کا۔ ورائے ازیں ہندو نے یہ عذر کیا کہ ہم لوگوں میں اکثر برہمن، چھتری وغیرہ اعلا قوم کے لوگ ہیں، وہ کسی جانور کے گوشت کو منہ نہیں لگاتے۔ مسلمانوں نے بھی یہ عذر پیش کیا کہ ہم سوائے حلال جانور کے مردار کو منہ نہیں لگاتے۔ خدا جانے یہ حلال جانوروں کا پوست ہے یا مُردار، ہمارے مذہب میں ہرگز جائز نہیں۔ ہم ہرگز تعمیلِ حکم سرکار نہ کریں گے۔ اس پر سرکار کو یہ خیال ہوا کہ فوج نے عدولِ حکمی کی، اگر ان پر تشدد نہ کیا جائے گا تو ضعف حکومت سرکار متصور ہے۔ سطوتِ شاہی میں فرق آتا ہے۔

اور ہم لوگوں کو خیال دین و آئین دامن گیر ہوا۔ نزاع بڑھ گئی۔ مقدمہ طول کھنچ گیا۔ چار مہینے سے یہ تنازعہ درپیش ہے۔ حکام میں کمیٹیاں ہو رہی ہیں اور ہم لوگوں میں سوار پیادوں کی چھاؤنیوں میں جابجا چٹھیاں دوڑ گئی ہیں کہ یک قلم کل فوج انکار کر جائے اور نوکری چھوڑ دے اور زیادہ تشدد ہو تو ایک دن ایک تاریخ بالاتفاق تمام ہندوستان میں غدر مچا دو۔ پھر دیکھو یہ کیا کر سکتے ہیں۔ چناں چہ مفسدہ کا ظہور اب آ کر ہوا اور تمام فوج یک قلم جادۂ اطاعت سے منحرف ہوگئی۔ اور بنا اس بغاوت کی اس طور پر واقع ہوئی کہ حکام کی کمیٹیوں میں یہ بات قرار پائی کہ پہلے بسم اللہ میرٹھ سے ہونی چاہیے کہ یہ مقام صدر ہے اور بہت بڑا بھاری کمپو یہاں مقیم ہے اور پرانے بھروسے کی فوج کی اسی جا پر چھاؤنی ہے۔ جب یہ کمپو ٹوٹا کاٹ لے گا تو کسی اور فوج کو مجالِ سرتابی نہ ہوگی۔ چناں چہ حسب صلاح بالا ایک روز اور ایک تاریخ مقرر کر کے پریٹ پر فوج گورے کی جمائی گئی اور سولجروں کا توپ خانہ اور رسالہ کھڑا کیا گیا اور تیسرے رسالہ خاص ہندوستانی کو بلوا کر پریٹ پر ایستادہ کیا گیا اور افسرانِ رسالہ کو بندوقیں اور کارتوس دے کر حکم سنایا گیا کہ تم اس ٹوٹے کو کاٹو۔ افسران نے معذرت کی کہ سرکار معاف فرمایئے، ہم دین سے بے دین کبھی نہ ہوں گے، خواہ سرکار ہم کو توپ سے اڑا دے۔ جب افسروں نے انکار کیا تو پھر دوبارہ ان کو حکم سنایا گیا کہ تم کو ٹوٹا کاٹنا پڑے گا۔ پھر بالاتفاق سب نے اسی طرح انکار کیا۔ انجام کار سہ بارہ یہی حکم صادر ہوا۔ اس جانب سے وہی جواب صاف ملا۔ اس وقت حکم ہوا کہ ہتھیار دے دو۔ ہم لوگوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر حکم ہوا کہ گھوڑوں سے اتر پڑو۔ ہم گھوڑوں سے اتر پڑے۔ پھر حکم ہوا کہ افسر لوگ فوج سے علاحدہ ہو جائیں۔ ہم چوراسی افسر چھٹ کر رسالہ سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پھر حکم ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔ جب بھی عدولِ حکمی نہ کی۔ خوشی خوشی ہتھکڑیاں پہن لیں، کچھ عذر نہ کیا۔ پھر حکم ہوا تم لوگوں کو عدولِ حکمی کی سزا دی جاتی ہے۔ تم جیل خانے جاؤ۔ ہم سلام کر کے جیل خانے کو چلے گئے۔

تدبیر سے تقدیر مٹائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی قسمت کی بنائی نہیں جاتی

بادشاہ کا جواب

سنو بھائی مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے

بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جد و آبا کے نوکر چاکر اپنے خاوندانِ نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا۔ قوتِ لایموت کو محتاج ہو گئے۔ خصوصاً میرے جد بزرگوار حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی کو جب غلام قادر نمک حرام نے قید کر کے نابینا کیا ہے تو پہلے مرہٹوں کو طلب کیا گیا تھا اور انھوں نے اس نمک حرام کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ حضرت بادشاہ کو قید سے چھڑایا۔ چند سال مرہٹے بادشاہ کی جانب سے مختار رہے مگر بادشاہ کے صرف مطبخ کا بندوبست بھی نہ کر سکے۔ لاچار ہو کر میرے دادا نے منجاب سلطنت برطانیہ رجوع کیا اور انگریزوں کو بلوا کر اپنے گھر کا مختار فرمایا اور ملک ہندوستان ان کے تفویض کیا اور ان لوگوں نے حسب دل خواہ اخراجاتِ شاہی کا بندوبست کر دیا اور ملک میں امن و امان کا ڈنکا بجا دیا۔ اس روز سے آج تک ہم لوگ بہ عیش و عشرت تمام بسر کرتے چلے آتے ہیں۔ ہمیں کسی طرح کا فکر و اندیشہ دامن گیر نہیں اور کمال خوشحالی و فارغ البالی و عیش و عشرت سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں۔ اس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ خود کر لیتے ہیں۔ میں تو اک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھ سے کسی طرح کی توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے۔ البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمھارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمھاری صفائی کرا سکتا ہوں۔ تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو۔ میں نے صاحب ریذیڈنٹ کو بلوایا ہے۔ وہ میرے پاس آنے والے ہیں۔ پہلے میں ان سے دریافت کر لوں۔ ان کی زبانی مجھے حالِ فتنہ و فساد معلوم ہو جائے گا اور خدا چاہے تو میں اس فساد کو رفع دفع کرا دوں گا۔ غرض کہ یہ گفتگو ہنوز ناتمام تھی کہ فریزر صاحب ریذیڈنٹ بہ ہمراہیِ قلعہ دار صاحب داخلِ دیوانِ خاص ہو گئے۔ خواجہ سرا جا کر آداب کورنش بجالایا۔ اندر سے حکم آیا کہ دونوں صاحب محل میں حاضر ہوں۔ اس وقت صاحب ریذیڈنٹ بہادر، قلعہ دار صاحب اور احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں ہر چہار اشخاص محل شاہی میں داخل ہوئے۔

دلّی کی بربادی کا نوحہ

('فغانِ دہلی' کے چند ورق)

شرارۂ نخستیں

مسدس شہر آشوب از نتائجِ فکر بہادر شاہ ظفر

کیا پوچھتے ہو کج روی چرخِ چنبری ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستم گری
کرتا ہے خوار تر انہیں جس کو ہے برتری اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری
کھاوے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

بالعکس ہیں زمانے میں جتنے ہیں کاروبار شیوہ کیا ہے اُلٹا زمانے نے اختیار
ہے موسمِ بہار خزاں اور خزاں بہار آئی نظر عجب روشِ باغِ روزگار
جو نخلِ پُرثمر ہیں اُٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

بادِ صبا اُڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک ملتے ہیں سر بہ سر کفِ افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک کرتی ہیں بلبلیں یہی فریادِ درد ناک
شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

نزدیک اپنے آپ کو جو کھینچتے ہیں دور دیکھا تو صاف فہم میں اُن کے ہے کچھ قصور
ورنہ جو باصفا ہیں خردمندِ ذی شعور کیا دخل ان کو آئے کبھی نخوت و غرور

رکھتے غبارِ کینہ سے وہ سینہ صاف ہیں
ہر نیک و بد سے صورتِ آئینہ صاف ہیں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں — ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں — چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آ گیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں

یہ گنبدِ فلک ہے عجب طرح کا قفس — طاقت نہیں ہے نالہ کی بھی جس میں اک نفس
جنبش ہو ایک پَر کی تو ٹوٹ جائیں دس — رہ جائے دل کی دل میں نہ کس طرح سے ہوس

کیا طائرِ اسیر وہ پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ آواز کر سکے

کیا کیا جہان میں ہوئے شاہانِ ذی کرم — کس کس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آ کر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم — وارا کہاں، کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم

کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

دوئمی شرارہ

مولوی محمد صدرالدین خاں بہادر متخلص بہ آرزو

آفت اس شہر پہ قلعے کی بدولت آئی — واں کے اعمال سے دہلی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی — کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جس کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا — اہل و نااہل سے خلطہ انھیں زنہار نہ تھا
اُن کی خلوت سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا — آدمی کیا ہے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں اُن کو کہ ڈالیں سر پر

زیور الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا　　بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا　　لاکھ حکمت سے اوڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتی ہیں
دو قدم چلتی ہیں مشکل سے تو پھر گرتی ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی　　مہندی ہاتھوں میں لگا سوتی تو کیا گھبراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ اُس کو آتی　　ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی

اُن کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھایا تو سرہانے رکھا

جن کو بن دوشِ پرستار نہ چلتے دیکھا　　صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا
کبھو بیدار نہ سورج کے نکلتے دیکھا　　پاؤں دابے پہ بھی کروٹ ہی بدلتے دیکھا

وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور نالے ہیں
قدم اُٹھتا نہیں پاؤں میں پڑے چھالے ہیں

عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد　　مٹ گئے کچھ نہ رہا ہوگئے بالکل برباد
مکرے ہوتا ہے جگر سُن کے یہ ان کی فریاد　　پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھی دہلی آباد

کب تلک داغ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہوجائے زمیں شق تو سما جائیں ہم

روک سکتے نہ تھے جس بات پہ وہ اڑتے تھے　　صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھی لڑتے تھے
پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے　　آنچلوں سے نرے مقیش پڑے جھڑتے تھے

ان کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا ہے
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے پڑا بہتا ہے

عطرِ صندل میں جو دامن کو بسایا کرتے　　کنٹھے موتی کے گریباں میں لگایا کرتے
بیٹھ خلوت میں وہ زلفوں کو بنایا کرتے　　یہ سنگار آئینہ کو بھی نہ دکھایا کرتے

اب نہیں کچھ بھی انھیں زلفِ پریشاں کی خبر
نہ گریباں کی خبر اور نہ داماں کی خبر

روز بن ٹھن کے نکلنا وہ جوانوں کا کہاں　　بیٹھنا ناز و ادا سے وہ دوکانوں کا کہاں
شور ہر کوچے سے ٹپوں کی وہ تانوں کا کہاں　　لطف ساقی کا مزہ اور وہ گانوں کا کہاں

وہ مغنی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
دھوتی بندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

شکل ایسی کہ خدا اس کو نہ پھر دکھلائے ان کی پوشاک کو دیکھیں تو پھریری آئے
نظر آجائیں اگر وہ سرِ راہے گاہے خون اپنا کریں یا ان کا یہی جی چاہے
جن کے ہاتھوں سے نہ لیں پیر بھی دو کوڑی کے
چاندنی چوک میں پھرتے ہیں وہ اہلے گہلے

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مسدس شہر آشوب

محمد علی تشنہ مردِ آزاد وضع، شاگردِ ذوق

عجیب کوچۂ رشکِ جناں تھا دہلی کا بہشت کہتے ہیں جس کو مکاں تھا دہلی کا
دماغ بر سرِ ہفت آسماں تھا دہلی کا خطاب خطۂ ہندوستاں تھا دہلی کا
غضب ہے اس کو کوئی شادماں نہ دیکھ سکا
زمیں نہ دیکھ سکی آسماں نہ دیکھ سکا

ہزاروں زلفِ پری وش کے یاں تھے سودائی ہزاروں میکش و میخوار و مست و صہبائی
شرابِ عیش پلاتا تھا چرخِ مینائی قبول کرتے تھے اس در کی سب جبہ سائی
جو آتا تھا سو وہ ہو رہتا تھا اسی گھر کا
زمیں کی ناف ہے، کعبہ ہے بطنِ مادر کا

یہاں کی خاک میں کیفیت ابرِ باراں کی یہاں کے آب میں تاثیر آبِ حیواں کی
یہاں کی بادِ بہاری ہوا زمستاں کی یہاں کی آگ میں گرمی تھی شعلہ رویاں کی
ہر ایک شخص کے حق میں یہ شہر اچھا تھا
مریضِ عشق کے بھی واسطے مسیحا تھا

وہ تختِ سلطنت و بارگاہِ سلطانی کہ جس میں بیٹھتے تھے آکے ظلِ سبحانی
پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی بجا اس اوج پہ تھا دعویِ سلیمانی

ہر ایک قصر کو دعویٰ تھا طاقِ کسریٰ کا
دماغ عرش پہ تھا قلعۂ معلّٰی کا

کسی زمانے میں ایسا تھا یاں کا تخت نشیں خراج دیتے تھے سب بادشاہِ روئے زمیں
خطا و ملکِ ختن سب تھے اُس کے زیرنگیں تمام کانپتے تھے اس سے چین اور ماچیں
دیار ہند تھا مشہورِ خلق نام اس کا
چراغ روم سے جلتا تھا تا بہ شام اُس کا

زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے ناگاہ تمام ہوگیا تاراج ملک و مال اور جاہ
کہ اس سے ہوگئے بدتر غریب شاہنشاہ رعیت اس کی ہوئی اس سے بھی زیادہ تباہ
وہ ساہوکار نہ تھا جس کی ساکھ میں بٹّا
اب اس کے نام یہ لگتا ہے لاکھ میں بٹّا

یہ لوگ کہنے لگے آگ اس وطن کو لگے نظر نہ ایسی الٰہی کسی چمن کو لگے
سنانے اہلِ سخن صاحبِ سخن کو لگے جو ایک تار بھی باقی ہو تو کفن کو لگے
تمام شہر تلنگوں نے آکے لوٹ لیا
مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آکے لوٹ لیا

ملا یہ حکم کہ سب لوگ یاں سے ٹل جائیں اسی میں خیر ہے جو شہر سے نکل جائیں
دبی ہے بقچی تو دکھلا کے یاں بغل جائیں جو کچھ ہے، چھوڑ یہاں صاحبِ دوَل جائیں
نہ سر پہ ٹوپی ہے اُن کے نہ پاؤں میں جوتی
بغل میں طوطے کا پنجرا بنی جی بھیجو جی

میانِ راہ کھڑے تھے وہ راہزن بے پیر کہ جن کے ہاتھ میں لاٹھی تھی مثل گُرزِ نکیر
یہ کہہ رہے تھے کہ آگے بڑھو صغیر و کبیر کہاں سے کھینچ کے لائی تمھیں کہاں تقدیر
سب اُن کے خوف سے کرتے تھے آہ و نالہ لوگ
مثالِ غولِ بیاباں تھے گاؤں والے لوگ

گرہ ٹٹولی کسی کی کمر میں ڈالا ہاتھ ہر ایک مضطر و خستہ جگر پہ ڈالا ہاتھ
پدر کو چھوڑ دیا تو پسر پہ ڈالا ہاتھ جو سر برہنہ تھا اس کے بھی سر پہ ڈالا ہاتھ
الٰہی ہاتھ نہ ٹوٹے ستم شعاروں کے
کہ ہاتھ دھو کے پڑے پیچھے خاکساروں کے

چھڑایا ان سے جو دامن تو لپٹے خارِ دشت — بجائے سرمہ لگا آنکھ میں غبارِ دشت
بنے تھے قیس کی مانند خاکسارِ دشت — دیارِ ہند چھنا اور ملا دیارِ دشت
جنھوں نے ڈھوے تھے پتھر نہ کوہکن کی طرح
وہ خاک چھانتے بن بن پھرے ہرن کی طرح

یہاں جو آن کی دیکھی تو دار کی صورت — وہ دار کہیے جسے ذوالفقار کی صورت
مٹا دی چشم زدن میں ہزار کی صورت — نظر پڑی نہ کسی بے قرار کی صورت
برنگِ تیرِ شہاب آگ میں جلے لاکھوں
سپردِ دار و رسن ہوگئے گلے لاکھوں

مکاں کو آ کے جو دیکھا تو لامکاں ہے وہ — جہاں نہ چغد بھی بیٹھے اب آشیاں ہے وہ
جو شہر یار کو پوچھا کہو کہاں ہے وہ — تو یہ سنا کہ کھنڈر دیکھ لو نشاں ہے وہ
نہ اہلِ شہر رہے اور نہ شہر یار رہا
رہا تو نام ہی خالق کا برقرار رہا

رہی نہ جنسِ محبت کی اب خریداری — جو یوسف آئی نہ ہو تو بھی گرم بازاری
اُٹھائے کون حسینوں کی ناز برداری — لگائے دل کوئی جاں ایسی کس کو ہے پیاری
بقولِ شخص عجب ملکِ حسن بستی ہے
کہ دل سی چیز یہاں کوڑیوں کو سستی ہے

کسی کا دل نہیں اس درد میں ٹھکانے سے — رہا نہ گانے سے شوق اور نے بجانے سے
غرض نہ غیر سے مطلب نہ ہے بگانے سے — وفا و مہر تلک اُٹھ گئے زمانے سے
کہاں سے لائیں وہ پہلی سی اب ادا معشوق
اسی سبب سے ہیں مشہور بے وفا معشوق

کوئی فقیر جو کوڑی دکان مانگے ہے — تو اس کو کہتے ہیں کیا تو ہر آن مانگے ہے
تری طرح سے یہاں سب جہان مانگے ہے — چل اپنی راہ سے کیا ہم سے دان مانگے ہے
جو مال بڑھتا ہی جاتا تھا گھٹ گیا بالکل
دوکانداروں کا طبقہ اُلٹ گیا بالکل

کوئی کہے کہ تپ غم کی بسکہ شدت ہے — تو یوں کہیں کہ ہمیں آپ ہی حرارت ہے
چڑھا ہوا ہے بخار آج کل یہ نوبت ہے — تم اپنا کام کرو جاؤ تم کو صحت ہے

مریض جائے کرے کیا کہ طعن کرتے ہیں
طبیب اپنا مرض خود بیان کرتے ہیں

یہ شعر کہتے ہیں اور لوگوں کو سناتے ہیں وہ بیٹھے رہتے ہیں آتے ہیں اور نہ جاتے ہیں
جو قدرداں نہیں اپنا کسی کو پاتے ہیں تو دل ہی دل میں وہ خونِ جگر کو کھاتے ہیں

غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے
مذاقِ شعر و سخن اُٹھ گیا زمانے سے

مسدس شہر آشوب

نواب میرزا داغؔ دہلوی

فلک زمیں و ملائک جناب تھی دہلی بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دہلی
جواب کا ہیکو تھا لاجواب تھی دہلی مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہرہ وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانندِ صبح نورانی یہاں کے ذرے میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعلِ رمانی یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی

یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ رشکِ تجلائے طور تھا اس کا

فلک تھا خوبی و حسن و جمال کا دشمن صباحِ عشرت و شامِ وصال کا دشمن
عدوئے اہلِ کمال اور کمال کا دشمن غرض کہ اب تو ہوا جان و مال کا دشمن

یہ مفت بر جو تلاشی ہے نقدِ جاں کے لیے
خضر بھی روئیں گے اب عمرِ جاوداں کے لیے

خدا پرستی کے بدلے جفا پرستی ہے — جو ہال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے
بجائے ابرِ کرم مفلسی برستی ہے — بتنگ جینے سے ہیں ایسی تنگ دستی ہے

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا
یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعیں — جو ماتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دیں
یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دینِ متیں — کیے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسیں

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا، کام ہی تمام کیا

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا — تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا — غرض کہ لاکھ کا گھر اُس نے خاک کر ڈالا

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

عجیب شکلِ گل و گلستاں نظر آئی — پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تا مژۂ خوں چکاں نظر آئی — تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گل رخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

کھلایا زہر ستم گر نے پان کے بدلے — پلایا خونِ جگر پیچ وان کے بدلے
نصیب دار ہوئی ہے نشان کے بدلے — ملا نہ گو گڑھا بھی مکان کے بدلے

یہ دعوتِ فلکِ کینہ ساز تو دیکھو
اور اس پہ اس ستم آرا کے ناز تو دیکھو

لہو کے چشمے ہیں چشمِ پُرآب کی صورت — شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
لیے ہیں گھر دلِ خانہ خراب کی صورت — کہاں یہ حشر میں توبہ عذاب کی صورت

زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی
رسن ہے طوق ہے گردن ہے بے گناہوں کی

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے — ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے — غرض یہاں کے لیے اک جہان روتا ہے

جو کہیے جوششِ طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوحؑ کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگِ بوئے گل اہلِ چمن چمن سے چلے　　غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھ زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے　　قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے
مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

یہ خاصیت تو نہ رکھتی تھی زہر کی گرمی　　یہاں تھی شعلہ عذارانِ شہر کی گرمی
نہ دیکھیں جو نگہ چشم و قہر کی گرمی　　اٹھائیں ہائے وہ جلتی دوپہر کی گرمی
تپش سے ریگِ بیابان آفتاب ہوئی
زمیں مگر کرۂ نار کا جواب ہوئی

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت　　چڑھے ہی آتے تھے سر پر بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی اک اک گنوار کی صورت　　چھپی نہ اُن سے پر اہلِ دیار کی صورت
کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا
تو اہلِ قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا

زبان بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی　　ملیں جو خاک بھی منہ پر تو مل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی　　پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی
جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں

بنا ہے خالِ سیہ، رنگ مہ جمالوں کا　　دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا　　عجیب حال دگرگوں ہے دلّی والوں کا
کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پیادہ پا ہو رواں شہ سوار صد افسوس　　لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہلِ وقار صد افسوس　　ہزار حیف دلِ بے قرار صد افسوس
جھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

پے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی تلاش بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی کہ حکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی
یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ

غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہوجائیں کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہوجائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہوجائیں جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہوجائیں
پئیں جو آبِ بقا بھی تو زہر ہوجائے
جو چاہیں رحمتِ باری تو قہر ہوجائے

جہاز ایسا تباہی میں آگیا اپنا ملا نہ تحتِ ثریٰ تک کہیں پتا اپنا
رہا نہ آہ زمانے میں آشنا اپنا بجز خدا کے نہیں کوئی ناخدا اپنا
کسی سے ڈوبے ہوئے ایسے کب نکلتے ہیں
یہاں سے حضرتِ الیاس بچ کے چلتے ہیں

یہ وہ جگہ ہے کہ عبرت پہ عبرت آتی ہے یہ وہ جگہ ہے کہ شامت پہ شامت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ آفت پہ آفت آتی ہے یہ وہ جگہ ہے کہ حسرت پہ حسرت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے جہاں بے کسی بھی ڈر جائے
یہ وہ جگہ ہے اجل خوف کھاکے مرجائے

لکھوں کہاں تلک القصہ حالِ بربادی لکھوں کہاں تلک اس آسماں کی جلادی
کسی کو قیدِ محن سے نہیں ہے آزادی کہ داغ داغ ہے دل ہر کوئی ہے فریادی
الٰہی پھر اسے آباد و شاد دکھلا دے
الٰہی پھر اسے حسبِ مراد دکھلا دے

نوا سنجی و دوستاں طرازی

مرزا قربان علی بیگ خاں المتخلص بہ سالکؔ

جہاں میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد بس اُن بلاد میں تھا منتخب جہاں آباد
اُجڑ کے یاں سے نہ پوچھو ہوا کہاں آباد گیا عدم کو دوبارہ ہوا وہاں آباد

فلک نے کس سے کہوں کیوں مٹا دیا اُس کو
ارم کا جوڑ سمجھ کر اُٹھالیا اُس کو

زبسکہ رکھتے ہیں دل سے عزیز سب اُس کو — زمیں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں روز و شب اُس کو
سنا ہے بستے ہوئے آسماں پہ جب اُس کو — بلند شہر کہیں کیوں نہ لوگ اب اُس کو
یہ اُٹھ گیا ہے اور اٹھنا نشانِ رفعت ہے
بلند شہر کو کیا ورنہ اس سے نسبت ہے

زمینِ پست یہاں کی تھی آسماں منظر — ہر ایک ذرّہ یہاں کا تھا مہر کے ہم سر
یہاں کی خاک تھی اکسیر سے بھی کچھ بہتر — یہاں کے آب میں آبِ حیات کا تھا اثر
نسیم خلد سے بہتر سموم تھی یاں کی
یہ وہ چمن ہے کہ دنیا میں دھوم تھی یاں کی

ہر اک مکان یہاں کا تھا اک مکانِ سرور — ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک جہانِ سرور
ہر اک دکان یہاں کی تھی اک دکانِ سرور — غرض یہ شہر نہ تھا، تھا یہ ایک کانِ سرور
جدھر کو دیکھیے آوازِ بربط و نے ہے
نہ جانتا تھا کوئی رنج و غم کو کیا شے ہے

یہ شہر کس لیے برباد ہوگیا یارب — لگی کسی کی یہ کیا ایسی بددعا یارب
یہاں کے لوگوں سے کیا ہوگئی خطا یارب — ہوئے ہیں کس لیے یہ موردِ جفا یارب
غرض تھی غدر سے ہودیں گناہگار ثقات
وگرنہ ہوتے نہ ہرگز سزائے وار ثقات

چلی تھی دہر میں گویا ہوا یہ چوپائی — کہ فوجِ باغیہ چاروں طرف سے یاں آئی
تمام شہر کی خوب آکے خاک اُڑوائی — یہ بادِ تند تھی خاشاک کی تمنائی
رہی نہ خاک بھی امن و امان کی صورت
کچھ اور ہوگئی سارے جہان کی صورت

یہ انقلاب ہے یا ہے قیامتِ صغرا — کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی ہے آدمی کی شکل شہر میں عنقا — بنا ہے ہُو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچہ

ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد
ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہاں آباد

کسی کے لب پہ ہے نالہ، کسی کی چشم ہے تر　　کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پر کوئی ہے تھامے جگر　　غرض کہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر
بجائے زمزمہ ہر جائے شیونِ غم ہے
محلِ عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے

مکاں شکستہ ہیں مانندِ خاطرِ مایوس　　اُجاڑ کوچے بسانِ دلِ الم مانوس
وہ شکل ہی نہ رہی شہر ہوگیا معکوس　　ستم کیا فلکِ بد شعار نے افسوس
یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنے کو خلقت آئے
اور اب جو دور سے دیکھے کوئی تو عبرت آئے

سمجھ کے اپنا ٹھکانا گئے جہاں ہم لوگ　　ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ　　پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ
زمین ہوگئی دشمن نہ پائی جائے ثبات
ٹھہر سکا نہ کسی جائے اپنا پائے ثبات

وہ لوگ کھاتے تھے جن کی نشاط کی قسمیں　　پڑے ہیں طالعِ ناسازگار کے بس میں
محل میں رہتے تھے یا اب پڑے ہیں خُسبس میں　　نہ تاب دل میں ہے طاقت نہ جانِ بیکس میں
جو تشنہ لب ہوں تو آبِ دمِ سناں موجود
جو گرسنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود

ہوئے ہیں قتل جو بے جرم لوگ دلّی کے　　بہشت چاہیے پہلے انھیں قیامت سے
کیا جنابِ الٰہی میں عرض رضواں نے　　کہ آج کل درِ فردوس کس طرح سے کھلے
ملا جواب کہ دلّی کو لاؤ اٹھواکر
اور اس گروہ کو اس میں بساؤ لے جاکر

وہ جس کی طبع کہ آسودگی پہ مائل ہے　　پیادہ کیوں کہ چلیں ناقہ ہے نہ محمل ہے
اٹھائیں ایک قدم بھی اگر تو مشکل ہے　　قدم کہے کہ ٹھہر جاؤ یہ ہی منزل ہے

سروں پہ بوجھ ہے گٹھری کا لڑکھڑاتے ہیں
بس اپنے جی کی طرے بیٹھ بیٹھ جاتے ہیں

لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا ہے ہے بیان مجھ سے ہو کیوں کر یہ ماجرا ہے ہے
نہ آئی جن کی کبھی در تلک صدا ہے ہے نکل کے گھر سے چلی ہیں پیادہ پا ہے ہے

کبھی نہ غصے میں بھی جامہ سے جو باہر ہوں
غضب ہے یہ کہ وہ یوں بے ردا و چادر ہوں

ہجومِ مسجدِ جامع کا کیا کروں اظہار صفِ ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار
ہر ایک صف میں نہ رہتا مصلّیوں کا شمار اب اس کو دور ہی سے دیکھنا ہوا دشوار

نماز ہے نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہے

وہ اس کے گرد کے بازار اور وہ زینت ہجومِ خلق سے ہر روز اک نئی صورت
کہ جس کے دیکھنے سے طبع کو ہو اک فرحت یہاں سے جائے کسی میلے میں تو ہو نفرت

الٰہی کیا ہوئے اجناسِ رنگ رنگ کے ڈھیر
پڑے ہوئے ہیں گل و خشت و چوب و سنگ کے ڈھیر

دراز دستیِ دیہاتیانِ بد انجام خدا دکھائے نہ صورت کبھی سنائے نہ نام
کسی طرح سے سمجھ میں نہ آئے جن کا کلام گریز پا جو نکل کر گئے لٹے وہ تمام

لُٹا لباس تلک آبرو بھی واں کھوئی
گرہ میں کچھ بھی نہ نکلا تو نقدِ جاں کھوئی

بچاؤ جان کے، اس جان کی محبت میں گیا جو مضطربانہ کسی ریاست میں
تو گیر و دار سے آیا وہاں بھی آفت میں یہاں سے اور زیادہ پھنسا مصیبت میں

جو نقد کچھ ہے تو مخبر کا قرض دار بنا
وگرنہ بے گنہی میں گناہ گار بنا

بیان سن کے یہ سالک اُڑے جو میرے ہوش بسانِ صورتِ دیوار رہ گیا خاموش
ہجومِ فکر سے خوں دل میں مارتا تھا جوش کہ ناگہاں تتقِ غیب سے بہ بانگِ سروش

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نہ خواہد ماند
چناں نہ ماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

مسدس شہر آشوب

مرزا باقر علی خاں کامل خلف اکبر زین العابدین خاں عارفؔ

تمام گلشنِ عیش و سرور تھی دہلی　　تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام مطلعِ خورشید نور تھی دہلی　　تمام غیرتِ صد کوہِ طور تھی دہلی
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکانِ عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہانِ عیش

ملک صفات تھا یاں کا ہر ایک فردِ بشر　　بُرا بھی یاں کا زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے عام کو تھا فوقِ خاص دنیا پر　　یہاں کے نام سے بکتا تھا مِس بھی زر ہوکر
یہ فوجِ باغیہ کیا شہر میں خدا آئی
کہ قہر آیا غضب آیا اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں　　جو روز عیش میں گزرا تو شب مسرت میں
پڑے ہوئے ہیں وہی اب تو رنج و حسرت میں　　پھنسے ہیں غم میں گرفتار ہیں مصیبت میں
وہ شاہزادے کہاں اور وہ بادشاہ کہاں
رہا جو کوئی تو وہ مرتبہ وہ جاہ کہاں

یہ قلعہ رشک دہِ گلستانِ رضواں تھا　　یہ قلعہ خلد تھا اس میں ہر ایک غلماں تھا
یہ قلعہ تھا کہ خدایا کوئی پرستاں تھا　　یہ قلعہ پیکرِ دنیا کے واسطے جاں تھا
نہ رہنے والے رہے اور نہ وہ مکان رہا
فقط دکھانے ہی کے واسطے نشان رہا

سنے جو کوئی تو ہاں دردِ دل عیاں کیجے　　صدائے طائرِ گم گشتہ آشیاں کیجے
حیات بخش کا گر ماجرا بیاں کیجے　　تو چاہیے کہ بہت نالہ و فغاں کیجے
یہ وہ جگہ ہے کہ جنت کو جس سے غیرت آئے
جو دیکھیں حور و ملک بھی کبھی تو حسرت آئے

وہ لعل پردہ، کہ تھا جس سے احتشام عیاں　　خوشی سے خسرو و پرویز ہو جہاں دربان
عوام کو تو وہاں جانے کی مجال کہاں　　کہ خاص خاص بھی جاتے تھے بس تو سجدہ کناں

جھکے ہی رہتے تھے جس جائے اک جہاں کے سر
قدم بھی وہاں نہیں دھرتا ہے اب کوئی جا کر

یہ وہ ہی چوک ہے میلہ تھا جس جگہ ہر روز　　یہاں تو رہتے تھے مہ طلعتانِ دل افروز
نظر کو ہوتی تھی کیفیتِ سرور اندوز　　جدھر کو دیکھتے تھے اک بہارِ کلفت سوز
نشان بھی نہیں اب تو ہجومِ خلقت کا
بنی ہے وہ ہی جگہ بس مقام عبرت کا

یہ وہ ہی مسجدِ جامع کہ جس میں ایک جہاں　　نماز کے لیے آتا ہے دور دور سے واں
تبرکات جو اس میں تھے کیا ہو ان کا بیاں　　ادب سے کرتے تھے ان کی زیارت اہلِ زماں
وہ اس کی رونقِ بازار چار سو مت پوچھ
کہ مجھ سے ہو نہیں سکتی ہے گفتگو مت پوچھ

نہ دیندار ہے یہ فوج اور نہ دیں داری　　سیاہ روؤں کو تو آتی تھی بس سیہ کاری
نہ جانتے تھے وہ کچھ بھی بجز ستم گاری　　حرام خوروں کو ہر دم تھا شغلِ میخواری
تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا
ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

وہ لوگ سینکڑوں رہتے تھے جن کے ساتھ سوار　　کیا پیادہ انھیں اے سپہرِ ناہنجار
اٹھائیں سر پہ وہ گٹھری کا کس طرح سے بار　　اٹھانا ایک قدم کا بھی جن کو ہو دشوار
تہِ زمین جگہ چاہیے اماں کے لیے
دعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لیے

نہ چہچہے کوئی دم اور نہ قہقہے کوئی آن　　فسردہ دل ہیں جو کرتے ہیں عیش میں گزران
نہ ہوش بھی ہیں ٹھکانے نہ باقی ہیں اوسان　　ذلیل وخوار ہیں پھرتے ہیں جا بہ جا حیران
فلک نے پھینک دیا ہے کہاں کہاں ان کو
بجائے زمزمہ ہے نالہ و فغاں اُن کو

الٰہی بھاگ کے یاں سے کوئی کہاں جاوے　　کوئی نظر میں ٹھکانا نہیں جہاں جاوے
کوئی جگہ نہیں جس جا پے اماں جاوے　　اگر زمین پھٹے تو سما وہاں جاوے

دکھائی دیتا ہے ہر اک عدوئے جاں اپنا
بنا ہے دشمنِ جانی یہ آسماں اپنا

کہاں تلک کوئی اس غم کی داستاں لکھے　　کہاں تلک کوئی کیفیتِ فغاں لکھے
کہاں تلک کوئی یہ دردِ خوں چکاں لکھے　　کہاں تلک کوئی بیدادِ آسماں لکھے

دعائے کاملِ غمگیں ہو مستجاب خدا
بنی ہوئی نہ ہو کوئی جگہ خراب خدا

سیّد ظہیرالدین صاحب ظہیر دہلوی

بل بے دہلی و زہے شوکت و شانِ دہلی　　لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی
مل گئی خاک میں سب شوکت و شانِ دہلی　　نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی
اے فلک اپنے گریبان میں منہ ڈال ذرا　　ہائے یہ ظلم و ستم اور کسانِ دہلی
وہ قیامت میں فرشتوں کو لٹا دیتے ہیں　　شوخ و بدمست و فسوں کار بتانِ دہلی
نام کوثر کا نہ لو حضرتِ واعظ دیکھو　　چوس جائیں نہ کہیں دُرد کشانِ دہلی
زمزمہ بھول گئے نغمہ طرازانِ چمن　　ہے ہر اک نوحہ گرو مرثیہ خوانِ دہلی
رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی　　اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی
فلکِ پیر نے مٹی میں ملایا سب کو　　پھرتے ہیں خاک بہ سر پیر و جوانِ دہلی
ہیں نئے ڈھنگ نئے رنگ نئی گفت وشنید　　ایک عالم سے نرالا ہے جہانِ دہلی
دلربا، مہ لقا، ماہ جبیں، دشمنِ دیں　　کیا قیامت ہیں طرحدار بتانِ دہلی
ایک سے ایک طرحدار نظر آتا ہے　　عالم آشوب ہیں یہ کج کلہانِ دہلی
چرخ بدر ہیں یہ غضب ہے نہ انھیں دیکھ سکا　　چند اشخاص جو باقی تھے نشانِ دہلی
کیوں نہ پامال ہو مردہ ہے بدستِ زندہ　　جسم دوزخ میں ہے فردوس میں جانِ دہلی
خوش متاعی سرِ بازار ہے ارزِ بازار　　جو ہر فرد ہے کل جنسِ دوکانِ دہلی
بولتے ہیں جسے اردوے معلّٰی احباب　　ایّہا النّاس ہے وہ خاص زبانِ دہلی

رات دن گریہ ہے اور سنگ ہے اور سینہ ہے
اور ظہیرِ جگر افگار و بیانِ دہلی

('فغانِ دہلی' مرتبہ: مرزا قربان علی بیگ سالکؔ سے ماخوذ)

آغا حیدر حسن مرزا

۱۸۵۷ء کی کہانی بڑے بوڑھوں کی زبانی

انتخاب از غدر کی کہانی، نواب حیدری بیگم زوجہ نواب احمد حسن خاں
المعروف بہ نواب موسیٰ خاں المخاطب مظفر الدولہ کی زبانی

میرے پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ لال کنویں پر ددا سوبھا اور پیر بخش غلام کے ہمراہ رتھ میں بیٹھ کر جراح کو دکھانے آئی تھی۔ اس کی دوکان سے اُتری ہی ہوں گی کہ کچھ سوار علی علی دین دین کہتے ہوئے ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے کھاری باؤلی کی طرف گھوڑے دوڑاتے چلے گئے، پیر بخش اور ددا سوبھا گھبرا کر مجھے ایک کوٹھے پر لے چڑھے اور رتھ بان ایک گلی میں رتھ گھسا لے گیا۔ غرض وہاں سے تھوڑی دیر بعد اتر بھاگا بھاگ بھاگتے چاوڑی میں سے ہوتے ہوئے ٹوکری والوں اپنی حویلی پہنچے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ حویلی کا پھاٹک بند ہے۔ پیر بخش نے کیواڑ پیٹے اور دوا سوبھا نے زہرا پھاڑ کر چیخیں ماریں۔ باوا جان جو مارے گھبراہٹ کے بیڑے میں ٹہل رہے تھے اور دو آدمی ہماری خبر لینے کو روانہ کر چکے تھے، ددا کی آواز پہچان خود دوڑے ہوئے آئے، کھڑکی کھول ہمیں اندر لیا اور کہا کہ غضب ہو گیا، کمپنی کی دیسی فوج بگڑ گئی اور جہاں کہیں بدیسیوں کو پاتی ہے تلوار کے گھاٹ اتارتی ہے۔ خدا خیر کرے۔ دیکھیے کیا نتیجہ ہو۔ عمر میری چھوٹی ہی تھی۔ کوئی دس گیارہ برس کی ہوں گی، لیکن میری یاد چھٹپنے میں غضب کی تھی، اب اس بڑھاپے میں اس پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ نہیں تو ذرا ذرا سی معمولی بات مجھے خوب یاد رہتی تھی۔ اور کجا کہ یہ قیامت صغرا، کہ جو گاہ بھ میں

بھی ہوں گے اُن کو بھی یہ واقعہ تو یاد ہوگا۔ ایسا گہرا اثر اس مصیبت کا دلوں پر پڑا تھا۔ دور کیے دور نہ ہوتا اور بھلائے نہ بھولتا تھا۔ ساری مصیبت اب تک تازہ ہے اور کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ایک مدت تک گھر میں رہے۔ پھاٹک حویلی کا ہر وقت بند رہتا۔ مامائیں، اصیلیں اور نوکر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ صرف ہمارے ہاں آدمیوں میں پیر بخش رہ گیا تھا۔ گھر میں مغل، حرمت، ظہورن، سوبھا اور بچھی رہ گئی تھیں۔ ان میں سے بچھی، سوبھا اور مغل تو زرخرید تھیں اور میری نانی حضرت نواب امانی بیگم صاحب جو درگاہ کی مہتممہ تھیں اور بادشاہ سلامت کو تسبیح دیا کرتی تھیں، ان کا معمول تھا کہ صبح نور ظہور فجر کے تڑکے خواب گاہ میں جاتیں اور کہتیں، جہاں پناہ سلامت ظلِ سبحانی بیدار ہو جیے اور کلمہ درود شریف پڑھتے ہوئے تسبیح بادشاہ کو پیش کرتیں اور حضور کا معمول تھا کہ صبح اٹھتے ہی ان کی صورت دیکھتے تھے اور ان کا سرکار سے بارہ سو روپے سال وظیفہ مقرر تھا۔ بچھی جو میری مانی تھی اس کو نانی حضرت نے سو روپے میں خریدا تھا۔ بچاری کہا کرتی تھی، متھرا کے قریب کوئی گاؤں تھا اس میں رہتی تھی۔ کنوئیں پر پانی بھرنے آئی۔ نگوڑے بنجارے نے پکڑ لیا اور مشکیں کس بورے میں ڈال، ڈنڈے ڈیرے سنبھال دلّی کی طرف لے آئے۔ یہ بدنصیب چیختی پیٹتی ہی رہی اور قلعے میں ۱۱ سو روپے میں بیچ ڈالا۔ نانی حضرت کی صحبت میں مسلمان ہوگئی۔ نماز اپنے شوق سے سیکھی، ننانوے نام اللہ کے یاد کیے جن کا ورد مرتے دم تک کرتی رہی۔ میری اماں جان کے جہیز میں یہ اور مغل دی گئیں۔ دو اسو بھا چوں کہ اماں جان کی مانی تھی وہ اپنی خوشی سے خود چلی آئی اور آخر دم تک ہمارے ہی ہاں رہی۔ بڑی باوفا تھی، اللہ جنت نصیب کرے۔ میری نانی حضرت رنگون حضرت بادشاہ سلامت کے ساتھ گئیں اور وہیں انتقال فرمایا۔ میرے نانا مرزا الٰہی بخش صفوی، خدا بندہ مرزا صفوی کے پوتے تھے، خدا بندہ مرزا طہماسپ صفوی ثانی کے بیٹے تھے اور ہندوستان حضرت محمد شاہ کے زمانے میں چلے آئے تھے۔ میرے نانا حضرت نے بڑی عمر پائی اور غدر سے اٹھارہ بیس برس پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری نانی حضرت بیوہ رہیں۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں ایک کا نام مبارک النساء بیگم تھا جو میری اماں جان تھیں اُن کی شادی مرزا حسین علی صفوی سے ہوئی یہ میری والدہ کے ہم جد تھے اور دوسری صاحبزادی میری خالہ اماں تھیں۔ ان کا نام صاحب النساء بیگم تھا۔ ان کی شادی مرزا شاہ رخ سے ہوئی اور نواب صاحب محل خطاب ملا۔ مرزا شاہ رخ کو

شکار میں بگھیلے نے پھاڑ ڈالا۔ اور خالہ اماں بیوہ ہوکر بادشاہ سلامت کے پاس قلعے میں رہتی تھیں، نواب ممتاز محل کے ساتھ۔ نواب ممتاز محل کا نام نیازی بیگم تھا اور یہ مرزا فخرو کی بیگم تھیں۔ بادشاہ سلامت کو میری خالہ اماں کی دل جوئی، دل داری کا بڑا خیال تھا۔ مرزا شاہ رخ کی وفات کے بعد برسات میں ایک موقعے پر یہ ساون انھی کے لیے کہا تھا:

اب مورے سیاں گئے ہیں بدیس موہے چوندری کون رنگا دے
بیر ساون آیا رے
جو سیاں ہوتے تو کہتی لال لال کنبھ کڑا دے
بیر ساون آیا رے

ایک دن کوئی آدھی رات گئے باہر پھاٹک پر کسی نے آواز دی۔ پیر بخش کے سوال جواب کی آواز آئی۔ لیکن کچھ صاف طور پر سنائی نہ دیا۔ اور کچھ بھید سمجھ میں نہ آیا۔ دل پریشان تھا۔ اس رات کا سناٹا کچھ غیر معمولی سا تھا۔ آسمان سے وحشت اور پریشانی بڑی برس رہی تھی۔ بھادوں ختم ہو چکا تھا۔ کنوار کا مہینہ تھا۔ کنوار جاڑے کا دوار مشہور ہے۔ باہر کے دالان اور کمانچوں میں پنبئی پردے بندھے ہوئے تھے۔ ایک کمانچے میں مجھے اور بھائی کو دوا سو بھا لیے لیٹی تھی اور کہہ رہی تھی، سو رہو۔ اے ہے آنکھیں بند کرو۔ ووئی نیند کون لے گیا، اچھا جو پہلے سوئے وہی بادشاہ۔ اماں جان بے چاری میرا قن اُن کو نیند کہاں۔ وہ صدر دالان میں بیٹھی وظیفے پڑھ رہی تھیں۔ دوسرا کمانچہ باوا جان کی خواب گاہ تھا۔ وہ وہاں آرام کر رہے تھے۔ اور صدر دالان کے بیچ میں در میں مردنگ روشن تھا کہ کسی نے اندر کی ڈیوڑھی کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں نے ددا کے کہنے سے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ ایکا ایکی کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ سے اچھل پڑی۔ ددا نے فوراً مجھے چھاتی سے لگالیا کہ اے ماں میں تیرے صدقے۔ تیرے قربان گئی۔ واری کوئی ڈیوڑھی پر ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اتنے میں اماں نے بلبلا کر کہا۔ کہ اے صاحب کیا آرام کرتے ہو۔ شابش ہے۔ خوب غفلت کی نیند ہے۔ باوا جان نے ہنکارا بھرا اور بھرائی آواز سے کہا کہ نہیں تو جاگ رہا ہوں۔ بیگم! تم تو بس یونہی سڑن ہوگئی ہو۔ اتنے میں ددا سو بھا للکاری کہ ان کم بختوں مغل اور حرمت کو دیکھو، کیا مردوں سے شرط باندھ کے سوئیاں ہیں۔ درے میں سے بچھی بولی۔ ہوں ہوں!

یہ بے چاری بھی ہول دلی تھی اور وظیفہ پڑھ رہی تھی۔ اتنے میں باہر سے پیر بخش نے آواز دی۔ ظہورن! چھوٹی سرکار تشریف لائی ہیں۔ یہ سن اماں جان پھڑک کر باہر صحن چبوترے پر نکل آئیں۔ فرشی تہ پوشی پہنے تھیں۔ گھبرا کے جو اٹھیں پائنچے سنبھالنے بھول گئیں۔ مردنگ کے پاس سے جو تیزی سے گزریں، مردنگ گر پڑا، شمع ٹھنڈی ہوئی اور اندر اندھیرا گھپ ہوگیا۔ ددا نے مجھے سینے سے لگالیا اور ایک ہاتھ بھائی پر رکھا، اور چلائی کہ اری رحمت جلدی سے روشنی لا۔ شمع مامور ہوگئی۔ میرے بچے ڈر رہے ہیں۔ رحمت، چراغ دالان میں سے چراغ اٹھا درے میں سے ہماری طرف جو لپکی، ہوا کے جھونکے سے وہ چراغ بھی بجھ گیا۔ اتنے میں باوا جان مردنگ سیدھا کر باہر ہوئے۔ میں نے اور بھائی نے جو باہر نکلنا چاہا، ددا سوبھا نے روکا کہ اے ہے، ٹھنڈ ہے ہوا چل رہی ہے۔ پسینے میں لگ جائے گی تو دشمنوں کو نزلہ زکام ہوجائے گا۔ لیکن ہم کس کی سنتے فوراً چادرے میں سے نکل پڑے۔ ددا نے ایک ہاتھ سے تو مجھ پر دولائی ڈالی، اور دوسرے ہاتھ سے بھائی کو پکڑ جلدی سے نیمہ آستین پہنا، از بکی کن ٹوپ اوڑھا دیا۔ اب ہم جلدی سے باہر آئے۔ پیچھے پیچھے ددا سوبھا۔ اتنے میں ظہورن نے کنڈی کھولی، کیا دیکھتی ہوں، کہ خالہ اماں ننگے پیر ننگے سر، دوپٹہ کندھے پر پڑا پلو زمین پر جھاڑو دیتے ہوئے، شیدو باریدارنی کے کندھوں کا سہارا لیے لڑکھڑاتی گرتی پڑتی چلی آتی ہیں۔ اماں جان دیکھ بے قرار ہوگئیں۔ کہ اے ہے میری آپا! کہہ کے جو لپکیں، گھبراہٹ میں سیڑھیوں کا خیال نہ رہا۔ صحن چبوترے سے کھڑے قد اوندھے منہ گریں۔ ظہورن، رحمت اٹھانے لپکیں، خال اماں تو پہلے ہی اوسان باختہ ہورہی تھیں۔ انھیں غش آگیا۔ وہ تو وہ بھی گرتیں، لیکن شیدو نے سنبھالا۔ اتنے میں بچھی، مغل، رحمت، ظہورن سب اکٹھی ہوگئیں۔ بہن کی آگ میں اماں جان کو بھی گرنے کا ذرا خیال نہ ہوا، فوراً کھڑی ہو خالہ جان سے لپٹ گئیں اور انھیں کسی عنوان ہوش نہ آئے، اماں جان لگیں کھڑی اور پڑی پیٹنے کہ اری میری بہن! اری میری ماجائی! اچھی صاحب محل! کچھ منہ سے تو بولو، للہ آنکھیں کھولو! میں تمھارے قربان، ارے تم کھڑی کیا منہ تکتی ہو۔ اچھی صاحب! تم ہی بتاؤ انھیں کیا ہوگیا۔ میں اور بھائی دھارم دھار روئیں۔ باوا جان بہتیرا سمجھائیں کہ کوئی بات نہیں ہے۔ کمزوری سے غش آگیا ہے بیگم تم نہ گھبراؤ، بچے دلگیر ہوتے ہیں۔ ددا چلائی کہ باہر خنکی ہے۔ اندر دالان میں سب کیوں نہیں چلتے، غرض ہاتھوں ہاتھ خالہ اماں کو اٹھا کر

اندر لائے، چھپر کھٹ میں لٹایا، روشنی کے لیے غل مچایا، گھر بھر میں کوئی چراغ روشن نہیں۔ اب جیسی دیا سلائی تو پہلے تھی نہیں، پتلی پتلی تیلیوں کے سرے پر گندھک لگی ہوتی تھی اور حلال خور پیسے کی ایک گڈی دیتے تھے۔ وہ آگ سے سلگائی جاتی تھی پھر اس سے چراغ روشن کرتے تھے۔ باورچی خانے میں خود اندھیرا، چولھا روشن نہیں۔ غرض ظہورن باہر پیر بخش حقے کے لیے آگ دبائے رکھتا تھا اس سے آگ لائی اور شمع روشن کی۔ خالہ اماں کو لخلخہ سُنگھایا، گلاب اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے۔ خدا خدا کر کے انھوں نے ذرا آنکھیں کھولیں تو سب کی جان میں جان آئی، گلاب کی خوشبو سے مجھ کو چھینکیں آئیں اور تھوڑی دیر میں نزلے کی تحریک سی شروع ہوگئی۔ اماں جان نے پھر خالہ جان سے پوچھا کہ اچھی بیگم! رات کو قلعے سے کیسے نکل آئیں۔ انھوں نے جواب نہ دیا، آنکھوں میں آنسو بھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ اماں جان جھٹ سے چمٹ گئیں، ماتھے اور گالوں کی چٹ چٹ بلیّاں لیں، اور کہا کہ بیگا آخر ہے کیا؟ تم بولتی کیوں نہیں؟ لیکن خالہ اماں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور آنسو اُن کی آنکھوں سے بہہ کر کے تکیے پر گرے۔ تب بے قرار ہو کر اماں جان بھی رونے لگیں۔ باوا جان نے بہتیرا سمجھایا کہ بیگم تم خبطن تو نہیں ہوگئیں، کیوں بہن کی جان کے پیچھے پڑی ہو۔ وہ سخت کمزور ہو رہی ہیں۔ اس وقت ان سے اس قسم کے سوال مت کرو۔ شیدو، تو بتا کیا بات ہے، قلعے میں تو خیر ہے۔ شیدو نے کہا کہ سرکار خیر کیسی اور کیسا قلعہ وہ قلعے والا ہی نہ رہا۔ اللہ اس کا نگہبان اسے پیروں کی امان اُس کا برسرِ میدان الٰہی جہاں ہو علی کی پناہ میں، جہاں پناہ تو لال حویلی میں جمی جم ہیں۔ عجب تریوں کی بھگڑ مچی ہوئی ہے، کوئی کسی کو نہیں پوچھتا کہ تمھارے منہ میں گے دانت ہیں۔ جدھر جس کا منہ اٹھتا ہے بھاگا چلا جاتا ہے، میں سرکار کا ہاتھ پکڑے کے بھاگی۔ ان میں بھلا چلنے کی کہاں سکت، خانم کے بازار میں میری ایک جوتی ہاتھ سے گر گئی۔ میں جو اٹھانے جھکی نگوڑی دوسری بھی نکل گئی، اسے چھوڑ میں سنبھلی کہ کہیں ایسا نہ ہو جو روندن میں آجاؤں۔ خاص بازار میں جب آئی تو کیا دیکھتی ہوں، کہ حضرت ہرے بھرے صاحب کے آستانے سے ذرا ادھر کوئی چیز پڑی ہے۔ میں اور سرکار کانپ گئیں، کوئی عورت تھی، اوندھی پڑی ہوئی، ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ، پائنچے سڑک پر چھوٹے ہوئے، ایک ہاتھ سینے کے نیچے، ایک درگاہ کی طرف پھیلا ہوا، چمپا کی مباف دار چٹیا، نیچے دبے ہوئے ہاتھ کی طرف پڑی ہوئی، دوپٹہ کوئی دس قدم

پیچھے پڑا ہوا، محرم کچھ کچھ پھٹی ہوئی، میں ڈر کے پیچھے ہٹی، سرکار بھی کانپ گئیں، لیکن خود تو ہٹ گئیں اور مجھے ڈانٹا کہ دیدن کم بخت دیکھ تو سہی کون ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سیدھا کیا اور غور سے جو دیکھا تو لرز گئی، نیچے دبے ہوئے ہاتھ میں کٹاری تھی۔ میں نے سرکار کو آواز دی پہچانا، تو شہزادہ عالمیاں مرزا فخرو کی محل نواب نیازی بیگم ممتاز محل تھیں، کسی نامراد ناشاد ناس گئے، نگوڑے نے کانوں سے گوشوارے نوچ لیے تھے اور کان لہولہان ہو رہے تھے۔ کچھ شہیدوں اور مردوؤں کی لاشیں پڑی ہیں۔ اس وقت تو سرکار بھی بڑی مرد بن گئیں اور انھیں اٹھا کر جما مسجد کی سیڑھیوں پر لاکر ڈال دیا۔ پاس بیٹھے تھے کہ نگوڑے فوجیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، میں سمجھی کہ خدائی خوار آ گئے تو اپنی میا بھینوں کی آبروریزی کریں گے۔ سرکار سے کہا کہ بھاگیے، وہ آئے، اور ہم بھاگے۔ یہ جو بے تحاشا بھاگیں تھوڑی دور جا کر تھی نالی اس میں جا پڑیں۔ اس وقت سے کچھ بے اوسان سی ہوگئی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے یہاں تک لائی ہوں۔ باوا جان نے سن کر سر پکڑ لیا۔ اماں جان بولیں کہ اچھی دیکھنا یہ یہ شہر پر گزر گئی اور تم نے گھر میں آ کر نہ کہا۔ میں گولے دیکھتی اور غل غپاڑے کی آوازیں سن کر تم سے پوچھتی بھی تو یونہی واجبی سا جواب دیتے۔ بات اصل یہ تھی کہ باوا جان کبھی کوئی ایسا ذکر گھر میں نہ کیا کرتے تھے، جس سے ہم ہولیں اور خوف کھائیں۔ اس کا اُن کو بڑا خیال تھا۔ باوا جان نے کہا کہ بی ہولن نہ کہنے پر تو تمھارے ہولوں کا یہ حال تھا کہ نیند تم پر حرام تھی۔ اور جو میں کہتا تو تم زندہ رہ چکی تھیں۔ باوا جان نے جو ممتاز محل کا واقعہ سنا۔ پیر میں جوتی ڈال شیخ منگو کے چھتے کی طرف سے نکل جامع مسجد انھیں لینے دوڑے چلے گئے۔ اماں جان انھیں روکنے کے لیے ہائیں ہائیں کرتی اٹھیں۔ لیکن کچھ سوچ کے وہ بھی چپ ہوگئیں۔ آدھ گھنٹے پون گھنٹے میں باوا جان لوٹے اور کہا کہ افسوس میں نے آس پاس سب طرف ڈھونڈ لیا لیکن کہیں پتا نہ چلا، مجبور لوٹ آیا، اچھا لو بس گھر خالی کرو۔ اب یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ اماں جان نے کہا کہ واہ تم بھی خوب ہو، رات کو کہاں نکلیں۔ بچوں کا ساتھ، نہ رتھ بان، آپا کا یہ حال، نہ ناشتہ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان اُٹھ دوڑی بازار، دل میں ایسی آئی، بھلا یہ بھی کوئی نکلنے کا وقت ہے، نہ مجھ سے چلا جائے گا۔ بھلا مجھ میں اتنا کہاں دم، چبوترے سے گری گھٹنوں کا چورا ہوگیا۔ وہ تو بیگا کی پریشانی میں مجھے چوٹ معلوم نہ ہوئی اب جو خیال کیا تو گھٹنوں میں وہ جھل جھلاہٹ ہے کہ آگ پڑی لگ

رہی ہے۔ باواجان بولے کہ انگریزی فوج جامع مسجد کے قریب آ گئی ہے اور اب دم کے دم میں اِدھر آنے والی ہے۔ خدا معلوم کیا غضب توڑے، محلّہ اڑا دے، کیا کرے کیا نہ کرے، تم دیر نہ کرو بس فوراً کھڑی ہو جاؤ، ورنہ گورے نہ مجھے چھوڑیں گے اور نہ تمھارے لڑکے کو اور تم سب کی ہمارے بعد کیا درگت بنائیں، اس کی خبر نہیں۔ جلدی کرو، دیر نہ لگاؤ۔ اماں جان گھبرائیں اور کہا تو اچھی بیگا کا کیا کروں۔ خالہ اماں نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ میرا غم نہ کھاؤ اور ذرا فکر نہ کرو۔ تم اپنی خبر لو، میں بالکل اچھی ہوں۔ غرض جوں توں کر کے سب اٹھے۔ اماں جان نے چھوٹا خوانچہ ساتھ لیا، سارا گھر نکل چل کھڑا ہوا، خالہ اماں کو سہارا دیتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ کالی مسجد کی طرف سے ہوتے ہوئے فصیلوں فصیلوں اجمیری دروازے پہنچے، یہاں وہ بھیڑ کہ الحفیظ الامان، میں تجھ پر تو مجھ پر، تل دھرنے کو جگہ نہیں، پھاٹک کے کیواڑ بند، جائیں تو کدھر جائیں اور نکلیں تو کہاں سے نکلیں۔ اللہ کے قربان جائے، اتنے میں کنہیا لال جو انگریزوں کا مخبر تھا نظر پڑا۔ باواجان نے اس کا ایک مقدمہ تھا، اس میں سفارش کی تھی اور اسے بچوا دیا تھا۔ اس کا وہ احسان مانتا تھا۔ اسے بلایا اور پریشانی کا اظہار کیا۔ اس نے اطمینان دلایا۔ اور باواجان سے کہا کہ عورتوں سے کہہ دیجیے کہ گھبرائیں نہیں، اور اگر یہ تمام آدمی بھاگیں تو یہ نہ بھاگیں۔ باواجان نے ہم سب کو سمجھا دیا کہ دیکھو تمام آدمی اگر بھاگیں تو تم سب ایک جگہ کھڑے رہنا اور بھاگنا مت۔ اتنے میں نگوڑا کنہیالال چلایا۔ کہ ارے دیکھو! وہ گورے آئے۔ بس یہ کہنا تھا کہ وہ بھگدڑ پڑی کہ سڑک پر سوائے جوتیوں، ٹوپیوں، صافوں، دوپٹوں اور گری پڑی عورتوں، بڈھوں اور اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے بچوں کے اور کچھ نہ رہا۔ خالہ اماں اور کم بخت شیدو یہ دونوں بھی اس بھاگڑ میں جانے کدھر کی کدھر نکل گئیں اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔ کنہیالال نے کہا کہ جلدی کرو اور دروازے پر چلو۔ اس نے کچھ دربانوں سے کہا۔ باواجان نے انگشتری اُتار دربانوں کے جمعدار کو دی۔ اس نے کھڑکی کھولی اور ہم سب نکل گئے۔ اب اماں جان نے جو خالہ اماں کو نہ دیکھا، بہت روئیں پیٹیں اور کہا کہ میں اب آگے جا کے کیا کروں گی۔ وہیں نیم کے نیچے گڑ گنج کے قریب بیٹھ گئیں۔ غرض بڑی مشکلوں سے سمجھا بجھا کر انھیں اٹھایا۔ پو پھٹے تک پہاڑ گنج پہنچے۔ وہاں ایک کٹھیک جو ہمارے ہاں کا خس خانہ بنایا کرتا تھا، رہتا تھا۔ باوا جان نے اس کا کوٹھا کرائے پر لیا، اور ہم سب وہاں ٹھہرے۔ تیسرے دن کنہیالال مخبر آیا۔

باوا جان اس سے ملے اور یہ طے پایا کہ اس کی مدد سے ہماری چھوکریاں شہر میں جائیں اور زیور لائیں۔ اس کا چوتھائی کنہیالال کا حصہ۔ غرض رحمت، مغل اور ظہورن دوپہر کو شہر کی طرف روانہ ہوئیں۔ خاکیوں کا پہرہ پھاٹک پر تھا، تینوں تھیں جوان، انھوں نے انھیں چھیڑا۔ انھوں نے خوشامد درآمد کر کے اپنا پیچھا چھڑایا، کوئی دو گھڑی دن رہے تک گھر پہنچیں۔ اُن کے پیروں کی آہٹ سن ہمسائی نے انھیں آواز دی، یہ ڈر گئیں، اور کہا کہ بی تم کیسے یہاں، تم نہیں نکلیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو اللہ پر بھروسہ کرے یہیں رہے، ہاں کوئی مردوا ہمارے ہاں ہے نہیں، جان جوانیں ہم نہیں، جو کسی بات کا ڈر ہو۔ فوجی آتے ہیں چاول، گھی، مرغ لوٹ مار کر لاتے ہیں اور ہمیں دے جاتے ہیں۔ ہم پکا پکا بریانیاں انھیں بھی کھلاتے ہیں اور آپ بھی کھاتے ہیں۔ جب یہ تینوں اندر گھر میں داخل ہوئیں تو میری روپی کُتیا اور بختاور بندریا انھیں دیکھ بلبلا گئیں۔ انھوں نے پیار کیا، کبوتر جدا پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اُن کا جال کھولا، مرغیوں کو ڈربے سے الگ نکالا۔ رات ہوئی اور خوب اندھیرا ہو گیا تو انھوں نے پردے دالان کے چھوڑے، چراغ روشن کیا، پرانی توشکیں، بالا پوش نکالے۔ باوا جان نے گہنا، جواہر اور قیمتی چیزیں توشی خانے (توشک خانے) سے نکال کر بغیر کسی کو خبر کیے مختلف جگہ کے چونچوں میں چھپا دیا تھا۔ گہنا اور جواہر اُپلوں والی کوٹھری کے چونچے میں رکھ دیا تھا، اُس کا پتا اُن چھوکریوں کو بتایا اور اچھی طرح سمجھا دیا۔ انھوں نے کرسیاں ہٹا کر سل کھسکائی اور زیور نکال لائیں اور اسے ترکیب کے ساتھ روئٹر میں رکھا۔ اور موٹے موٹے تاگے جن کو مٹی میں مل کر میلا کر دیا تھا، اس سے اس پر نگندے ڈالے۔ رات بھر بے چاری بیٹھی یہ کرتی رہیں اور دوسرے دن دوپہر تک لوٹ کر نہ آئیں۔ باوجان کو خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کنہیالال نے اُن پر تشدد کیا ہو اور تمام زیور اُن سے لے لیا ہو۔ یا خود وہ مل گئی ہوں یا اپنے آپ لے کر کسی خاکی کے ساتھ چل دی ہوں۔ لیکن پھر جب اُن کی وفاداری کا خیال آتا تو پہلے خیال کی تردید کرتا۔ کیوں کہ وہ اگر لونڈیاں تھیں تو قلعے تک تھیں۔ شہر میں آزاد اور اپنے کار مختار، جہاں چاہتی چل جاتیں۔ لیکن انھوں نے ہماری چوکھٹ نہ چھوڑی، آخر ددا کو بھیجا کہ جا ددا تو دیکھ کے آ کہ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان۔ آخر کدھر اجڑ گئیں۔ بیچاری دوا فوراً روانہ ہوئی۔ بڑی منتوں سماجتوں کے بعد پہرے داروں نے اندر گھسنے دیا۔ یہ گھر گئی وہاں دیکھا کہ وہ بس چلنے ہی کو کھڑی ہیں۔ دوا

نے بہت کچھ بُرا بھلا کہا۔ وہ سب میری کتیا اور بندریا اور ہریالی مٹھن کا پنجرا لے کر چلیں۔ رستے میں ایک اناج کی کوٹھی لُٹ رہی تھی۔ بندریا تو نگوڑی کئی دن کی بھوکی تھی بلبلا کر اناج پر گری، بھنور کلی ٹوٹی اور چھٹ گئی، میری کتیا اور مٹھن ایک گورے نے سنگین دکھا کر چھین لی، بھائی کی مینا فاقوں ہی کے مارے مرگئی تھی، مرغیاں فوجیوں نے کھائی ہوں گی۔ تینوں چھوکریاں اور ددا سوبھا ڈرتے لرزتے چلے آتے تھے، ددا نے کہا کہ اندھیوں ڈریں تو سارا بھید کھلا، یہیں کمپنی کی فوج مار دے گی۔ اللہ پر بھروسہ کرو اور جی کڑا کر کے بڑھو، نمک حلالی اور شرافت دکھانے کا یہی وقت ہے۔ جھٹ پٹے کے وقت تک دروازے پر آ پہنچیں۔ پہرے داروں نے ٹوکا۔ چھوکریاں مومی چھینٹ کے دو دو کلی کے پاجامے پہنے تھیں۔ ددا میرا سیدھی موری کا پاجامہ اور تھکارا کُرتہ پہنے تھی۔ ہنسنے کی کوئی بات نہیں۔ اس زمانے میں صرف رانڈ بیوائیں ہی کُرتے پہنا کرتی تھیں اور قلعے میں تو نام بھی کرتے کا لینا منحوس سمجھتے تھے، کیوں کہ کرتہ رنڈ سالے میں دیا جاتا تھا۔ آج کل کا سا رواج تھوڑی تھا، کہ نگوڑی بیاہیاں، کنواریاں، جوان بڑھیاں ایک ہی رنگ ایک ہی وضع میں نظر آتی ہیں۔ کوئی تمیز ہی نہیں کہ کون رانڈ ہے اور کون سہاگن۔ شاندار تہ پوشیاں اجاڑ نگوڑی بندوڑوں کی وضع کے تین کلی کے بالشت بالشت بھر کے پائنچے اڑا، مسیح کی چماریاں بن مرغی کے چوزوں کی طرح اچھل اچھل باغوں میں جالی کے بلّوں اور گیندوں سے کھیلتی ہیں۔ پوچھو نگوڑی کالی چماریو، تم نے جو فرنگیوں کی ریت اختیار کی تو کے رکعت کا ثواب، کوّا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ خیر بیٹا! ددا تھی بڑی دلیر اور منچلی، دل گردے کی۔ حرمت اماں جان کی مندری تہ پوشی پہنے تھی، اور پائنچے آگے اڑسے ہوئی تھی۔ ایک پہرے دار نے آگے بڑھ کر جھاڑا لینا چاہا۔ رکھ کے جو نگوڑی کے پائنچوں پر ہاتھ مارا تو پائنچے نیچے آرہے۔ ددا لپک کر آگے بڑھی، بغل میں توشک دبائے تھی۔ ایک نے سنگین اُس کی طرف کی، اس نے پلٹ اسے سلام کیا اور تھوڑی میں ہاتھ ڈال دیا، لگی خوشامد کرنے کہ ماں واری جاؤں، ہمارا ننھا ننھا سا بابا ہے، جاڑے کا زمانہ ہے، سردی میں اکڑ کر مرجائے گا۔ یہ پُرانے لحاف رضائیاں ہیں، لیے جاتے ہیں اس میں دبک رہیں گے، کمپنی کے راج کو دعا دیں گے۔ بڈھے مصیبت زدہ کئی دن کے بھوکے ہیں، پیغمبری وقت پڑا ہے۔ یہ کنواریاں بالیاں ہیں ان کا ہاتھ لگانا مہا پاپ ہے۔ بے چاری رحمت نے ڈر کے مارے وہیں کھڑے کھڑے

چُھل چُھل کر دی۔ ظہورن اور مغل بالا پوش اوڑھے تھیں۔ ایک کو ایک مارے ڈر کے لپٹ گئیں اور بیری کی طرح تھرتھر کانپتی تھیں۔ کچھ ایسا اُن کا قابل رحم حال ہوا کہ پہرے داروں کو جن میں خاکی بھی تھے، ترس آ گیا اور کہہ سن کر بغیر جھاڑا لیے اور چھوئے چھوڑ دیا۔ پھاٹک سے نکل یہ جو پتا توڑ بھاگی ہیں تو انھوں نے منہ موڑ کر نہ دیکھا۔ اور ہانپتی کانپتی اذانوں کے بعد پہنچیں۔ باوا جان دیکھ خوش ہوگئے، میں بھی ددا کو دیکھ نہال نہال ہوگئی۔ باہر کنہیا لال بیٹھا تھا۔ باواجان نے اپنے ایمان سے حسبِ وعدہ چوتھائی حصہ زیور کا، جا، اس کے حوالے کیا اور اس نے بھی بغیر کسی پس و پیش کے سلام کر کے خوش ہو لے لیا۔ دوسرے روز کٹھیک نے ایک بہلی کا انتظام کر دیا۔ اماں جان اس کے اس سلوک سے اس قدر خوش ہوئیں، اسے اپنا منہ بولا بھائی بنایا۔ چلتے وقت چار اشرفیاں اسے دیں اور ایک چمپا کلی اور رد راج کی جوڑی اس کی بیوی کو دی۔ افسوس خالہ اماں کا کچھ پتا نہ چلا۔ جس سے اماں جان بہت اداس رہتی تھیں اور رویا کرتی تھیں۔ غرض ہم سب ٹھس ٹھسا کر بہلی میں بیٹھے۔ باواجان پیدل ساتھ ہوئے۔ ظہورن جوتیاں ہاتھ میں لیے بہلی کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی۔ ایک خلقِ خدا تھی کہ اسی طرح ویران طہران پھر رہی تھی۔ ارادہ تھا کہ سلطان جی جائیں، ہمایوں کے مقبرے میں بادشاہ ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ وہاں گرفتاریاں ہو رہی ہیں اور پھانسیاں لگ رہی ہیں۔ غرض مرتے گرتے، وظیفے پڑھتے، حصار باندھتے قطب صاحب پہنچے، اولیاء مسجد میں اُترے، یہاں ایک خلقت کا ہجوم، لیکن تھے تمام شریف، بڑے گھرانوں کے، کچھ باواجان کے بھی شناسا نکل آئے، غرض مرد سب کے ایک طرف اور عورتیں ایک طرف پڑ رہیں، پردہ وردہ کس کا۔ صبح بھائی اور لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ گوروں کا توپ خانہ آیا ہے۔ جتنے مرد تھے گھبرا کر پولوں اور بھُس کے ڈھیروں میں گھس گئے اور بھائی بوہلا کے ایک بیوی بے چاری لیٹی تھیں اُن کے پائنچے میں گھس گئے، وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں، پوچھا، ارے بیٹا کیا ہے؟ تو کون ہے؟ بھائی نے کہا کہ خالہ گورے ہیں۔ انھوں نے بس اپنے پائنچے ان پر اچھی طرح ڈال دیے اور چھپا لیا۔ قطب صاحب سے الور جانے کا ارادہ تھا، لیکن سفر بڑا لمبا تھا۔ دن کو خوب دھوپ، راتوں کو اوس، آدمی بے چارے پُرانی شکستہ گوروں میں، قبروں کے تعویذوں، مسجدوں اور مقبروں کی سلوں پر راتیں اکڑ سکڑ کر کاٹیں۔ غرض ہم پھر شہر کی طرف پلٹے۔ شاہ مرداں آئے، دو

روپے دے کے ایک گنوار سے تھوڑی پھوئیں کچریاں لیں۔ اس بھوک میں انھوں نے کیا مزا دیا ہے، کھا، پانی پی، پیٹ کی آگ بجھا، اللہ کو یاد کر وہیں پڑ رہے۔ وہاں سنا کہ پانی پت میں امن امان ہے۔ بہت آدمی وہیں جا رہے ہیں۔ ہم سب نے بھی اِدھر کی ٹھانی، راستے کی کھکیڑیں جھیلتے، منزلیں مارتے چلے جاتے تھے۔ راستے میں رات کے وقت دو مشعلیں اپنے آپ جلتی اور چلتی نظر آتی تھیں۔ ددا اسے ہم پوچھتے ددا یہ کیا ہے۔ دوا وہ نیلے پیلے دیدے نکالتی کہ کچھ ہی ہو ووئی تمھیں کیا۔ خبردار ادھر مت دیکھو۔ اور ہمارے منہ پر چادرہ ڈال دیتی اور آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر ہم پر دم کرتی۔ رات بھر ہمیں اپنی چھاتی سے لگائے پکھوے میں دبائے لیٹی جاگا کرتی۔ خدا خدا کر کے پانی پت پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے، زیور بیچ بیچ کر خوب کھائے، پھر وہاں سے اکتا کے دلّی کی ٹھانی، دل نہ مانا، چل کھڑے ہوئے۔ مرتے گرتے عرب سرائے آئے۔ وہاں سے سلطان جی میں ایک مکان اماں جان کی جان پہچان خادمنی تھیں، اُن کا لے کر رہنے لگے۔ صدر میں کمپنی کی طرف سے آٹے دال کی کچھ دکانیں کھل گئی تھیں۔ عورتوں کو اجازت تھی وہ جا کر خرید لاتیں۔ آٹھ روپے تولہ سونا لے کر روپے کا پان سیر کے بھاؤ آٹا دیتے تھے۔ اماں جان جب ضرورت ہوتی سروتے سے کڑا کترتیں، تولے دو تولے کا ٹکڑا لیا بکوا دیا اور ضرورتیں پوری کیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کئی کئی وقت فاقے سے گزر جاتے۔ لیکن ایمان کی یہ ہے ددا ایک آدھ ٹکڑا ہمارے لیے تو لگائے ہی رکھتی اور ہمیں کبھی بھوکا نہ رہنے دیا۔ جب ہم یہ دیکھتے کہ اور تو سب بھوکے ہیں اور ہم کھا رہے ہیں تو جی کڑھتا اور ہم بھی کھانے سے انکار کرتے تو قسمیں دے دے کر اور پچکار پچکار کر بے چاری کھلاتی تھی۔ اماں جان کا یہ تھا کہ جب تک کھانا نہ ملتا تو اُن کو پان کی پروا نہ ہوتی تھی اور جہاں کھانا کھایا اور زردے کی طلب نے انھیں بے چین کیا، بھلا جنگل بیابان میں پان کہاں۔ اکثر ہڑک بجھانے کو لسلسے کا پتا کتھے کے ساتھ کھایا ہے۔ منہ تو خاصا لال ہو جاتا تھا۔ یہ نئی بات تھی۔ گیہوں اور چنے کے پیڑ ہم نے شہر سے نکلنے ہی کے بعد دیکھے۔ پہلے میں یہ جانتی تھی کہ بڑے اونچے اونچے درخت ہوتے ہوں گے اور ان کے باغ کے باغ کھڑے ہوں گے اور آدمی ان کی ٹہنیاں توڑ لاتے ہیں اور بیچ ڈالتے ہیں۔ لیکن گنے کے کھیت میں قلعے میں سے ریتی پر دیکھ چکی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے ان کے بھی درخت جانا کرتی تھی اور جانتی تھی یہ ان درختوں کی کٹی ہوئی شاخیں

ہیں۔ گیہوں کی پید نہ سمجھ سکتی کہ الٰہی یہ تھیلیوں میں بھرے ہوتے ہیں یا کسی چیز کا بیج ہیں۔ ایک اور چیز دیکھی جس کو باہر والے گنوار بونگی کہتے تھے۔ یہ پوتوں کی ایک گنبد نما سی بنی ہوئی چیز تھی۔ اس میں بھُس یا اناج، معلوم نہیں کیا چیز بھری رہتی ہے۔ اور بارش وغیرہ کے خوف سے اس چیز پر پھونس کی بونگی بنا دیتے ہیں۔ پھونس بڑا چمکتا ہوا، سنہری سنہری زرد رنگ کا تھا۔ اور ہمیں یہ چیزیں بڑی انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔ مدتوں سلطان جی میں پڑے رہے۔ ایک مرتبہ بھائی کو اللہ نے بچایا۔ ایک کالا ناگ نکل آیا تھا۔ اور بھائی بال بال بچ گئے۔ ایک دفعہ ہم سب باؤلی کے اوپر گنبد میں بیٹھے تھے کہ ایکا ایکی ایک سل آن پڑی اور ہم دبتے دبتے بچ گئے۔ اماں جان کی ہر وقت ہولوں میں جان جاتی تھی۔ پھر سنا کہ شہر میں عورتوں کو جانے کی اجازت ہوگئی ہے۔ رحمت تو گئی نہیں، ہاں میری ددا اور مغل گئیں۔ گھر میں نہ کیواڑ تھے نہ پردے، حتی کہ ڈیوڑھی کی چوکھٹ تک نگوڑے اکھیڑ کر لے گئے تھے۔ حسین بخش کا جہاں اب مدرسہ اور مسجد ہے وہاں ایک انگریز کوئی فوجی افسر ہوگا، ٹھہرا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں کے پردے وہاں پڑے ہوئے تھے اور باوا جان کا کتب خانہ اس کے حمام گرم کرنے کے کام آیا۔ ہزاروں قلمی کتابیں تھیں۔ پوری صحنچی کے طاق اور مچان کتابوں سے اٹا اٹ بھرے ہوئے تھے۔ ساری ہمارے ہاں کی انگنائی کی کھدنی ہو چکی تھی۔ اندر دالان کوٹھریاں جا بجا سے کھدی ہوئی پڑی تھیں۔ نہ چمن رہا تھا نہ وہ کیاریاں، میرے لگائے پھل پھول سب یونہی برباد ہو گئے۔ حوض، نہر اور فوارے سب کھد کے کھندانے ہو گئے تھے۔ ہاں چھوٹے حمام کے پاس بھائی نے جو میرے لیے مہندی کا درخت لگایا تھا بس وہ کھڑا رہ گیا۔ غرض جتنا سامان باوا جان چوبچوں میں چھپا گئے تھے اس میں سے ایک تنکا نہ رہا۔ البتہ اوپر دو چھتی میں اونچے پر ایک کوٹھی تھی اس میں ددا نے خود ہی کچھ بھاری جوڑے، تانبے اور چینی کے برتن ڈال کر حصار باندھ دیا تھا۔ اس حصار کی برکت سے وہ سب بچ رہے۔ کسی کو اس کا خیال ہی نہ آیا ورنہ وہ کاہے کو رہتے، دوسرے کوٹھی تھی بھی کچھ اس طرح ایک طرف الگ کو کہ کسی کا خیال بھی ادھر نہ جا سکتا تھا۔ گھر میں دیواروں پر ایک کھونٹی ایک کیل تک نہ رہی تھی۔ ددا آئی اور یہ رام کہانی سنائی۔ اماں جان نے کہا کہ بی احمق تم وہ چیزیں جو رہ گئی تھیں انھیں کیوں چھوڑ آئیں جو بندھ جائے سو ہی موتی۔ ددا تڑخ کر بولی، ووئی اسے کیا آگ لگانی ہے۔ کہاں لاتی اور کون ڈھوتا۔ جہاں وہ سب گیا، اس کے سر

صدقہ یہ بھی جائے۔ کے فاقے کاٹنے جوگا تھا جو لے آتی۔ غرض دوسرے دن کچھ لہر اٹھی۔ شہر پہنچیں۔ دو قابیں سچی چینی کی بڑی خوب صورت اماں جان کے جہیز کی تھیں انھیں لے آئیں۔ آئی جو شامت تو چلا چل، کہاں چلیں بیچنے کہ قلعے میں، بغل میں مار، چادرے سے اچھی طرح ڈھانک اندر معلوم نہیں کس طرح گھس گئیں۔ دیکھو دیدہ کتنا موٹا تھا۔ وہاں کچھ انگریزنیں پھر رہی تھیں انھیں سلام کیا دور سے قابیں کھول دکھائیں وہ لپک کر آئیں۔ قابیں ددا سے لے لیں۔ ددا نے کُرتہ اٹھا، سوکھا سوکھا پیٹ، سانس اوپر کو کھینچ، پسلیوں سے لگا، گنگلوں کا سا منہ بنا دام مانگے۔ وہ سب بڑے زور سے قہقہہ مار ہنسیں۔ ددا نگوڑی سمجھی انچھر چل گیا۔ یہ دم میں آگئیں منہ مانگے دام ملیں گے۔ پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا کہ ہمارا بابا لوگ بڑا بھوکا ہے۔ وہ آپس میں معلوم نہیں کیا گٹ پٹ گٹ پٹ کرتی تھیں، ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ وہ قابیں لے چمپت ہوئیں، ددا پیچھے پیچھے دام مانگتی ہوئی۔ ایک کوٹھے پر وہ چڑھ گئیں، ددا نیچے زمین میں کھڑی رہی۔ وہ اپنی بولیوں میں معلوم نہیں کیا کیا کہتی تھیں اور آئیں سیڑھیوں پر سے ددا کے منہ پر تھوک جاتیں۔ ددا آنچل سے پونچھ لیتی اور گڑگڑائے جاتی، آخر جب تنگ آگئی تو چادرا سر سے اتار اور ہاتھ لے کر پھرانا اور چلانا شروع کیا کہ کمپنی صاحب کی دہائی ہے۔ کمپنی صاحب کی دہائی ہے۔ وہ بندی لٹ گئی۔ اتنے میں ایک لال منہ کا فرنگی خوں خوں کرتا آیا۔ ددا نگوڑی سمجھی میری پشتی لے گا۔ کہنے لگی دیکھو صاحب ہمارا مال چھین لیا۔ اس نے اُلٹا ددا ہی کو خوب ڈانٹا، کہا کہ بدمعاش عورت دریا گنج کے بنگلوں سے تم لوگ مال لوٹ لے گیا ہے۔ یہ سرکاری کاب ہے اور ہمرا لوگ کے پاس بیچنے آتا ہے۔ چاہے کہ ددا کچھ بولے کہ وہ گھگھیا کے دھم دھم کرتا کتا ساتھ لیے سیڑھیوں سے اُترنے لگا۔ اتنے میں ایک چپڑاسی بولا کہ بڑی بی تم دیوانی ہوئی ہو، تمھیں بھی کہیں موت رزق نہ تھا تو یہاں مرنے آئیں۔ بھاگ ورنہ صاحب کتا چھوڑ دیں گے۔ ددا یہ کہتی کہ مُردے چھوڑیں گے تیری اماں بھینا ؤں پر کتا۔ نامرد، بے غیرت کہیں کے، اور بُروں کی جان کو دعائیں دیتی ہوئی لیاں پیاں اپنا سا منہ لے کر چلی آئی۔ اور سارا قصہ ازل سے آخر تک اس مزے سے سنایا کہ میں مارے ہنسی کے لوٹی جاتی تھی۔ اماں جان چپ تھیں اور باوا جان کا رنگ سُرخ تھا، لیکن دم بخود تھے۔ ددا میری ہنسی سے خوش ہونے کی کوشش کرتی تھی لیکن رنج کا پلّہ بھاری تھا جو اسے خوش نہ ہونے دیتا تھا۔ غرض جو پونجی

چھوکریوں کے صدقے میں بچ رہی تھی، بیچ بیچ کھایا کیے۔ مدتوں باہر پڑے رہے۔ جب جائیدادیں واگذاشت ہوئیں، باوا جان کی بھی جائیداد چھٹی، شہر کی بندی کھلی۔ یہاں آئے تو مکانوں کا عجب حال پایا، گھر ڈھنڈار، کھنڈر در و دیوار، اینٹیں دات نکو سے، استرکاری ادھڑی، جابجا کی کھدنی نے زمین فرش تہ و بالا کردیے۔ دروازوں پر کیواڑ اور چھتوں میں قلابہ تک نہ رہا۔ رات بھر جنگلی کتے انگنائی میں کبڈی کھیلتے، اندر باہر سب برابر تھا۔ قلعہ اُجڑ گیا، روزگار والے بے روزگار ہوئے۔ اتنا پاس نہ رہا کہ نئے کیواڑ چوکھٹ چڑھواتے، پیٹ ہی کے لالے تھے۔ گزر کیوں کر ہوتی، گہنا تارتار کر کے خال سے (خالصہ) لگا۔ اب کھنڈلوں کی باری آئی۔ لیوے کون خریدے کون۔ سب ایک ہی چکر میں، بنیے مہاجن کمپنی کے طرف دار رہے۔ چپکے چپکے انگریزوں کو رسد پہنچاتے رہے۔ ان کی اب اوج موج ہوئی۔ رفتہ رفتہ سب جائیدادیں اُن کے قبضے میں چلی گئیں۔ اشرفیوں کی چیز کوڑیوں کی مولوں گئی۔ جائیدادوں کی اتنی جب قدر نہ تھی۔ تجارت نوابوں میں عیب، آمد پیسے کی رہی نہیں۔ خرچ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئے۔ ہر چیز پر آگ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اینٹیں بیچ بیچ کھایا کیے یا قرض لیا تو سود دریا کی روانی چڑھتا گیا۔ چار دن میں نالش ہو ہوا، جائیداد بنیے بقال کے نیگ لگی۔ گروی رکھی تو مول بیاج میں برابر ہوئی۔ غرض اس وقت سے ایسا جہاز تباہی میں آیا کہ پھر نہ نکلا اور اشراف پھر کبھی نہ پنپے سینکڑوں یونہی پاپڑ بیلتے مر گئے۔ اس مصیبت کی یاد ایسی تازہ ہے کہ کل کی بیتی معلوم ہوتی ہے۔ جو گزرنی تھی وہ تو گزر گئی البتہ رونے کو اس کی یاد رہ گئی۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، جنگِ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء کے شکریے کے ساتھ)

نثار احمد فاروقی

جنرل بخت خاں

افسوس یہ ہے کہ اس جواں مرد اور جاں باز مجاہد کے حالات گمنامی کی تاریکیوں میں چھپے ہوئے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اُس عہد کے مورخوں نے قصداً و عمداً اُسے نظر انداز کیا ہے۔ پھر بھی مختلف ماخذوں سے ہمیں جو کچھ دستیاب ہوتا ہے اُس سے ہم اتنا جان سکتے ہیں کہ بخت خاں کا اصلی نام محمد بخش تھا۔ اُس کا تعلق اودھ کے شاہی خاندان سے تھا۔ اس کا باپ عبداللہ خاں، جس نے شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی، موضع سلطان پور میں آباد ہوگیا تھا، وہیں بخت خاں پیدا ہوا اور تعلیم و تربیت کے بعد انگریزی سپاہ میں بھرتی ہوکر صوبے دار توپ خانہ کے عہدے تک پہنچا۔ اس نے جلال آباد کے معرکے میں اپنی توپوں کے ساتھ کام کیا تھا اور مسٹر سیل کے تحت جنگِ افغانستان میں بھی بڑی بے جگری سے لڑا تھا۔ یہی بخت خاں ہے جس نے اس بغاوت کو منظم کیا اور اُسے صحیح اسپرٹ دی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جو ردِ عمل ہوا اُس نے عام طور سے ہندوستانی مورخوں کا ذہن یہ بنادیا کہ اُن واقعات کو نسیاً منسیاً کردیا جائے یا بالقصد ہندوستانیوں کی تضحیک اور تذلیل پر کمر باندھ لی۔ سرسیّد کا بھی یہی خیال تھا کہ اس حادثے کو لوحِ دل سے یکسر فراموش کردیا جائے۔ ذکاء اللہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ بریلی میں تمام انتظام بخت خاں کے ہاتھوں میں تھا اور نہایت امن و امان قائم ہوگیا تھا لیکن پھر بھی اُسے 'کم بخت خاں' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بخت خاں نے ۳۱ مئی کو بریلی پر قبضہ کرلیا اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کے پوتے اور ذوالفقار کے بیٹے خان بہادر خاں کو مسند نشین کرکے خود وہاں کے انتظام میں مصروف

ہوا۔ انگریزوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا۔ جنرل سپالڈ کو ایک ہندوستانی سوار نے شتر خانے کے قریب بندوق سے مار ڈالا، انسائن مکر بھی مارا گیا، البرٹ الگزنڈر کمشنر بریلی، جو ریاست رام پور کا ایجنٹ بھی تھا، اور گتھری مجسٹریٹ ضلع، تقریباً تیس انگریز حاکموں کی جان بچا کر نینی تال بھاگ گئے۔ کچھ انگریز مولوی حامد حسن منصف کے مکان میں اور کچھ امان علی کی کوٹھی میں جا چھپے تھے۔ باغیوں کو خبر ملی تو دونوں جگہ حملہ کر کے انگریزوں کو نکال لائے اور امان علی کے تہ خانے کو جس میں یہ لوگ چھپے تھے جلا کر خاک کر دیا۔ باغیوں نے میگزین اور سرکاری خزانہ لوٹ لیا اور جیل خانے توڑ کر تمام قیدیوں کو رہا کر دیا، سرکاری دفتروں کو، حکام کی کوٹھیوں کو اور جیل خانے کو آگ لگا دی، شہر کو عیسائیوں کے وجود سے پاک کر دیا۔

جب بریلی کا انتظام بخت خاں کے ہاتھوں میں آ گیا تو نئی فوج کی بھرتی شروع ہوئی، توپیں ڈھالنے کے کارخانے قائم ہوئے، نئی تحصیلیں، تھانے اور کچہریاں قائم کی گئیں، اطراف سے بڑی تعداد میں لوگ آ کر ملازم ہونا شروع ہوئے، لیکن سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ روپیہ نہیں تھا، جس سے انتظام کرنے میں مدد ملتی۔ شہر کے سیٹھوں اور ساہوکاروں سے روپیہ وصول کرنا پڑتا تھا۔ نجم الغنی کا بیان ہے کہ ''مصر بیج ناتھ ساہوکار کنہیالال خزانچی کو بخت خاں نے پکڑ کر قید کیا، دونوں شخصوں نے ۵۲ ہزار روپے دے کر مخلصی پائی۔'' بریلی میں اُس وقت پچاس ہزار سے زائد باغی فوج اور تقریباً دو سو علمائے دین کا جمگھٹ ہوگیا تھا اور یہ بخت خاں کی قیادت کا طلسم تھا کہ جیسی عظیم الشان بغاوت روہیل کھنڈ میں ہوئی اور کہیں نہیں ہوسکی۔ بقول نجم الغنی ''اگر ریاست (رام پور) کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو روہیل کھنڈ میں انگریزوں کو کسی جگہ پناہ ملنا محال تھا۔'' بریلی جب انگریزوں سے خالی ہوگئی تو چین کی بانسری بجنے لگی۔ اس زمانے میں سینکڑوں بیاہ شادیاں اور دوسری تقریبات بڑے دھوم دھام سے ہوئیں اور کہیں بدامنی اور شورش کا نام ونشان نہ تھا، گرانی بھی کم ہوگئی اور ٹیکس بھی گھٹا دیے گئے۔

بریلی کی خبریں سن سن کر رام پور اور مرادآباد میں بھی جوش وخروش پیدا ہو رہا تھا۔ چناں چہ ۳؍جون کو رجمنٹ ۲۹ نے مرادآباد میں علمِ بغاوت بلند کر دیا اور نواب ممو خاں کو پلٹن کا افسر بنا کر وہاں خزانہ لوٹ لیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ادھر بخت خاں نے محسوس کیا کہ بریلی کا انتظام سب ٹھیک ہو چکا ہے۔ اب دہلی پہنچ کر شاہ ظفر کی امداد کرنی چاہیے اور راستے میں

رام پور، مراد آباد وغیرہ کو بھی انگریزوں کے وجود سے پاک کردیا جائے۔ چناں چہ بریلی سے چل کر ۹ر جون کو وہ رام پور پہنچا، گنیش گھاٹ کے نزدیک مع اپنی فوج کے مقیم ہوا اور نواب رام پور سے امداد کی درخواست کی مگر نواب انگریزوں سے ملا ہوا تھا وہ بخت خاں کو بہ لطائف الحیل ٹالتا رہا۔ باغی فوج کی طرف مولوی سرفراز علی نمائندہ تھے اور نواب سے گفتگو کررہے تھے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ ہمیں کچھ فوج انگریزوں سے لڑنے کے لیے دی جائے اور ولی عہد (نواب کلب علی خاں) کو بادشاہ کی ملازمت میں بخت خاں کے ساتھ بھیجیں۔ شہر کے لوگ بخت خاں سے آکر کہتے تھے کہ صرف نواب کی ذات سے انگریزوں کو پناہ مل رہی ہے تم اس کے اقتدار کو ختم کردو یہ اطلاع ملی تو نواب نے منادی کردی کہ ہمارا کوئی آدمی باغی فوج کے پاس نہ جانے پائے۔ اس حکم کے خلاف فوجیوں نے بخت خاں سے شکایت کی لیکن اس نے دیکھا کہ نواب منافقت کررہا ہے تو ۱۳ر جون کو مراد آباد کی طرف بڑھ گیا۔ ۱۴ر جون کو مراد آباد میں داخل ہوا۔ مراد آباد میں ممو خاں حاکم بنا بیٹھا تھا اور نواب دوندے خاں کا پوتا عباس علی خاں فوجوں کا سربراہ تھا، بخت خاں کے جاتے ہی وہاں کی شورش اور بدامنی دور ہوگئی اور سب انتظام ٹھیک ہوگیا۔ بخت خاں انگریزوں کے خلاف لڑ رہا تھا مگر اُن کی عورتوں اور بچوں کی نگہداشت کرتا تھا اور اس نے اپنی فوج کو تاکید کردی تھی کہ شہر والوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے، نہ اُن کا مال اسباب لوٹا جائے نہ انگریزوں کے معصوم بچوں اور عورتوں کو ہلاک کیا جائے۔ مراد آباد میں ایک کایستھ نے ڈپٹی مجسٹریٹ مسٹر کیجن اور اُن کے سالے کاربری اور ایک نوجوان لڑکے کو اپنے گھر میں چھپالیا تھا۔ باغیوں کو اس کی اطلاع ملی تو کایستھ کے گھر پر حملہ کیا اور نرپت گنج کے مغربی دروازے کے قریب مسجد کے سامنے اُن تینوں کو قتل کردیا۔ اُن کی عورتوں کو بخت خاں نے اپنی نگرانی میں لے لیا اور حفاظت کی۔

مراد آباد میں بخت خاں نے باربرداری کے واسطے مویشی طلب کیے، ممو خاں نے ٹالنا چاہا لیکن آخر اُس نے باربرداری کے لیے جانور اپنے پاس سے دیے۔ اس دن شہر میں لنگڑا گدھا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ۱۷ر جون تک بخت خاں مراد آباد میں رہا۔ جب وہاں سے رخصت ہوا تو مراد آباد کے بہت سے مجاہد اس کے ساتھ ہولیے۔ عباس علی خاں بھی بادشاہ کی ملازمت کے لیے چل پڑے اور رجمنٹ ۲۹ بھی جس نے سب سے پہلے مراد آباد میں بغاوت کی تھی، بخت خاں کی قیادت میں آگئی۔ ۱۸ر جون کو اس لشکر نے موضع رجب پور

میں قیام کیا جو امروہہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے، یہاں بادشاہ کی طرف سے ممو خاں اور اسد علی خاں کو مراد آباد کی سندِ حکومت لکھ کر دے دی گئی۔ ادھر عباس علی خاں بھی دہلی سے اپنے لیے خلعت اور سند مراد آباد کی حکومت کی حاصل کرلائے اور ممو خاں کے متوازی حکومت قائم کرلی، مگر یہ معاملہ آخرکار سمجھوتے پر ختم ہوگیا۔

جب بریلی، بدایوں، مراد آباد وغیرہ ہوتا ہوا بخت خاں ۲/جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچا ہے تو اُس کے ساتھ چودہ ہزار فوج تھی، کچھ توپیں تھیں اور کئی لاکھ روپیہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک 'جماعتِ مجاہدین' تھی جس میں سواسو سے زیادہ علمائے دین شامل تھے، ان کی قیادت مولوی سرفراز علی کررہے تھے۔ ان مجاہدوں میں مولوی لیاقت علی بھی تھے جو 'جہادِ حریت' کے مصنف ہیں۔ بخت خاں نے انھیں الٰہ آباد کا گورنر بنادیا تھا، شورش فرو ہونے کے بعد وہ بہ عبور دریائے شور قید کرکے بھیج دیے گئے، وہیں انتقال فرمایا۔ مولوی لیاقت علی کے علاوہ مولوی محمد رفیع، مولوی امام خاں، مولوی عبدالغفور خاں، مولوی محمد جعفر تھانیسری، جھنڈا شاہ وغیرہ شامل تھے۔ ان عالموں نے دہلی میں آکر نیا جوش و ولولہ پیدا کردیا۔ پہلے فقط جہاد کا نام ہی نام تھا بخت خاں کے حکم سے تمام دہلی کے علماء نے جامع مسجد میں جمع ہوکر جہاد کا فتویٰ لکھا جس پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے بھی دستخط تھے۔ مفتی آزردہ نے 'فتویٰ بالخیر' اس طرح لکھا کہ اس پر نقطے نہیں لگائے تھے۔ بعد میں جب انگریزوں نے مواخذہ کیا تو مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں نے تو فتویٰ بالجبر' لکھا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے دستخط کرنے پر مجبور کردیا تھا! اس پر انھیں بری کردیا گیا، مگر جائیداد بحقِ سرکار ضبط کرلی گئی۔

جہاد کا فتویٰ شائع کرانے کے بعد بخت خاں نے تمام افواج کو جمع کیا اور فرداً فرداً ستر اسّی ہزار فوجیوں سے حلف اٹھوایا کہ ہم سب آخر دم تک انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے اور میدان سے ہرگز منہ نہ موڑیں گے۔ پھر تحریری حلف نامہ مرزا مغل نے پڑھ کر سب کو سنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام فوجوں میں اور دہلی کے شہریوں میں مذہبی جوش و خروش بہت زیادہ پیدا ہوگیا جس کی ایسے نازک وقت میں بڑی ضرورت تھی۔

بخت خاں نے جب دہلی میں قدم رکھا ہے تو اُس کے آنے کی خبر سن کر بہادر شاہ نے اپنے خسر مرشد قلی خاں کو استقبال کے واسطے شاہدرے تک بھیجا تھا اور دربار میں بلاکر 'فرزند' کے

لقب سے سرفراز کیا، پھر 'لارڈ گورنر' کا خطاب دیا۔ خلعتِ فاخرہ اور ستر توڑے عطا کیے اور تمام فوجی اور ملکی انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ بخت خاں نے کہا کہ میرے انتظام میں کوئی شخص اختلال پیدا نہ کرے ورنہ میں اُسے سخت سزا دوں گا خواہ وہ شہزادے کیوں نہ ہوں۔ بہادر شاہ نے اُسے سیاہ سفید کی پوری اجازت دے دی تھی۔ اب بخت خاں نے شہر کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ اس وقت تک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ تلنگے اور ہندوستانی فوجی شہر میں دکانیں لوٹتے پھرتے تھے جس سے سخت انتشار اور ہیجان برپا تھا۔ چناں چہ فرحت اللہ بیگ نے 'نذیر احمد کی کہانی' میں دریبے کے گندھی کی دکان کا جو لطیفہ لکھا ہے کہ فوجی نے عطر کا پورا کنستر دکان سے اٹھا کر گھوڑے کی ایال پر اوندھا دیا تھا۔ یہ منجملہ سینکڑوں واقعات کے ایک نمونہ ہے۔ بازار کئی کئی دن بند رہتے، بادشاہ کے آدمی فرداً فرداً سب دُکانوں پر جاتے اور کہہ کہہ کر دکانیں کھلواتے تھے۔ فوجی بھی چوں کہ زیادہ تر لوٹنے کھسوٹنے کی طرف لگ گئے تھے اس لیے انگریزوں کی مدافعت میں وہ انہماک باقی نہ تھا اور وہ انھیں پہاڑی تک بھگا کر مطمئن ہو گئے تھے۔ بخت خاں نے انتظام سنبھالا تو سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ آئندہ اگر لوٹ مار ہوئی تو کوتوال کو پھانسی دی جائے گی۔ اُسے معلوم ہوا کہ بعض شہزادوں کے اشاروں پر تلنگے لوٹ مار کرتے ہیں تو اس نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ اگر شہزادوں نے شہر میں لوٹ مار کرائی تو میں ان کے ناک کان کاٹ لوں گا۔ بہادر شاہ نے یہ کہہ کر اجازت دے دی کہ ''تمھیں اختیار ہے۔'' سب طرف امن ہو گیا، لوٹ کھسوٹ قطعاً بند ہو گئی اور سارے کام اطمینان سے ہونے لگے۔ اب صرف انگریزوں کو پہاڑی مورچے سے بھگانے کا مرحلہ باقی تھا۔ چاروں طرف سے فوجیں آ آ کر بخت خاں کے ساتھ شامل ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ سب کام کرنا چاہتا تھا۔ بریلی میں بھی بغاوت کی اطلاع ۱۳ رمئی کو پہنچ چکی تھی، مگر اس نے ۳۱ رمئی سے پہلے وہاں قطعاً شورش نہیں ہونے دی اور اس سازش کو دبائے رکھا، حتیٰ کہ ۲۹ رمئی کی شام کو ہندوستانی افواج نے انگریزوں کو یقین دلایا تھا کہ ہم لوگ بغاوت نہیں کریں گے۔ اسی طرح بخت خاں نے دہلی میں آ کر سب سے پہلے قلعے کا انتظام درست کیا پھر عوام میں اور فوجیوں میں صدق و خلوص کا جذبہ بیدار کیا، پھر افواج کی تنظیم کی۔ وہ بہ نفسِ نفیس فوجوں کی پریڈ کا معائنہ کرتا تھا، اُن کا ساز و سامان دیکھتا تھا اور تربیت دیتا تھا۔ شہر کے باشندوں کو حکم دیا کہ ہر شخص اپنے پاس ضرورت کے بقدر ہتھیار رکھے اور جس کو ہتھیار خریدنے کی مقدرت نہ ہو وہ سرکار سے

ہتھیار لے لے، اُسے مفت دیے جائیں گے۔ اتنا ہی نہیں اس نے مختلف کمیٹیاں بھی بنادیں۔ ایک جنگی معاملات کی مشاورتی کمیٹی تھی جس کے میر منشی خیرات علی تھے جو اعلا درجے کی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک انتظامی وملکی امور کی مشاورتی مجلس تھی۔ ان کے جلسے خفیہ طریقے سے قلعے میں ہوتے تھے اور وہاں تمام مشورے کیے جاتے تھے۔ خود بہادر شاہ اس کمیٹی کے فیصلوں کے پابند تھے اور ان کی مرضی کے خلاف حکم نہیں دے سکتے تھے۔ ان کی مہر بھی کمیٹی کے قبضے میں رہتی تھی۔ بقرعید کا موقع آیا تو جنرل بخت خاں نے شاہی فرمان جاری کرایا کہ گائے کی قربانی سے ہندو ہم وطنوں کی دل آزاری ہوتی ہے کوئی مسلمان گائے کا ذبیحہ نہ کرے جو قانون کی خلاف ورزی کرے گا اُسے پھانسی کی سزا دی جائے گی۔ تمام مسلمانوں نے اس فرمان کا دل و جان سے احترام کیا۔

غرض یہ کہ بخت خاں نے دہلی آنے کے بعد سب سے بڑی کمی تنظیم کی محسوس کی تھی اور اُس نے پہلے فوج کو تیار کیا تھا اور لڑائی کا سلسلہ قطعاً موقوف کردیا۔ اس سے مخالفوں کو بادشاہ کے کان بھرنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے بخت خاں پر الزام لگانے شروع کیے کہ وہ انگریزوں سے ساز باز کررہا ہے۔ بخت خاں کے خلاف فردِ الزامات طویل ہوتی جاتی تھی اور روزانہ دربار میں اُسے کسی نہ کسی الزام کی صفائی میں بولنا پڑتا تھا۔ چوں کہ بادشاہ نے افواج کی کمان مرزا مغل کے سپرد کررکھی تھی اور اس بے چارے کو لڑائی کا یا فوج کی تنظیم کا مطلق سلیقہ نہ تھا سوائے شعر کہنے اور ہاو ہو کرنے کے، انھوں نے کبھی نہ میدانِ جنگ کی صورت دیکھی تھی نہ فوج سے پالا پڑا تھا۔ بخت خاں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ ولی عہد بہادر کو آتا جاتا خاک نہیں اور وہ فوج کی کمان کرنے سے قاصر ہیں اس لیے بادشاہ نے عرضی منظور کرتے ہوئے فوجوں کی قیادت بھی بخت خاں کے سپرد کردی۔ اس سے شہزادے خار کھانے لگے، انھیں بخت خاں کا یہ اقتدار اور خودمختاری ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انھوں نے کبھی بادشاہ سے یہ کہا کہ بخت خاں اپنی بادشاہت کے لیے راستہ ہموار کررہا ہے، کبھی یہ الزام دھرا کہ وہ انگریزوں سے مل گیا ہے، کبھی یہ کہا کہ وہ اودھ کے کسی نیچ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور شریف و نجیب نہیں ہے۔ آئے دن کی ریشہ دوانیوں اور اندرونی سازشوں سے سارے پروگرام میں کھنڈت پڑگئی، بخت خاں بددل ہوگیا اور فوجوں میں انتشار پیدا ہوگیا اور سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کے لیے جو رسوائی مقدر ہوچکی تھی اس کا وقت قریب آپہنچا۔ اگر بہادر شاہ کے یہ کور مغز نمک حرام ساتھی اُس سے دغابازی نہ کرتے تو بخت خاں

انگریزوں کا نام ونشان ہندوستان کی سرزمین پر نہ چھوڑتا اور ملک فرنگیوں کے جبر واستبداد سے نجات پاجاتا۔

۹/جولائی کو بخت خاں نے ۹ ہزار سپاہ لے کر انگریزوں پر پہلا حملہ کیا اور تیس ہزاری میدان اُن سے چھین لیا۔ اِدھر باغپت کی طرف اپنی فوج بھیجی کہ انگریزوں کو پُل نہ بنانے دے۔ کثیر تعداد فوج علی پور کے مورچے پر بھیجی اور ہر بار فتح یاب ہوا۔ بہت سا مال واسباب بھی انگریزوں کا اس کے ہاتھ لگا۔ انگریزوں پر بخت خاں کی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی کیوں کہ وہ اس کے شجاعانہ کارناموں سے واقف تھے۔ چناں چہ بخت خاں جب مقابل ہوا ہے تو انگریزی لشکر کے سپہ سالار بار بار تبدیل کیے جاتے تھے اور کسی طرح تیر نشانے پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اِدھر بخت خاں نے ذرا جنگ میں توقف کیا اُدھر ''تمام فوج نے اس کو ملامت کرنی شروع کردی کہ تو نے جنگ کو التوا میں ڈال دیا اس کا کیا سبب ہے۔''

اِدھر اچانک ایک یہ حادثہ رونما ہوا کہ ثمرو بیگم کی حویلی میں جو بارود کا کارخانہ قائم تھا اس میں سات سو من بارود موجود تھی، وہ ایک دن اچانک اُڑ گئی۔ اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ زمین آسمان ہل گئے بظاہر تو یہ اتفاقی حادثہ سمجھا گیا لیکن اس میں انگریزوں کی سازش ضرور رہی ہوگی۔ بارود کا کارخانہ ختم ہوجانے کے بعد فوج کی مقاومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بخت خاں اپنی مقدرت کے مطابق کوشش کررہا تھا کہ یہ جنگ خیر وخوبی سے فتح وظفر پر ختم ہوجائے۔ اس نے فوجیوں سے یہ کہہ دیا تھا اور بادشاہ سے باقاعدہ فرمان جاری کرادیا تھا کہ ''جو شخص میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں کرے گا اُسے پانچ بیگھہ زمین دی جائے گی اور اعزازی عہدہ بھی دیا جائے گا۔'' خود اس نے جتنی بہادری، بے جگری اور ہمت و شجاعت کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا اُس کا شناسانہ اعتراف ذکاء اللہ جیسے انگریز پرست نے بھی کیا ہے، ''جنرل نے بھی کمانڈر انچیف کی نقل اتاری۔ آج میگزین دیکھتا ہے، اس میں بالترتیب سامان رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ لال ڈگی اور جامع مسجد کے درمیان ہزاروں فوج کی پریڈ لی۔'' ہم ان تمام معرکوں کی تفصیل بیان کرسکتے ہیں جو انگریزی ریکارڈ سے حاصل ہوئی ہیں، یہاں اُن تمام باتوں کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔

انگریزوں نے جب یہ اطمینان کرلیا کہ باغی افواج میں انتشار پیدا ہوچکا ہے اور اُن کے پاس نہ سامان ہے نہ رسد، نہ روپیہ ہے نہ بارود، تو انھوں نے زور شور سے تیاری شروع

کردی اور آخر ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر آخری حملہ کیا۔ ۱۹ر ستمبر کو شہر میں داخل ہو گئے۔ بہادر شاہ قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرے چلنے لگے تو اس وقت جنرل بخت خاں نے آکر عرض کیا "اگرچہ دہلی انگریزوں نے لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ تمام ہندوستان ہمارے ساتھ ہے، ہر شخص کی نظر آپ کی ذات اور آپ کے حکم پر لگی ہوئی ہے، حضور کچھ تردد نہ فرمائیں۔ میرے ساتھ تشریف لے چلیں میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ایسی زبردست مورچہ بندی کروں گا کہ انگریز کا فرشتہ بھی وہاں نہ آسکے گا۔ دہلی پایۂ تخت ہے، فوجی قلعہ نہیں ہے، لڑائیوں کے لیے ایسے مقامات مناسب نہیں ہوتے۔ سب سے بڑی خرابی اس بات نے ڈالی کہ حضور کے صاحبزادے مرزا مغل فوج کے کمانڈر انچیف بنا دیے گئے، وہ لڑائی کے فن سے واقف نہ تھے نہ ان کو یہ معلوم تھا کہ خودسر اور سرکش فوجوں کو کن طریقوں سے قابو میں لایا جاتا ہے۔ اگر مرزا مغل میرے منصوبوں میں رخنے نہ ڈالتے اور ہارج نہ ہوتے تو یقیناً اسی خودسر فوج سے انگریزوں کو شکست دے دیتا۔ ہم کو سب سے بڑی دشواری یہ درپیش تھی کہ رسد رسانی کا انتظام نہ تھا۔ ملک میں ابتری تھی۔ پھر ہمیں آپس کے بگاڑ اور ایک دوسرے پر بھروسہ نہ ہونے کے سبب وہ قوتیں جو دشمن کے مقابلے میں صرف کرنی تھیں، خانگی جھگڑوں میں صرف کرنی پڑیں۔ مگر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ تمام ہندوستانی ریاستیں خاموش بیٹھی دیکھ رہی ہیں کہ اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔ جس وقت ہمارا پلّہ ذرا بھی بھاری ہو گیا وہ سب ہماری امداد کے لیے اٹھ کھڑی ہوں گی۔ ایسی حالت میں آپ یقین کیجیے کہ اگر آپ محفوظ مقامات پر بیٹھ کر انگریز کا مقابلہ کریں گے تو تمام ملک ہمارا ساتھ دے گا۔ سامان، رسد، ہتھیار، آدمی، سب کچھ بہ افراط مل سکتا ہے۔ جہاں پناہ کے سامنے یہ عرض کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے کہ حضور کے اجداد نے اس سے بڑھ بڑھ کر شکستوں اور ناکامیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ شہنشاہ بابر بعض اوقات دشمنوں میں ایسے گھرے کہ تنہا بھاگنے کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں کیسی بے بسی میں ایران بھاگ گئے تھے مگر ان کے استقلال نے تمام مشکلات پر فتح پائی۔ آپ بھی اسی بزم کی شمع ہیں، آپ سے تو ملک کے بچے بچے کو ہمدردی ہے۔ اگر حضور میرے ساتھ تشریف لے چلیں تو چند روز میں ہر چیز درست کر دوں گا اور ظلِ سبحانی کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھوں گا۔"
بادشاہ اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ ہم ہمایوں کے مقبرے جاتے ہیں تم کل صبح وہاں آؤ۔ مگر دوسری طرف غدار الٰہی بخش انگریزوں کی طرف سے اس کام پر مامور تھا کہ

بہادر شاہ کو بخت خاں کے ساتھ نہ جانے دے۔ جب بخت خاں چلا گیا تو الٰہی بخش نے بہادر شاہ کو ورغلانا شروع کیا کہ انگریز آپ سے کوئی باز پرس نہ کریں گے، کیوں کہ آپ مجبور تھے لیکن اگر آپ بخت خاں کے ساتھ چلے گئے تو آپ کو مجرم قرار دیا جائے گا۔ باغی کہیں بھی مقابلہ نہ کرسکیں گے۔ آپ کی ضعیفی کا زمانہ ہے، برسات آگئی ہے، ایسی حالت میں سخت تکلیف ہوگی۔ میں انگریزوں سے تمام معاملات طے کرادوں گا اور آپ پر ایک حرف نہ آنے دوں گا۔'' یہ سن کر بادشاہ خاموش ہوگیا اور ہمایوں کے مقبرے میں چلا گیا۔ الٰہی بخش نے میجر ہڈسن کو یہ خبر دے دی کہ بخت خاں اپنی فوج کے ساتھ مشرق کی طرف جمنا کی ریتی میں پڑا ہوا ہے اور کل صبح بہادر شاہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے بہادر شاہ کو بہت سمجھادیا ہے کہ وہ بخت خاں کے ساتھ نہ جائیں۔ کل جب بخت خاں بادشاہ سے بات کرکے چلا جائے آپ فوراً بہادر شاہ کو گرفتار کرلیں۔ اگلے دن صبح کو بخت خاں ہمایوں کے مقبرے میں پہنچا اور بہت دیر تک بہادر شاہ سے بات چیت رہی۔ بخت خاں کے سمجھانے سے بہادر شاہ چلنے پر آمادہ ہوگئے، لیکن الٰہی بخش برابر روکتا تھا، یہاں تک کہ بخت خاں سے کہا، ''آپ کیا بادشاہ کی آڑ میں خود حکومت کرنا چاہتے ہیں؟ اور مغلوں سے صدیوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں جنھوں نے پٹھانوں سے حکومت چھینی تھی۔'' یہ سن کر بخت خاں آگ بگولا ہوگیا اور قریب تھا کہ تلوار سونت کر الٰہی بخش کا سر تن سے جدا کردے۔ بادشاہ نے روک دیا اور کہا، ''بہادر مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے اور تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے اس لیے اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو اور بسم اللہ کرو، کچھ کام کرکے دکھاؤ۔ میں نہیں، میرے خاندان میں سے نہیں، نہ سہی، تم یا کوئی اور ہندوستان کی لاج رکھے۔ ہمارا فکر نہ کرو اپنے فرض کو انجام دو۔''

بخت خاں نے یہ جواب سنا تو اُسے مایوسی ہوئی۔ ساتھ ہی یقین ہوگیا کہ بادشاہ کی موت اُسے دعوت دے رہی ہے اور اس سے ملے ہوئے غدار اپنا وار پورا کرچکے ہیں۔ وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوگیا۔ اس کے ساتھ چالیس ہزار فوج تھی۔

دلّی سے رخصت ہوکر وہ لکھنؤ گیا اور حضرت محل اور برجیس قدر کے ساتھ اپنے دوسرے ہمراہیوں سمیت جن میں نانا صاحب بھی تھے، کئی جنگیں لڑیں۔ نواب گنج میں پہلا معرکہ ہوا

جس میں انگریز پسپا ہوئے اور لکھنؤ پر مولوی احمداللہ شاہ کا قبضہ ہوگیا۔ بالآخر موخاں کی نالائقی اور مخالفت کے سبب پسپا ہونا پڑا۔ آخری معرکہ عالم باغ کا تھا جس میں مجاہدین بڑے بے جگر ہوکر لڑے۔ حضرت محل برجیس قدر کو لے کر نکل کھڑی ہوئیں۔ فوج میں انتشار پھیل گیا۔ بخت خاں شاہ جہان پور کی طرف چلا گیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں وہاں بھی ایک معرکہ سر ہوا۔ شاہ احمداللہ نے قصبہ محمدی میں حکومت قائم کی تو بخت خاں کو وزیر دفاع مقرر کیا۔ احمداللہ شاہ کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ کالن کیمبل نے حملہ کیا تو شکست اٹھائی اور انگریزوں نے قصبہ محمدی پر قبضہ کرلیا۔ جنرل بخت خاں مع اپنی افواج ایک دن اچانک روپوش ہوگئے۔ بعض کہتے ہیں اُن کے ساتھ چالیس ہزار فوج تھی، بعض کم بتاتے ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ پانچ ہزار کے لگ بھگ سپاہی اُن کے ساتھ ضرور تھے جن کا آج تک پتہ نہ چل سکا کہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ یہ ایک معما ہے، کوئی کہتا ہے نیپال کی پہاڑیوں میں روپوش ہوئے، کسی کا خیال ہے مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے، کچھ لوگ کہتے ہیں سرحد کی طرف چلے گئے اور آزاد قبائل میں انگریزوں کے خلاف کام کرتے رہے۔ بہرحال جو بھی صورت ہو قصبہ محمدی پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد بخت خاں کا نام ونشان نہ ملا۔

بخت خاں ایسا غیر معمولی شجیع، دلیر اور جاں باز مجاہد تھا جسے ہندوستان کی سرزمین مدتوں میں جنم دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بخت خاں بہادر شاہ ظفر کو تخت سے محروم کرکے عنانِ اختیار اپنے ہاتھوں میں لے لیتا تو ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ ہی بدل جاتا اور بقول خواجہ حسن نظامی: دوسرا شیر شاہ تاریخوں میں لکھا جاتا۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، جنگِ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء کے شکریے کے ساتھ)

غلام رسول مہر

۱۸۵۷ء

(متفرقات)

یہ گراں قدر مضمون اگست ۱۹۵۷ء کے شمارے میں شائع ہوتا لیکن قبلہ مہر صاحب ہی پر موقوف نہیں، ہر صاحب توفیق دیر بخشی کا قائل ہوا کرتا ہے۔ 'جنگِ آزادی نمبر' کے لیے اسے کام میں نہیں لا سکا تو اب بعد از جنگ یہی کر سکتا ہوں کہ کلۂ خویش پیش کردوں ——— ع.م

۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار کے سلسلے میں کتابوں، جرائد و رسائل کے خاص نمبروں یا بعض دوسری تحریرات کے ذریعے سے جو حالات فراہم ہو گئے اور تاریخ ہند کے اس نہایت اہم واقعے کے مختلف پہلوؤں پر جو بحثیں کی گئیں وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ اس ضمن میں ایک ضروری کام یہ تھا کہ اس عہد کے جتنے بھی اخبار مل سکیں، ان سے وہ تمام خبریں یا تبصرے الگ کر لیے جائیں جن میں ۱۸۵۷ء یا اس کے متعلقات کا ذکر ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بجائے خود بھی اہم ہے اور اس لحاظ سے بھی خاص توجہ کا محتاج ہے کہ ممکن ہے کسی معاملے کے متعلق ہمیں ایسی روشنی مل جائے جو اور کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہوئی۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں کہ مختلف اہلِ قلم نے اس بارے میں کیا کچھ فراہم کیا، لیکن میں ایک سرسری نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں جسے دیکھ لینے کے بعد بہ خوبی اندازہ ہو سکے گا کہ یہ کام واقعی اہم ہے۔

'کشف الاخبار' بمبئی

بمبئی سے 'کشف الاخبار' نام کا ایک اردو اخبار نکلتا تھا جس کی ابتدا غالباً ۱۸۵۵ء سے ہوئی

اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک جاری رہا۔ منشی امان علی لکھنوی اس کے اڈیٹر تھے۔ مجھے اس اخبار کی ساتویں، آٹھویں اور نویں جلد (مئی ۱۸۶۱ء-مارچ ۱۸۶۴ء) دیکھنے کا موقع ملا۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۶۱ء میں اصل ہنگامہ ہی نہیں بلکہ اس کے ذکر میں بھی گرم جوشی کا کوئی پہلو باقی نہ رہا تھا۔ تاہم ان جلدوں میں بھی متعدد ایسی معلومات یا تفصیلات مل گئیں جو عام کتابوں میں نظر سے نہ گزری تھیں۔ میں انھیں ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

روٹیاں، کنول اور خشکہ

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ مدت پیشتر مختلف مقامات پر روٹیوں کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور یہ سلسلہ موضع بہ موضع دور تک پہنچا تھا۔ تقسیم کے موقعے پر تو اس پر کوئی توجہ نہ کی گئی لیکن بعد میں اسے ایک پُراسرار تدبیر قرار دیا گیا اور اس کا سراغ لگانے میں سعی و کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ بہادر شاہ کے مقدمے میں بھی روٹیوں کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح کلکتہ کی جانب اہلِ فوج میں کنول کے پھول پھرائے گئے تھے۔

انگریزوں کو مدت تک خیال رہا کہ یہ ہنگامے کے لیے پروپیگنڈے کا خاص ذریعہ تھا۔ ہمیں قطعاً معلوم نہ تھا کہ ۱۸۶۱ء میں بھی ایک ایسا ہی پُراسرار واقعہ پیش آیا تھا۔ ۳۰ر مئی ۱۸۶۱ء کے 'کشف الاخبار' میں مندرجہ ذیل خبر شائع ہوئی:

> ''ہنگامہ بلوائے گزشتہ (۱۸۵۷ء) سے پیشتر وسط ہند اور ملک اودھ کی طرف ہر جگہ شہروں سے بستیوں میں روٹیاں تقسیم ہوئی تھیں اور پیش گوئیاں ہوئی تھیں کہ انگریز ہندوستان سے جڑ بنیاد سمیت اکھڑ جائیں گے۔ 'دہلی گزٹ' نے خبر دی ہے کہ اب میرٹھ کی طرف ایک مقام سے دوسری جگہوں میں پکّے ہوئے چاول تقسیم کیے جاتے ہیں اور ہر مقام پر خشکہ پہنچاتے ہیں۔ اس مرتبہ ایک ہندو پیش گوئی کے لیے آشکارا ہوا کہ آئندہ تین برس میں کرشٹی لوگ (انگریز) ہندوستان سے فنا ہو جائیں گے۔''

'دہلی گزٹ' ہی نے چند روز بعد دوبارہ لکھا کہ ۱۸۵۷ء کی طرح پھر افواہیں مشہور ہیں۔ مہدی حسن رمّال نے میرٹھ میں بہت منحوس حال سنایا تھا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔

بہادر شاہ کی وفات

بہادر شاہ نومبر ۱۸۵۸ء میں دہلی سے روانہ ہوا تھا اور ماہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں رنگون پہنچ گیا تھا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی وفات کی خبر مشہور ہوئی۔ بالآخر ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو وہ خوفناک آلام و مصائب کے زخموں سے خونچکاں قلب و روح کے ساتھ راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ 'کشف الاخبار' (۲۷ر نومبر ۱۸۶۲ء) میں یہ خبر یوں شائع ہوئی تھی:

''دہلی کے بادشاہ ذی جاہ نے جو مقام رنگون میں اسیر تھا اور سابق میں چند مرتبہ ان کی وفات کی خبر آئی تھی، آخر کو غلط ٹھہری تھی۔ اب کی مرتبہ ظاہر ہوا کہ ان دنوں بہ قضائے الٰہی اقلیم بقا کے راہی ہوئے جھگڑا سلطنت اور اسیری کی مصیبت سے نکل گئے۔ نام سلطنت تیموریہ کا تمام ہوگیا، ریاست اکبری کا اختتام ہوگیا۔

میر کا ہجر میں وصال ہوا آج قصہ ہی انفصال ہوا

عمر بادشاہ کی نوّے برس کی ہوگی۔''

۱۸۶۲ء میں انگریزوں کا یہ حال تھا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا تصور کرتے ہی جوش غیظ میں گرد و پیش بجلیاں گرانے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ خصوصاً بہادر شاہ پر سخت عتاب نازل تھا۔ تاہم دیکھیے 'کشف الاخبار' کے ایک ایک لفظ میں بہادر شاہ کے ساتھ محبت و عقیدت کا کیسا سمندر موجزن ہے۔

تاریخ ہائے وفات

بہادر شاہ کی وفات کے جو قطعات تاریخ 'کشف الاخبار' نے شائع کیے وہ ذیل میں بہ طورِ یادگار درج کیے جاتے ہیں:

سراجِ دیں بوظفر مسافر بسوئے جنّت ہوا روانہ
کہ جس کے باعث مئے خوشی سے چھلک رہا تھا ایاغِ دہلی
'چراغِ دہلی' جلوس کا سال تھا، سواب بھی مطابق اس کے
سروشِ غیبی نے سالِ رحلت کہا، بجھا ہے چراغِ دہلی

سراجِ دیں نبیؐ بو ظفر بہادر شاہ
ہوئے جو عالمِ فانی سے رہگرائے بقا
سروش سے جو کہا میں نے بہرِ سالِ وفات
تو مجھ سے کہنے لگا چُپ چراغِ ہند بجھا

یافت جوں بوظفر سراج الدین
از ریاضِ بہشت رنگ و بو
از وفاتش جہاں چو شُد تاریک
گفت ہاتف، چراغِ دہلی گو

بادشاہ کی وصیتیں

'کشف الاخبار' نے ۸ر جنوری ۱۸۶۳ء کی اشاعت میں 'جلوۂ طور' (مورخہ ۲۵ر دسمبر ۱۸۶۲ء) کے حوالے سے شائع کیا کہ بادشاہ نے آخری وقت میں دو وصیتیں کی تھیں:

۱- جنازہ ان کا سپردِ زمیں ہوکر دہلی میں ان کے خاندانی مقبروں میں بھیجا جائے۔
۲- ان کی اولاد کو قید سے آزادی مل جائے۔

پہلی وصیت کا مطلب یہ تھا کہ میّت کو فوراً دہلی روانہ کر دینا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا کہا کہ فی الحال اسے امانت کے طور پر رنگون ہی میں دفن کر دیا جائے۔ چند مہینے گزر جانے کے بعد اسے منتقل کر کے دہلی پہنچا دیا جائے جہاں بہادر شاہ کے دو خاندانی مقبرے تھے۔ اول مقبرہ ہمایوں جہاں خاندانِ تیموریہ کے افراد عموماً دفن ہوتے رہے۔ دوسرا مقبرہ قطب صاحب میں تھا جہاں شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی کی قبریں تھیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہادر شاہ کو دہلی سے کس قدر محبت تھی اور یہ امر آخری وقت میں بھی اس کی تمام آرزوؤں کا مرکز تھا کہ اس کی مشتِ خاک کو دہلی کی آغوش میں پہنچا دیا جائے۔

دوسری وصیت میں بھی مضرت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت اگر جرم

تھی تو صرف بہادر شاہ مجرم تھا اور اسی کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تھا۔ زینت محل، جواں بخت یا شاہ عباس کا کیا گناہ تھا؟ حکومت انھیں بے تکلف رہا کر سکتی تھی، لیکن مظلوم بہادر شاہ کی کسی بھی وصیت پر عمل نہ ہوا۔

شاہ عباس کی شادی

بہادر شاہ کا فرزند شاہ عباس، شہزادہ جواں بخت سے چھوٹا تھا۔ یہ بھی والد کے ساتھ رنگون گیا۔ بادشاہ کی وفات کے بعد شاہ عباس کی شادی رنگون کے ایک معزز اور نامور تاجر محمد طاہر کی صاحبزادی سے غالباً نومبر ۱۸۶۳ء میں ہوئی۔ ۱۹ر نومبر کے 'کشف الاخبار' میں یہ خبر شائع ہوئی کہ شاہ عباس کی بیوی نے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے اس بنا پر درخواست کی ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء میں بہت چھوٹا تھا اور واقعی اس نے کسی سرگرمی میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔

کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار نے حکومت کو مشورہ دیا کہ شاہ عباس کو قطعاً رہا نہ کیا جائے۔ چناں چہ اسی مشورے پر حکومت نے عمل کیا اور شاہ عباس کی باقی زندگی بھی رنگون ہی میں گزری۔

شہزادہ فیروز شاہ

تیموری خاندان کے شہزادوں میں سے جس شخص نے ۱۸۵۷ء میں سب سے بڑھ کر سرگرم حصہ لیا وہ شہزادہ فیروز شاہ تھا۔ جہادِ آزادی کامیاب نہ ہوا اور انگریزوں کا عمل دخل جگہ جگہ بحال ہو گیا تو شہزادہ فیروز شاہ ہندوستان سے نکل گیا تھا لیکن مدت تک اس کے ظہور و نمود کی خبریں شائع ہوتی رہیں مثلاً 'کشف الاخبار' کی بعض خبریں ملاحظہ فرمائیے:

۱- شہزادہ فیروز شاہ کے متعلق جے پور کی طرف ظہور کی خبر ملی ہے۔ معلوم ہوا یہ وہی ہے جس کے کابل و قندھار ہو کر ایران و عربستان جانے اور فقیر ہونے کی خبر اول لکھی گئی تھی (۲۰ر جون ۱۸۶۱ء)۔

۲- شہزادہ فیروز شاہ بہ تبدیل لباسِ ساربان جے پور آیا تھا، پھر جنگل کی طرف چلا گیا (۴ر جولائی ۱۸۶۱ء)۔

۳- شہزادہ آدمیوں کو لے کر ایران چلا گیا (یکم اگست ۱۸۶۱ء)۔

۴- شہزادہ افغانستان کے راستے گیا باقی ساتھی جہاز پر سوار ہوکر خلیج فارس کے راستے گئے (۲۳/اپریل ۱۸۶۲ء)۔

آخر 'انگلش مین' کے حوالے سے ۱۰/مارچ ۱۸۶۴ء کو یہ بتایا گیا کہ عرب سے جو لوگ آئے ہیں وہ اس خبر کی تصدیق کرتے ہیں کہ شہزادہ فیروز شاہ عرب میں مذہبی ذکر اور دین کی پند و نصیحت کر کے دن گزار رہا ہے۔

نانا صاحب

۱۸۵۷ء کے مجاہدوں میں نانا راؤ کی عظمت کسی تشریح کی محتاج نہیں، وہ بھی اودھ سے نیپال چلا گیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں بار بار افواہیں اڑتی تھیں کہ نانا صاحب کو دیکھا گیا ہے۔ متعدد آدمی جگہ جگہ نانا صاحب کے دھوکے میں گرفتار ہوئے اور باز پُرس کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد انھوں نے رہائی پائی۔ اس کے متعلق بھی بعض اطلاعات ملاحظہ فرمایئے:

۱- مخبروں کا اظہار ہے۔ سچ جھوٹ میں شبہ آشکار ہے۔ نانا راؤ سردار باغی مرگیا یا اب تک زندہ ہے۔ اس واسطے سرکار جوینده ہے۔ چناں چہ بالفعل اس بارے میں کامل دل جمعی اور صداقت کی خبر لانے کے لیے چند آدمی بھیجے گئے ہیں، مگر صاحب خبر نے یہ نہیں لکھا کہ وہ کس طرف اور کہاں روانہ ہوئے ہیں (بہ حوالہ بمبئی سماچار، مورخہ ۲/اکتوبر ۱۸۶۱ء)۔

۲- وہ مفسد مرا نہیں حیات ہے... اطراف بتان (بھوٹان) کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوکر رخت اقامت رکھتا ہے۔ شامت کے دن بھرتا ہے (۳۱/اکتوبر ۱۸۶۲ء)۔

۳- نانا کے متعلق بار بار خبریں آتی ہیں 'لندن نیوز' نے اس کی تصویر بھی چھاپی ہے۔ نانا کا بھائی کوچ بہار کی عملداری میں پکڑا گیا (۱۶/جنوری ۱۸۶۲ء)۔

۴- نانا کے جاسوس بیالیس لاکھ کی ہنڈیاں اور بارہ لاکھ کے جواہرات لے کر حیدرآباد آئے اور روپیہ وصول کیا۔ بعد میں اطلاع ملی۔ اشتہار دیا

گیا اور گرفتاریاں عمل میں آئیں (ظاہر ہے کہ یہ محض افواہ تھی)۔

۵- مادھو راؤ نام کا ایک شخص گرفتار ہوا۔ اس کے پاس سے نانا راؤ کی رانی کے خطوط برآمد ہوئے۔ حیدرآباد میں بلوا کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔

راؤ صاحب

نانا صاحب کا بھتیجا راؤ صاحب ۱۸۶۲ء میں گرفتار ہوا تھا۔ کان پور میں اس پر مقدمہ چلا اور ۲۰/اگست ۱۸۶۲ء کو وہیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ ۱۱/ستمبر ۱۸۶۲ء کا 'کشف الاخبار' مظہر ہے کہ راؤ صاحب کی لاش اس کی منہ بولی ماں کے حوالے کی گئی۔ گنگا کے کنارے ارتھی کی آخری رسمیں ادا ہوئیں۔ اس کی بیوی بھی پاس تھی۔ اب وہ کاشی جانے کا ارادہ کیے بیٹھی ہے۔

تُلا رام

۱۸۵۷ء کے مجاہدوں میں ریواڑی کا تُلا رام بھی شامل تھا جو برابر لڑتا رہا۔ انگریز کامیاب ہوئے تو وہ بھی وطن چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے متعلق خبریں ملاحظہ فرمایئے:

۱- ریواڑی کا باغی سردار تلا رام ایران چلا گیا۔ شہزادہ فیروز شاہ بھی ساتھ تھا۔ تلا رام نے اپنے گھر والوں کو خبر بھیجی ہے کہ میں سلامت ہوں۔ کسی طرح آنا ہوا تو تم کو بھی (ساتھ) لے آؤں گا (فروری ۱۸۶۳ء)۔

۲- تلا رام ہرات پہنچا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوکر گیا تھا (۲/جولائی ۱۸۶۳ء)۔

ان مست سنگھ

جگدیش پور کے مجاہد سرداروں میں سے تھے۔ دو کا ذکر عام کتابوں میں آیا ہے، ایک کنور سنگھ، دوسرا امر سنگھ۔ 'کشف الاخبار' سے معلوم ہوا کہ ان کا ایک بھائی ان مست سنگھ بھی تھا جو جہادِ آزادی میں سرگرمی سے شریک رہا۔ کچھ معلوم نہیں کہ کب اور کہاں گرفتار ہوا۔

۱۱؍فروری ۱۸۶۲ء کے اخبار میں بتایا گیا ہے کہ ان مست سنگھ کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔

ظہورالحسن

اودھ میں جن لوگوں نے جوش وخروش سے کام کیا ان میں ایک ظہورالحسن بھی تھا۔ بچن سن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے ظہورالحسن کو مٹھولی کے راجا کے پاس ملازم کرادیا تھا۔ وہ بہت جلد راجا کا وکیل بن گیا۔ اس نے انگریزوں کو قتل کرانے میں نمایاں حصہ لیا۔

'کشف الاخبار' سے معلوم ہوا کہ انگریزوں کی کامیابی کے بعد ظہورالحسن فرخ آباد، متھرا، بھرتپور اور جبل پور ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچا۔ وہاں میر ببر علی جمعدار سے ملا، اپنا نام سرفراز حسین بتایا اور کہا کہ میں بڑودہ کے نامور امیر سیّد سرفراز علی کا بھتیجا ہوں۔

میر ببر علی نے اس کے لیے پہلے پچاس روپے کا منصب مقرر کرایا۔ پھر اہلکاروں میں بھرتی کرادیا اور وہ بہت جلد تحصیلدار بن گیا۔ آٹھ مہینے کی تحصیلداری کے بعد اتفاقیہ راز آشکار ہوگیا۔ ظہورالحسن اور اس کی بیوی گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا اور ۱۰؍دسمبر ۱۸۶۳ء کو اسے حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ بہ ظاہر اس نے بھی انڈیمان ہی کی آغوش میں آسودگی پائی۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، ستمبر ۱۹۵۷ء کے شکریے کے ساتھ)

~~~~~
~~~~~

قاضی عبدالودود

متفرقات

۱- بہادر شاہ اور واجد علی شاہ

جناب رئیس احمد جعفری کی کتاب 'بہادر شاہ اور اُن کا عہد' میں عبدالرزاق مرحوم مصنف البرامکہ کی 'یادِ ایام' سے عباراتِ ذیل نقل ہوئی ہیں:

''شاہ ظفر کو بہ جرمِ بغاوت دہلی سے رنگون جانے کا حکم ہوا تو واجد علی شاہ نے وائسرائے کے ذریعے سے شاہ کی خدمت میں دعوت نامہ بھیجا۔ ظفر نے دعوت تو نامنظور کی لیکن یہ لکھا کہ 'چند منٹ کے لیے جہاز سے اُتر کر مٹیا برج میں تم سے ملوں گا۔' چناں چہ تاریخِ مقرر پر وائسرائے اور جملہ عہدیدارانِ برطانیہ مٹیا برج میں جمع ہوئے تا کہ ملاقات کا منظر دیکھیں۔ جب ظفر شاہ حدودِ مٹیا برج میں تشریف لائے تو واجد علی شاہ نے باوجود بھاری بھرکم ہونے کے ادب سے سرِ نیاز جھکا کر ۲۱ سلام کیے۔ شاہنشاہ دہلی نے سلام لیا اور اس وقت دونوں اشک بار ہو گئے اور دیر تک رقت قائم رہی۔ برٹش حکام نے اس طریقۂ سلام کو حیرت کی نظروں سے دیکھا، کیوں کہ اس وقت شاہ اور وزیر دونوں دولتِ برطانیہ کے قیدی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز مورخین ظفر شاہ کو یکے از رعایائے سرکار لکھتے ہیں، لیکن یہ ایک ایسا غلط دعویٰ ہے جس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ظفر بلاشبہ سلطنتِ مغلیہ کا آخری شہنشاہ تھا، واجد علی شاہ ظفر کے بزرگوں کے پروردہ تھے، لہٰذا (واجد علی) شاہ نے اپنے آقا کا جس حیثیت سے استقبال کیا اور کورنش بجا لائے، وہ اس کا مستحق تھا۔ واجد علی شاہ

وائسرائے کو 'یکے از ملازمانِ کوئین وکٹوریہ' سمجھتے تھے اور رسمی طریق سے ملتے تھے، چناں چہ وائسرائے کا ظفر سے مصافحہ تک نہ ہوا۔'' (ص ۱۳۲)

''واجد علی شاہ کے ہاتھ میں ایک مرصع عصا تھا وہ نذر میں پیش کیا، جس کو شاہ ظفر نے منتوں سے قبول کیا اور ظفر شاہ کے ہاتھ میں جو زمرد کی تسبیح تھی وہ واجد علی شاہ کو عنایت فرمائی۔ اس عطیے پر شاہ نے پھر سلام کیا اور دست بوسی پر یہ ملاقات ختم ہوئی۔'' (ص ۱۰۶۴)

۱- واجد علی شاہ کے اجداد سلاطینِ مغلیہ کے وزیر رہے تھے، لیکن وزارت کا سلسلہ واجد علی شاہ کی پیدائش سے بہت قبل ختم ہو چکا تھا۔ ان کے پردادا غازی الدین حیدر کے عہد میں دہلی و اودھ میں جو برائے نام تعلق قائم تھا وہ بھی باقی نہ رہا تھا اور انھیں انگریزوں نے اودھ کا بادشاہ تسلیم کرلیا تھا۔ واجد علی شاہ کو سلطنتِ مغلیہ کا وزیر یا 'پروردہ' کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔

۲- بہادر شاہ جس زمانے میں کلکتہ پہنچے ہیں، واجد علی شاہ مٹیا برج میں مقیم نہ تھے، قلعۂ کلکتہ میں مقید تھے۔ اپنی مثنوی 'حزنِ اختر' میں واجد علی شاہ نے اس قید کا حال نظم کیا ہے اور تواریخِ اودھ جلد ۲ سے بھی اس کی کیفیت معلوم ہو سکتی ہے۔

۳- اس زمانے میں گورنر جنرل ہند کو وائسرائے نہیں کہتے تھے۔

۴- گورنر جنرل بیشک کوئین وکٹوریہ کا ایک 'ملازم' تھا لیکن ایسا 'ملازم' کہ واجد علی شاہ نے اُس کی شان میں قصیدہ لکھا تھا۔ تواریخِ اودھ جلد ۲ میں اس کے بہت سے اشعار موجود ہیں جن میں سے دو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

سکندر جاہ وکیکاؤس نوشروان عالم ہو
ارسطو فہم و افلاطوں منش حاتم کے ہم جم ہو
اعانت خرچ کی اس وقت میں کیوں نہ حاتم ہو (کذا)
مرا ہر مُو ہوا رطب اللساں نوّاب اکرم ہو

حالات ایسے تھے کہ واجد علی شاہ بہادر شاہ سے ملنے کی خواہش بھی ظاہر نہ کر سکتے تھے اور وہ ایسا کرتے تو انگریز کبھی اس کی اجازت نہ دیتے۔ 'یادِ ایام' اور 'بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد' میں دونوں کی ملاقات کی داستان کا اندراج حیرت انگیز ہے۔

۲- بہادر شاہ کے وداعی اشعار

'بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد' میں چار بندوں کا ایک مسدس اور چھ اشعار کی ایک غزل 'تذکرۂ تاریخِ عالم' شائع کردۂ بلاقی پرشاد سے لے کر درج کی گئی ہے اور تمہید میں مرقوم ہے کہ ظفر نے دہلی سے رخصت ہوتے وقت کہے تھے۔ مسدس کا آخری بند یہ ہے:

مجھ عاشقِ جانباز کو کیوں تو نے ستایا　　بتلا دے کسی بات میں باہر مجھے پایا
زندہ کو تو مردہ کیا مردے کو جلایا　　اے عیسیِ دوراں تجھے کچھ رحم نہ آیا
کیوں چرخ ستمگر مرا یہ حال پتا (کذا) ہے　　شہباز کو کنجشک کے پنجے میں رکھا ہے

یہ اشعار ایسے نہیں جو ایسے موقعے پر ظفر کی زبان سے نکلتے۔ نہ معلوم کس کا مسدس ہے جو ظفر کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ غزل یہ ہے:

کہاں خلقت عزیزو زیرِ چرخ پیر پھرتی ہے
یہ فانوسِ خیالی میں ہر اک تصویر پھرتی ہے
نہ چرخِ آسیا ہوں نے بھنور ہوں نے بگولا ہوں
مجھے تو کیوں لیے اے گردشِ تقدیر پھرتی ہے
ہوئی ہے جوشِ گل سے جوشِ وحشت اس قدر پیدا (کذا)
کہ ہر موجِ ہوا لیتے ہوئے زنجیر پھرتی ہے
تمھیں آتا ہے زیرِ چرخ خواب اے غافلو کیوں کر
کہ شب کو کہکشاں کھینچے ہوئے شمشیر پھرتی ہے
اُترتے ہیں گلے میں گھونٹ آبِ زندگانی کے
چھری جب حلق پر قاتل دمِ تکبیر پھرتی ہے
ظفر کو منزلِ مقصود پر تقدیر لے پہنچی
کدھر بھٹکی ہوئی یہ عقلِ بے تدبیر پھرتی ہے

یہ غزل ظفر کے دیوانِ اول کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہے۔ اس میں اوائل سے لے کر ۱۲۲۴ھ یا اس کے کچھ بعد تک کا کلام ہے اور یہ ظفر کے دورانِ حیات ہی میں طبع ہو چکا تھا۔ غزل ظفر کی ضرور ہے، لیکن رنگون کی کہی ہوئی نہیں۔

۳- ظفر کے اشعارِ رنگون

'بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد' میں ہے:

''شاعری کا شوق رنگون میں باقی رہا، ان کی بعض دردناک نظمیں دلّی تک پہنچیں اور اب بھی سخن فہموں کے پاس محفوظ ہیں، لیکن وہ نہ تو خود اُن کو شائع کرتے ہیں نہ دوسروں کو ان کی زیارت سے بہرہ مند کرتے ہیں۔ مرحوم اڈیٹر 'صلائے عام' دہلی کے پاس ایک نفیس نظم اسی دور کی تصنیف کسی ذریعے سے پہنچ گئی تھی اور اس کے کئی اشعار دلّی والوں کی زبان پر آ گئے تھے، وہ نظم نعت میں بطور مناجات تھی اور مدینہ میں موت کی تمنا کا اظہار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل غزل رنگون کی بے کسی اور کس مپرسی کی یادگار ہے۔ 'کون نگر میں آئے ہیں کون نگر میں باسے ہیں الخ (چار شعر) حسبِ ذیل اشعار بھی قید رنگون کی یادگار ہیں:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکوں میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

(تین شعر اور) یہ شعر بھی اسی عہد کی حسرت و مصیبت کی تصویر ہے:

نہ دبایا زیرِ زمیں انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں
نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے'' (ص ۱۳۳)

(الف) مدیر صلائے عام کے پاس جو نظم تھی وہ 'بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد' میں موجود نہیں؛ اور چوں کہ کسی دوسری جگہ بھی میری نظر سے نہیں گزری، میں اس کے متعلق کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔

(ب) 'کون نگر' الخ اور 'نہ کسی کی آنکھ' الخ 'بہادر شاہ ظفر' مصنفہ امیر احمد علوی سے ماخوذ ہیں، لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا کہ یہ اشعار ظفر کی ملک کس سند پر قرار دیے گئے ہیں اور جب تک کوئی قابلِ قبول سند نہ پیش کی جائے انھیں ظفر کی تصنیف سمجھنا ٹھیک نہیں۔

(ج) 'نہ دبایا' الخ بھی 'بہادر شاہ ظفر' سے ماخوذ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے: 'فغانِ دہلی' مولفہ تفضل حسین خاں کوکب (سال اشاعت ۱۲۷۹ھ) میں۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، جنگِ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء کے شکریے کے ساتھ)

ابوالکلام آزاد

پیش لفظ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی تاریخ

مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر ایس. این سین کی انگریزی تصنیف '۱۸۵۷ء' کا جو پیش لفظ لکھا ہے اس کا ملخص ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

... چوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نوابوں اور مغل شہنشاہ کے نام پر کام کرتی رہی اس لیے ہندوستانیوں کو ایک عرصے تک اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ اقتدار ایک غیر ملکی نسل کے ہاتھوں میں آ گیا ہے اور خود اپنے ملک میں ان کی حالت غلاموں کی سی بنادی گئی ہے۔ جب وسیع پیمانے پر لوگوں میں اس امر کا احساس پیدا ہوا تو بغاوت کے حالات پیدا ہو گئے اور جب بغاوت ہوئی تو یہ محض چند افراد یا کسی ایک گروہ کی سازش نہیں تھی بلکہ وسیع پیمانے پر لوگوں میں پھیلتی ہوئی بے اطمینانی کا نتیجہ تھی۔

بے اطمینانی میں اضافہ

یہ بے اطمینانی دو اقدامات سے اور بھی بڑھ گئی اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ان اقدامات کا فوری نتیجہ تھی۔ ان میں سے ایک تو کمپنی کی یہ پالیسی تھی کہ شرفا اور زمینداروں کو ان کے اختیارات سے محروم کر کے مزارعوں کو براہِ راست کمپنی کے ماتحت کر دیا جائے۔ دوسرا اقدام ڈلہوزی کی ہندوستانی ریاستوں کو یکے بعد دیگرے برطانوی علاقے میں شامل کرنے کی پالیسی تھی۔

مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ۱۸۵۶ء میں جب اودھ کا الحاق کیا گیا تھا تو اسی وقت عام فوج میں بالعموم اور بنگالی فوج میں بالخصوص بغاوت کا رجحان پیدا ہوگیا تھا اور چربی والے کارتوسوں کے معاملے سے فوج میں کوئی نئی بے اطمینانی پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس نے تو ایک موقع فراہم کیا جب دبی ہوئی بے اطمینانی کا کھلم کھلا اظہار کیا گیا۔

...اگر قوم پرستی یا حب الوطنی کے وہ معنی لیے جائیں جو آج کل لیے جاتے ہیں تو اس سوال کا جواب قطعی طور پر اثبات میں نہیں دیا جاسکتا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ بغاوت میں حصہ لینے والے لوگ حب الوطنی کے جذبات سے متاثر تھے مگر یہ جذبات اتنے قوی نہیں تھے کہ بغاوت پہ آمادہ کرسکتے۔

...سرگرم اور لمبی تحقیق کے باوجود اس وقت تک اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ بغاوت پہلے سے تیار شدہ کسی منصوبے کے تحت ہوئی یا یہ کہ فوج اور ہندوستانی قوم نے کمپنی کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کرلی تھی۔

شکست کی وجوہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی راہنماؤں کی ناکامی کی وجوہ سے بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بغاوت کے سربراہوں میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہوسکا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف مسلسل سازش کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے برخلاف انگریز اپنی ملکہ کے تئیں وفاداری کے جذبے کے تحت لڑتے تھے۔

قریب قریب اتنی ہی اہم بات یہ بھی ہے کہ سوائے چند بلند شخصیتوں کو چھوڑ کر جن میں احمداللہ اور تاتیا ٹوپے کے نام سرِفہرست ہیں، زیادہ تر راہنماؤں نے اس جدوجہد میں ذاتی وجوہ کی بنا پر حصہ لیا۔ انھوں نے اس وقت تک انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند نہیں کیا جب تک کہ ان کے ذاتی مفادات کو نقصان نہیں پہنچا۔

بغاوت کے دوران میں جو ظلم وستم روا رکھے گئے ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ اگر اس سلسلے میں ہندوستانیوں کا دامن بے داغ نہیں ہے تو انگریزوں کا کردار بھی کچھ ان سے بہتر نہیں رہا۔ انگریز مورخوں نے عام طور پر انگریزوں کے جور وستم کو نظر انداز کرنے کی

کوشش کی ہے مگر ان میں سے کچھ مورخ اس بات کو تحریر میں لے آئے ہیں کہ وہ انتقام کے نام پر توڑے گئے بے پناہ ظلم وستم سے کس قدر متنفر تھے۔

ہندو مسلم اتحاد

مولانا آزاد نے دو حقائق کی جانب توجہ دلائی ہے جو اُن کی نظر میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی الجھی ہوئی داستان میں بالکل واضح ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت زیادہ اتحاد تھا اور دوسری یہ کہ عوام کے دل میں مغل شہنشاہ کے تئیں وفاداری کے گہرے جذبات تھے۔

مولانا آزاد نے اس بات پر زور دیا ہے کہ فرقہ وارانہ خیالات سے رستگاری راہنماؤں کی کسی خاص کوشش کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے صدیوں کی مشترک زندگی کے نتیجے کے طور پر آپس میں دوستانہ تعلقات مستقل طور پر استوار کر لیے تھے، لہٰذا کسی خاص مقصد کے لیے اتحاد کی اپیل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

مولانا آزاد نے قارئین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی ہے کہ اس ہنگامہ خیز دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نگاہیں کس طرح دہلی اور مغل تاجدار بہادر شاہ پر مرکوز تھیں۔ ان کے درمیان اس بات پر مکمل اتفاق رائے تھا کہ صرف بہادر شاہ ہی ہندوستان کے شہنشاہ بننے کے حقدار ہیں۔ مولانا آزاد نے یہاں نانا صاحب کی مثال پیش کی ہے جنھوں نے مرہٹوں اور مغلوں کے درمیان پُرانے جھگڑے کے باوجود اس بات کا اعلان کرنے میں تامل نہیں کیا کہ وہ مغل دربار کے ایک صوبہ دار یا گورنر ہیں۔

ٹھنڈے دل و دماغ سے مطالعے کی ضرورت

مولانا آزاد نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ اس زمانے کے ہنگامہ خیز واقعات کی نئی اور مستند تاریخ کی اشاعت کے لیے ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کی صد سالہ تقریب کے موقعے کو ہی کیوں منتخب کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ: آج کا ماحول ایسا ہے کہ اس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کا مطالعہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کیا جا سکتا ہے۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، جنگِ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء کے شکریے کے ساتھ)

باقی صفحہ ۳۲۰ سے آگے

پر مجبور کیا اور اس کا لازمی انجام یہ ہوا کہ ایک نئی ذہنی اور ادبی فضا وجود میں آ گئی۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بارے میں ایک متوازن نظریہ یہی ہو سکتا ہے کہ اسے تاریخی واقعات کے سلسلے سے الگ کر کے نہ دیکھا جائے اور اسے پہلے کی داخلی اور خارجی تحریکات کا نقطۂ عروج قرار دیا جائے۔ علاوہ بریں اس میں شامل ہونے والے مختلف اور متنوع عناصر کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اس کے آگے لے جانے والے پہلوؤں کو فراموش نہ کیا جائے اور اس کے تاریک گوشوں کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کی لڑائی کا صحیح کردار متعین کیا جا سکے گا اور تاریخِ ادب میں اس کی نوعیت واضح ہو سکے گی۔

ادب کے مورخ کے لیے ۱۸۵۷ء کی جدوجہد جدید اور قدیم اردو ادب کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتی ہے۔ یہ حدِ فاصل قطعی اور حتمی نہیں ہے لیکن ۱۸۳۵ء اور ۱۸۷۴ء دونوں تاریخوں کے مقابلے میں ۱۸۵۷ء کو زیادہ سائنٹفک حد بندی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا لیکن اس اہم فیصلے سے اردو ادب کی فضا اس وقت تک نہیں بدلی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد کا وہ مشہور مشاعرہ ہوا جس میں طرحی غزلوں کی جگہ دیے ہوئے عنوان پر نظمیں پڑھی گئیں اور اس مشاعرے نے اردو شاعری میں نظم نگاری کی بنیاد ڈالی لیکن یہ دراصل شعور کی اس تبدیلی کا نتیجہ تھا جو ۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد اور اس سے پیدا شدہ لازمی ہم آہنگی کے احساس سے پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی جدوجہد ہماری سیاسی بیداری کی تاریخ ہی میں نہیں ہماری فکری اور ادبی تاریخ میں بھی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، جنگِ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء کے شکریے کے ساتھ)

محمد حسن

۱۸۵۷ء کی ادبی اہمیت

۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا اس کی طرف ادبی تنقید کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ سوال ہی بے معنی نظر آئے کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی سیاسی اور تاریخی واقعہ ہے ادبی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اگر تاریخ اور ادب کا کوئی رشتہ ہوتا ہے اور تاریخ ادب صرف مصنفین کے نام کی فہرست نہیں ہوتی بلکہ ایک قوم کے عہد بہ عہد ذہنی اور عمرانی نشوونما کی داستان ہوتی ہے تو یقیناً ۱۸۵۷ء کے بارے میں ادب کے مورخ کو بہت کچھ سوچنا پڑے گا اور اسکی طرف اپنا رویہ طے کرنا ہوگا۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو فوجی بغاوت کہا جائے یا جنگِ آزادی قرار دیا جائے، غدر کا نام دیا جائے یا چند معزول شدہ بادشاہوں اور رجواڑوں کی آخری بازی سمجھا جائے۔ ایک طرف مورخین کا وہ گروہ ہے جو اسے مذہبی جنگ قرار دیتا ہے، دوسری طرف وہ ہیں جو اسے محض اتفاقی شورش سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دعویٰ بھی بے دلیل نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس لڑائی کی ابتدا انگریزی فوج کے ہندوستانی دستوں کی نافرمانی سے ہوئی اور میرٹھ سے یہی دستے دہلی پہنچے انھیں برطانوی افسران سے شکایتیں تھیں۔ انھیں سور اور گائے کی چربی کے کارتوسوں کے استعمال کرنے پر اعتراض تھا۔ انھیں انگریز سپاہیوں کی بالادستی کا شکوہ تھا اور اس بنا پر اسے فوجی بغاوت کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے۔

لیکن یہ بات بھولنے کی نہیں ہے کہ جلد ہی اس لڑائی کی نوعیت بدل گئی۔ اب یہ لڑائی صرف کارتوسوں پر نہیں تھی، صرف ملازمت کی تکلیفوں اور غیر مساوی برتاؤ پر نہ تھی، یہ لڑائی اقتصادی یا فوجی سے آگے بڑھ کر سیاسی ہوگئی تھی اور ان غیر مطمئن اور ناآسودہ سپاہیوں کو

ان تمام عناصر کی ہمدردی اور حمایت حاصل ہوگئی تھی جو انگریزی حکومت کے جبر و استیلا کے شکار ہو چکے تھے۔ ایک طرف انگریز اور ان کے ہندوستانی خیرخواہ تھے، دوسری طرف سارے انگریز دشمن عناصر جمع ہو گئے تھے۔ ان معنوں میں اسے جنگِ آزادی کہا جا سکتا ہے، گو اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اس وقت نہ تو قومیت کا کوئی واضح تصور موجود تھا اور نہ سیاسی آزادی کا۔ اگر ۱۸۵۷ء کی لڑائی کا نتیجہ ہندوستانیوں کے حق میں برآمد ہوتا تو ہندوستان میں غیر ملکی سامراج کے بجائے شاید قومی آزادی نہ آتی، پُرانے انحطاط پذیر رجواڑوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پھر سے قائم ہو جاتیں۔

جو لوگ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو غدر کا نام دیتے ہیں وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ یہ لڑائی منظم نہیں تھی اور اس میں شریک ہونے والے اکثر وہ لوگ تھے جو صرف لوٹ مار کے لیے لڑائی میں شامل ہو گئے تھے۔ ان میں سیاسی مجاہدوں کی منظم اور ایثار پسند جماعت کم تھی اور شورہ پشت اور لٹیرے بہت سے شامل ہو گئے تھے جو کسی ڈسپلن کو نہ مانتے تھے اور کسی عسکری تنظیم سے وابستہ نہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں بے ترتیبی اور بدنظمی کا ایک ایسا دور آیا تھا جس کا انکار ممکن نہیں۔ داغ کے 'شہر آشوب' میں، ظہیر دہلوی کی 'داستانِ غدر'، مولوی ذکاء اللہ کی 'تاریخِ ہندوستان' میں، نذیر احمد کی تصانیف میں اور غالب کے خطوط میں جن 'کالوں' اور 'پوربیوں' کا ذکر ہے وہ تمام کا تمام انگریزوں کے ڈر سے ہی نہیں لکھا گیا اس میں حقیقت کا بھی شائبہ ہے۔ لیکن کیا بے ترتیبی اور بدنظمی کے اسی دور سے ۱۸۵۷ء کی لڑائی کا سارا کردار متعین کرنا درست ہوگا؟ منظم سے منظم جنگِ آزادی میں بدنظمی اور بے ترتیبی کے ایسے دور آتے ہیں لیکن کیا اس بنا پر ایسی جنگوں کو غدر کہا جا سکتا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ رجواڑوں اور بادشاہوں نے اس لڑائی سے وابستہ ہو کر اپنی کھوئی ہوئی سیاسی طاقت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس لڑائی میں صرف انھیں معزول شدہ حکمرانوں کی فوجیں نہیں لڑ رہی تھیں، اس میں تو وہ سب لوگ تھے جو انگریزوں سے ناآسودہ تھے اسی لیے پہلا نعرہ 'دین، دین' کا تھا جو کمپنی کی بے جا مذہبی مداخلت کے خلاف سارے ہندوستانیوں کو یکجا ہو کر لڑنے کے لیے اکساتا تھا۔ اس وقت سیاسی بیداری ایسی عام نہ تھی کہ وہ جمہور کی ہر سطح تک پہنچ کر اسی لڑائی کو ہمہ گیر، قومی اور عوامی لڑائی میں تبدیل کر سکے۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو کسی ایک لفظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ ایک طویل عمل تھا جو مختلف منزلوں سے گزرا اور جس کی نوعیت مختلف اور متنوع تھی اور جس میں نہ جانے کتنے

عناصر مل جل کر کام کر رہے تھے۔

۱۸۵۷ء کی یہ لڑائی حادثہ نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے اسباب وعلل کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ یہاں اس کے سیاسی محرکات سے بحث نہیں اس کے ذہنی تار و پود پر غور کرنا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی فکر اور خیال کے طویل سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے اور چوں کہ ادب بھی خیال اور جذبے ہی کا نام ہے اس لیے اس عہد کے فکری تانے بانے کو اس لڑائی نے جس طرح متاثر کیا ہے وہ ادبی مورخ کے لیے بھی دل چسپی کا موضوع ہے۔

انگریزوں کے حکمران ہونے سے قبل ہندوستان میں قومیت کا تصور اور احساس بڑا ہی دھندلا اور موہوم سا تھا اس لیے اس عہد سے پہلے کی تہذیب کو ہندوستانی تہذیب یا قومی تہذیب کا لقب دینا نامناسب ہوگا۔ سارا ملک مختلف علاقائی حکومتوں ہی میں بٹا ہوا نہیں تھا بلکہ بہت سے علاقائی تہذیبی منطقے بھی قائم تھے اور ان کے دھارے کبھی مل کر کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا کر بہہ رہے تھے۔ یہاں ہم صرف ان تہذیبی دھاروں کا ذکر کریں گے جنھوں نے براہِ راست اردو ادب کو متاثر کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تصوف کی مختلف شکلوں نے دنیائے خیال پر غلبہ حاصل کرلیا تھا اور مادی آسودگی کی تلاش سے دامن چھڑا کر صوفی منش بزرگوں اور فن کاروں نے درباروں کی چمک دمک کے بجائے جمہور سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ کبھی یہ اربابِ طریقت شریعت والوں کی نظروں میں کھٹکے کبھی اہلِ شریعت کے دوش بدوش آگے بڑھے۔ مذہب کا یہی وسیع تصور ۱۸۵۷ء سے قبل ہمارے نظامِ فکر کا محور قرار پاتا ہے۔ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی خواہ لکھنؤ ہو یا دہلی، ہر جگہ مذہبی تصورات ہیئت، فلسفہ، اخلاق، منطق، طب اور دوسرے تمام تر علوم پر حاوی نظر آتے ہیں۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اور خصوصاً گلستاں، بوستاں، اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ ناصری وغیرہ کلاسیکل تصانیف کے اثرات نمایاں طور پر مذہب کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

نئے سیاسی اور عمرانی حالات اس تعلیمی اور فکری سانچے میں پورے نہیں اُتر رہے تھے۔ اس دور کے علما اور بزرگوں کو اس بات کا احساس کسی نہ کسی شکل میں ہو چلا تھا کہ اس سماجی ڈھانچے میں کوئی انقلابی تبدیلی لانا ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب وہابی تحریک اور فرائضی تحریک ہر ایک نے اس بات پر زور دیا کہ سماجی نظام میں تبدیلی ضروری ہے اور عمل

کی جو قوتیں خوابیدہ ہوگئی ہیں ان کو پھر سے جگانا چاہیے۔ ان سب بزرگوں نے اس انحطاط اور بے عملی کا تجزیہ تصوراتی اور آدرش وادی سطح پر کیا۔ انھوں نے بدلے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے قدیم اصول کی طرف واپسی پر زور دیا۔ انھوں نے زوردار الفاظ میں قرآن اور اسلام کے بنیادی عقائد اور اصول پر پھر سے عمل کرنے کی دعوت دی گو اجتہاد کا دروازہ کھول کر انھوں نے ان اصول وضوابط میں تھوڑے بہت ردّوبدل اور ان کی تفسیر میں اختلاف رائے کی گنجائش پیدا کردی۔

ان لوگوں کو محض دقیانوسی اور رجعت پسند کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا۔ انھوں نے اقتصادی مساوات، سماجی انصاف اور عمل کی آواز بلند کی۔ انھوں نے اپنے دور کے عمرانی ڈھانچے کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا اور اس پر پوری شدت سے وار کیا، انھوں نے تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر پیش کر کے نجات کا ایک راستہ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی۔ ان کی آواز گویا تبدیلی کے احساس کی پہلی آواز ہے۔

ان آوازوں سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے۔ انگریز ہندوستان میں ایک بہتر صنعتی نظام لے کر داخل ہو رہے تھے اور ہندوستان کا عمرانی ڈھانچہ ٹوٹ رہا تھا۔ یہ عمرانی ڈھانچہ خود بخود مائل بہ انحطاط تھا اور اگر انگریز ہندوستان نہ آتے تو بھی اس ڈھانچے کا ٹوٹ جانا مسلّم تھا۔ اور سماجی نظام میں تبدیلی کا احساس انگریز اپنے دامن میں نہیں لائے یہ احساس سو فیصدی برطانوی تاجروں کی دین نہیں تھا بلکہ ان کے براہِ راست اثر انداز ہونے سے پہلے بھی تبدیلی کی ضرورت اور اس ضرورت کی اہمیت محسوس کی جانے لگی تھی۔

اس اندرونی احساس کے ساتھ ساتھ بہت سے خارجی عناصر بھی کام کر رہے تھے۔ سردست ہم اگر سیاسی صورتِ حال کو نظر انداز کردیں تو بھی خالص علمی اور ادبی سطح پر بہت کچھ تبدیلیاں ہونے لگی تھیں۔ انگریزی ۱۸۳۵ء میں سرکاری زبان مان لی گئی تھی اور یہ فتح اس نے سنسکرت اور فارسی کو شکست دے کر حاصل کی تھی۔ اگر لارڈ میکالے کی رپورٹ میں مشرقی علوم اور ادبیات کو اس قدر بُرا بھلا نہ کہا گیا ہوتا تو شاید انگریزی کی فتح اس قدر ڈرامائی نہ ہوتی۔ علاوہ بریں فورٹ ولیم کالج کے قیام نے بھی ادب کی رفتار کو بہت کچھ متاثر کیا گو جان گلکرسٹ کی پالیسی آخرکار میکالے اور اس کے ہم نواؤں کی مغربی سانچے میں ڈھالنے کی پالیسی کے آگے ترک کردی گئی، لیکن فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر میں خاص طور پر ایک

نیا آہنگ ضرور پیدا کردیا۔ مغربی اثرات بڑے آہستہ رو اور مدھم تھے لیکن سادگی پر زور، آراستہ اور پیراستہ عبارت کی صنعت گری کے بجائے نفسِ مضمون کی طرف توجہ اور ایک نئے ادبی معیار کی ابتدا ہونے لگی تھی، گو اس دور کے لوگوں کے نزدیک نہ یہ ادبی تھا نہ معیار۔

دہلی کالج اور اس کے انگلش انسٹی ٹیوٹ کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کلکتہ بک سوسائٹی مختلف موضوعات پر جو کتابیں انگریزی میں تیار کررہی تھی، وہ یہاں اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ پرسی ول اسپیر نے ٹھیک کہا ہے:

> ''انگریزی ادب نے جو اثرات بنگال میں چھوڑے تھے وہ بنیادی طور پر ادبی تھے۔ دہلی میں یہ اثر سائنٹفک تھا۔''

سی ایف انڈریوز نے دہلی کالج کے بارے میں جو تفصیلات بہم پہنچائی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں سب سے مقبول شعبہ سائنس ہی کا تھا۔ گو ادبیات کے نصاب میں گولڈ اسمتھ کی نظم 'مسافر' اور 'اجڑا ہوا گاؤں'، ملٹن کی نظم 'فردوسِ گم شدہ'، پوپ کی نظم 'انسان پر مضمون' اور نثر میں رچرڈسن کے انتخابات، بیکن کا 'علم کی ترقی' اور برک کے مضامین اور تقاریر شامل تھیں لیکن سائنس اپنی دل چسپی، مقبولیت اور ندرت کی حیثیت سے بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ سی ایف انڈریوز لکھتے ہیں:

> ''قدیم دہلی کالج کی تعلیم کا غالباً سب سے مقبول شعبہ وہ تھا جو سائنس سے متعلق تھا۔ اس میں طلبہ کو سب سے زیادہ دل چسپی تھی اور جلد ہی یہ شہر کے گھر گھر میں پھیل گئی جہاں نئے تجربے زیادہ سے زیادہ مرتبہ والدین کے سامنے دہرائے جاتے تھے''۔
> (بحوالہ 'ٹوائی لائٹ آف دی مغلس')

منطق اور فلسفے کے بارے میں بھی دہلی کالج کے طلبہ کا رویہ قابلِ توجہ ہے کیوں کہ یہ طلبہ کوئی معمولی طالب علم نہیں تھے ان میں اردو ادب کی جانی پہچانی شخصیتیں شامل تھیں جنھوں نے ادب کا رخ بدلا۔ سی ایف انڈریوز فلسفے کی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قدیم فلسفے کے نظریات جو کہ ارسطو کی تعلیمات کے ذریعے سے پڑھائے جاتے تھے، جدید سائنس کے زیادہ معقول اور تجربے کی کسوٹی

پر پورے اُترنے والے نظریات کے مقابلے میں ماند پڑنے لگے۔
دہلی کالج کے شعبۂ انگریزی اور مشرقی شعبے کے اعلا درجوں کے طالب
علم قدیم اعتقادات کا مضحکہ اڑاتے تھے مثلاً زمین کو کائنات کا غیر
متحرک محور تسلیم کرنے کی ہنسی اُڑائی جاتی تھی۔'' (ایضاً)

ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ یہ صرف ایک کالج کی داستان ہے۔ اس کالج کے طفیل نئی نسل میں مغربی اور سائنٹفک تصورات ہماری سوسائٹی میں راہ پانے لگے تھے مگر اس کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے چپّے چپّے میں نہ جانے کتنے ایسے مدارس تھے جو قدیم مشرقی تعلیم کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ ان مدارس میں نصابِ تعلیم کی بنیاد مذہب ہی تھا اور ان کی تعلیم میں گو سائنس کے نئے تصورات شامل نہیں تھے لیکن ایسی وسعت اور ہمہ گیری ضروری تھی جو بیک وقت منطق، اخلاق، ہیئت، فلسفہ، الٰہیات، طب اور دوسرے متعلقہ موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی تھی۔

یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے علوم وفنون اور قدیم نظامِ تعلیم اپنی صلاحیتیں ختم نہیں کر چکے تھے۔ اس برسے ہوئے بادل میں بھی نہ جانے کتنی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ دہلی کے اسی دور کو حالی نے ایک عظیم الشان دور قرار دیا ہے اور دہلی کو بغداد اور قرطبہ کے ہم رتبہ ٹھہرایا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب علمِ حدیث اور علمِ دین ہی میں نہیں شعر وادب میں بھی احیا کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور اس میں شک نہیں کہ شعر وادب کی آبیاری زیادہ تر یہی قدیم نظامِ تعلیم کر رہا تھا۔ اس دور کا غیر اہم سے غیر اہم شاعر بھی اس نظامِ تعلیم کی برکت سے اس دور کے مجموعی علم کا ہلکا سا تصور ضرور رکھتا تھا۔ ذوق کو اپنے عہد میں کبھی عالم یا منتہی نہیں سمجھا گیا لیکن ان کے 'سر بسترِ خوابِ راحت' والے قصیدے سے اندازہ لگایا جائے تو طب، ہیئت، منطق، نجوم اور دوسرے علوم متداولہ سے انھیں کم سے کم ابتدائی واقفیت ضرور تھی، دوسرے قصیدوں میں بھی یہی وسعت پائی جاتی ہے۔ مومن کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ طب اور نجوم دونوں میں کامل تھے۔ غالب کی تہ در تہ شاعری کا راز کسی نہ کسی حد تک اس میں پوشیدہ ہے ورنہ یہ شعر:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

'ہیولیٰ' کے واضح تصورات کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی کے وقت کا ذہنی پس منظر ہفت رنگ قوس قزح کی مانند نظر آتا ہے جس میں مختلف قسم کے رنگ غلبہ پانے کے لیے کشمکش کر رہے تھے۔ ایک طرف قدیم طرزِ معاشرت، طرزِ تعلیم اور نظامِ حکومت تھا جو عزیز ہوتے ہوئے بھی تمام تر تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا تھا، امن چین قائم نہ تھا۔ سیاسی استحکام نہ ہونے کی بنا پر اقتصادی سانچہ ڈانواڈول ہو رہا تھا اور ساری معاشرت میں ایک عجیب بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی جو سیاسی استحکام، امن چین اور صنعتی ترقی کے سامان لا رہی تھی وہ اپنے جلو میں لوٹ کھسوٹ، مذہب میں مداخلت اور سیاسی غلامی کی لعنتیں لے کر آ رہی تھی، گویا اس جنگ کے لڑنے والے ہیرو اور ولین اچھے اور بُرے دونوں عناصر سے مل جل کر بنے تھے اور ایسا جنگجو اور صاحب نظر جنگجو کوئی نہ تھا جو اس وقت کے تاریخی حالات سے ذرا بلند ہو کر اس کشمکش کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں میں امتیاز کر سکتا۔ نئے دور کا استقبال کرتا اور سیاسی غلامی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔

سیاسی اور انتظامی دونوں معاملات میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستانیوں نے بہت کچھ سیکھا۔ جو فوج ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں انگریزوں کے خلاف لڑی وہ عام ہندوستانی ریاستوں کی فوج سے مختلف تھی۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی پر دوبارہ ہندوستانی قبضہ ہو گیا تب بھی انتظامی امور بالکل اسی ڈھنگ پر چلتے رہے جو کمپنی نے قائم کیا تھا۔ گو مذہب اور شریعت کے احترام کے طور پر صدر الصدور کا تقرر کر دیا گیا تھا لیکن عملی طور پر عدالتیں ہی سارے معاملات کا تصفیہ کر رہی تھیں اور کوتوال حسبِ سابق شہر کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور کلکٹروں کی طرح افسران اضلاع میں رقم وصول کر رہے تھے۔ یہ قیاس کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں کے فتح یاب ہونے کی صورت میں جو سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ قائم ہوتا وہ کس حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ترقی یافتہ نظام اور طور طریقے کو اپناتا اور کس حد تک قدیم مغل یا ریاستی ڈھانچے سے مختلف ہوتا۔

اس سلسلے میں ایک انتظامی ندرت کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ شروع جولائی میں جب محمد بخت خاں دہلی پہنچے تو انھیں صاحب عالم بہادر کا عہدہ دیا گیا۔ یہ عہدہ اپنی نوعیت کا غالباً پہلا عہدہ تھا جس میں فوجی اور غیر فوجی دونوں طاقتوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

صاحب عالم بہادر دراصل ایک ایسی عدالتی جماعت کے نگراں تھے جس کے ذمے فوج اور شہری آبادی دونوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا شامل تھا۔ اس عدالتی جماعت میں چھ فوجی نمائندے اور چار شہر کے اکابر شامل تھے۔ یہ جماعت خود اپنا صدر منتخب کرتی تھی اور اس کے فیصلے صاحب عالم بہادر اور بادشاہ کی منظوری کے بعد عمل میں لائے جاتے تھے۔"

(بحوالہ پرسی ول اسپیر Twilight of the Mughals Page 206)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں خیال سے لے کر عمل تک ہر جگہ ۱۸۵۷ء تک ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں مغرب کی اثر پذیری اور قدیم طرزِ زندگی کی تبدیلی نمایاں طور پر محسوس کی جانے لگی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں آخری بار ہندوستان کے انگریز دشمن عناصر نے مل کر مقابلہ کیا۔ یہ عناصر مختلف اور متنوع تھے اور انگریز دشمنی کا مشترک رشتہ انھیں ایک دوسرے سے قریب لے آیا تھا۔ یہ اشتراک اس قدر گہرا اور قریبی تھا کہ اس نے وقتی طور پر ہی سہی سارے فروعی اختلافات کو مٹا ڈالا تھا۔ ہندو مسلم تنازعہ نے بعد کو ہندوستان کی سیاست میں بڑی ہلچل مچائی لیکن اس وقت اس تنازعہ کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بہادر شاہ کے دور میں مغل دربار میں ہندو اور مسلمان تہوار ایک ہی جوش خروش کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ دیوالی، ہولی اور عید کی رنگ رلیاں عام تھیں۔ محرم میں ہندوؤں کی شرکت اور بسنت میں مسلمانوں کی شرکت معمولی بات تھی۔ پھول والوں کی سیر اور پنکھا اٹھانے میں ہندو اور مسلمان دونوں ساتھ ساتھ موجود ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بعد جب عارضی طور پر دہلی میں ہندوستانی حکومت تھی۔ عیدالاضحیٰ کے موقعے پر گائے، بھیڑ اور بکری کی قربانی کی ممانعت خود بہادر شاہ نے اپنے فرمان کے ذریعے سے کی۔ بیل اور بھینسے کی قربانی ممنوع تھی۔ ایک طرف بخت خاں اور مرزا مغل ہندوستانی فوجوں کی رہبری کر رہے تھے تو دوسری طرف کرنل گوری شنکر دہلی میں اور نانا صاحب، جھانسی کی رانی اور تاتیا ٹوپے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں شانہ بہ شانہ لڑ رہے تھے۔

ہندوستان نے یہ لڑائی ہار دی اور اس پر سیاسی غلامی مسلط ہوگئی۔ یہ گویا غلامی کے خلاف آخری مضبوط مورچہ تھا۔ اس شکست نے اس عمل کو پورا کر دیا جو ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی سے شروع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شکست کے بعد انگریزوں کا جذبۂ انتقام بیدار ہوا اور فاتح فوج نے وہ مظالم کیے کہ ہلاکو اور چنگیز کے مظالم گرد ہو کر رہ گئے۔ اس دور میں اور اس

کے کافی عرصے بعد تک دیانت داری سے ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بارے میں خیالات کا اظہار کرنا ناممکن ہوگیا اس لیے اس دور کی اکثر یادداشتیں اور تذکرے اس بات کو ملحوظ رکھ کر پڑھنے چاہئیں کہ یہ سب بیانات مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر دیے گئے ہیں۔ اگر کہیں ان بیانات میں 'کالوں' کی لوٹ مار کا تذکرہ ملے یا ہندوستانی 'لٹیروں' کے خلاف نفرت کا جذبہ نظر آئے تو اس کی وجہ مصلحت بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لڑائی کے اس دور کے متعلق ہو، جب شورش پسندوں اور لٹیروں نے بدنظمی پھیلا رکھی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کی تصانیف نیم صداقتوں سے بھری پڑی ہیں اور اگر اس دور کی حقیقت کا کوئی سراغ مل سکتا ہے تو وہ صرف انھیں نیم صداقتوں کے راستوں سے ملے گا۔

ادبی مورخین ہوں یا تذکرہ نویس سب کی تصانیف میں ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو آخری جدوجہد ضرور ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس جدوجہد نے جہاں ہندوستانیوں کے اس غم و غصے کا بڑی حد تک اظہار کردیا جو غلامی کے خلاف امڈ رہا تھا، وہاں اس جدوجہد کے خاتمے نے یہ بات واضح کردی کہ اب برطانوی راج کو جلد ختم کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ نئے حالات کو آنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور ماضی خواہ کتنا ہی عزیز اور عظیم کیوں نہ ہو اسے سینے سے لگا کر نہیں رکھا جاسکتا۔ 'یادگار غالب' کے دیباچے میں حالی نے دہلی کے اس شاندار دور کا ماتم کیا ہے جو ختم ہوگیا اور اب کبھی واپس نہ آئے گا۔ مولانا محمد حسین آزاد 'آبِ حیات' کے لکھنے کا مقصد ہی یہ قرار دیتے ہیں کہ بزرگوں کی یادیں محفوظ کرلی جائیں کیوں کہ زمانہ ورق الٹ چکا ہے مذاق بدل گیا ہے اور کچھ دنوں بعد کوئی ایسا بھی نہ رہے گا جو قدیم سرمائے کو سینے سے لگائے اور اردو شاعری کے ذخیرے کو پھر سے کھنگالے اور جسے بزرگوں کے حالات اور واقعات سے دل چسپی ہو۔ یہی جذبہ تھا جس نے شبلی سے مختلف سوانح عمریاں لکھوائیں اور انھیں اسلام کے شاندار ماضی کی طرف متوجہ کیا۔

اس طرح ادبی تاریخ کے لیے ۱۸۵۷ء بہ یک وقت نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ اختتام بھی۔ اس منزل پر گویا نئے اثرات زمانے کی لگام اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور چند مذہبی رہنماؤں اور پختہ خیال قدامت پسندوں کے سوا زیادہ تر لوگ ۱۸۵۷ء کی شکست کو حتمی سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس عمرانی تبدیلی کو چار و ناچار قبول کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء صرف اسی لیے اہم نہیں ہے کہ اس نے ادب اور معاشرت کی پرانی بساط تہ کردی بلکہ اس لیے بھی اہم

ہے کہ اس لمحے سے ہمارے ادیبوں کو نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے اس شکست کو سنگین اور ناگزیر حقیقت مانا اور اپنے کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

حالؔی کی تصانیف میں یہ تصور سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ جیسا کہ احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حالؔی کے ہاں 'پیروئ مغرب' کوری مفاہمت ہی نہیں ہے بلکہ آگے بڑھنے کا ایک راستہ ہے۔ وہ کبھی کبھی آزادی کے خواب بھی دیکھتے ہیں کبھی کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ ہندوستانی انگریزوں کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر تعلیم، صنعت وحرفت اور سائنس کو اپنا کر ان سے آگے نکل جائیں گے اور ہندوستان غلامی میں حاصل کیے ہوئے ہتھیاروں سے آزادی کی منزل تک پہنچ جائے گا۔ شبلی کا تو سارا تصور ہی قومی اور انقلاب دوستی کا رہا ہے۔ انھوں نے مغربیت کے آگے مکمل طور پر ہتھیار نہیں ڈالے اور مشرقی علوم کی قدر و منزلت اور مشرق کی عظیم روایات سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ سیرت نگاری سے شبلی کا مقصد آزادؔ کی طرح صرف مقدس یادگاروں کو جمع کر لینا نہیں تھا بلکہ ان عظیم شخصیتوں کو مثالی کرداروں کی حیثیت سے پیش کرنا بھی تھا اور اس طرح گویا حال کی تاریکی میں ماضی کی شمعوں سے مستقبل کے لیے راستہ دکھانے کا کام لینا تھا۔

نذیر احمد چوں کہ داستان طراز اور ناول نگار تھے لہٰذا اس ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کی کشمکش ان کے یہاں نکھر کر سامنے آئی ہے۔ 'توبۃ النصوح' کا کلیم ایک ایسا کردار ہے جس میں وہ تمام ہنر ہیں جو کبھی بڑی خوبیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مغربیت اور نئی روشنی کا اس میں کچھ کوئی اثر ہے تو یہی کہ وہ روزہ نماز کا قائل نہیں اور مذہبی رسوم وفرائض کو ڈھکوسلہ سمجھتا ہے۔ نذیر احمد کی کردار نگاری کا یہ بڑا کرشمہ ہے کہ وہ اس دور میں عہد جدید کے نمائندہ نوجوان کا تصور کر سکے۔ آج کے نوجوان میں کلیم کا سا شاعرانہ کمال نہ سہی لیکن اس کی روح کی بے چینی ضرور موجود ہے۔ اس کی کم اعتقادی موجود ہے اور وہ رندی اور سرمستی موجود ہے جو اسے نہ تو پرانی دنیا سے پوری طرح سمجھوتہ کرنے دیتی ہے اور نہ نئے نظام کا ایک پرزہ بن کر جینے پر رضامند ہونے دیتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ نمایاں طور پر 'بنات النعش'، 'مرأۃ العروس'، 'ایامیٰ' اور 'ابن الوقت' میں نذیر احمد معاشرت کے اسی بحران کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس بحران کا

راستہ وہ سلیقہ مندی میں ڈھونڈ نکالتے ہیں اور 'ابن الوقت' کے کردار مولوی حجۃ الاسلام کی طرح انگریزوں کی خیر خواہانہ ملازمت اور مذہب کے ظاہری شعائر کی پابندی دونوں میں توازن قائم کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی 'ابن الوقت' کے سارے نشیب و فراز کے پس منظر کی حیثیت سے موجود ہے اور یہاں بھی وہی ناگزیر سمجھوتے کی کیفیت نمایاں ہے۔ یہی اثرات اس دور کے بہت سے دوسرے ادیبوں کے ہاں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی نے سرسیّد احمد خاں کے اندازِ فکر کو بدل دیا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دہلی کو تاراج ہوتے دیکھا، بجنور کو مٹتے دیکھا، مرادآباد میں انگریزوں کے ظلم و تعدی کا ننگا ناچ دیکھا اس کے باوجود کہ سرسیّد ہندوستانی مجاہدوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ سرسیّد نے 'اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھ کر دنیا کو یہ ضرور جتلادیا کہ اس لڑائی کی ساری ذمہ داری ہندوستانیوں کے سر نہیں تھی اس کے پیچھے ناانصافیوں کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ اس سلسلے کا سرسیّد کوئی معقول اور انقلابی حل نہ پیش کرسکے۔ انھوں نے انگریزی تعلیم میں ملک کی نجات دیکھی اور تاریخ کے نئے سانچے میں ڈھل جانے ہی کا مشورہ دیا۔

اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی اور شکست نے اردو ادب کو اور بھی کئی حیثیتوں سے براہِ راست متاثر کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کے دبستان کسی نہ کسی حیثیت سے ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ ایک طرف لکھنؤ میں شاگردانِ آتش میرؔ کا نام لینے لگے تھے، دوسری طرف دہلی میں مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ سے لے کر نوعمر داغؔ تک لکھنؤ کے زیر اثر زبان کے چٹخارے، محاورہ بندی، واسوخت کے انداز اور صنعت گری اور خیال بندی کی طرف توجہ کررہے تھے۔

مومنؔ کے اشعار کی پیچ در پیچ ساخت اور واسوخت کا گہرا رنگ اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ ذوقؔ کی محاورہ بندی، ضرب الامثال کی طرف رغبت اور زبان سے دل چسپی بھی اسی پرتو کا نتیجہ قرار پاتی ہے۔ یہ اثر شاہ نصیر سے ان تک پہنچا اور ان سے بہادر شاہ ظفرؔ اور مرزا خاں داغؔ تک آیا۔ خود غالبؔ کے کلام میں صنعت گری اور دشوار پسندی کا جو رجحان آیا اس میں بیدلؔ ہی کا اثر نہیں تھا، لکھنؤ کے اثرات کا بھی ہاتھ تھا۔ غالبؔ جیسا خوددار اور انفرادیت پسند شاعر ناسخؔ کے مصرعے پر مصرعہ لگاتا ہے اور اسی زمین میں اسی انداز کی غزل کہتا ہے۔ کیا یہ شعر لکھنؤ کے دبستان کی یاد نہیں دلاتے؟

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

یہ شاعری خواہ وہ لکھنو ہو یا دہلی دربار کے محور پر گھوم رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی آوازیں صرف دربار کے گنبد میں قید نہ تھیں اور شہر کے کوچہ و بازار، محلے اور بستیاں اس رنگ میں رنگ گئی تھیں پھر بھی تہذیب اور معاشرت کا آدرش دربار ہی تھا اور علم و فضل، شرافت اور نجابت کا معیار دربار ہی کی فضا میں ڈھلتا تھا۔ ۱۸۵۷ء نے اس محور کو حتمی طور پر شکست کر دیا۔ بہادر شاہ کی آواز اپنی شکست کی آواز ہی نہ تھی ایک دور کی شکست کی آواز تھی۔

دربار اور ادب کے رشتے کا خاتمہ دراصل ایک نئی ادبی فضا کے قیام کا پیش خیمہ تھا۔ گو اس کے بعد بھی عارضی طور پر رام پور، منگرول اور حیدرآباد کی ریاستوں نے شاعروں کی دست گیری کی لیکن اب شاعری کی عنان درباروں کے ہاتھ میں نہ تھی، اب ادب کی باگ ڈور متوسط طبقے کے ہاتھ میں آگئی تھی جو نوکر پیشہ تھا اور اس نئے نظام میں کسی نہ کسی طرح اپنے لیے موزوں جگہ پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی سوتے سے شاعری میں نئی آوازیں داخل ہوتی ہیں اور مغربی ادبیات کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے۔ حالی، شبلی، سرسیّد، آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ سب کے سب ایسے لوگ تھے جو دربار سے منسلک نہ تھے اور نہ درباداری کے طور طریقوں کو سینے سے لگائے رکھنے پر آمادہ تھے۔

نظامِ معاشرت کی یہ تبدیلی آہستہ آہستہ اور بھی نمایاں ہونے لگی۔ تعلیم اور صنعت و حرفت پر زور دیا جانے لگا۔ اور جاگیردار گھرانوں میں بھی نوکری اور نئی تعلیم کے چرچے ہونے لگے۔ داستانوں میں میر داستان کا تاج شہزادوں اور بادشاہوں کے سر سے اُتار کر متوسط طبقے کے گھرانوں کے حصے میں دے دیا گیا۔ اس نئی ادبی فضا نے کون سے رُخ اختیار کیے یہ

جدید اردو ادب کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اس فضا کا نقطۂ آغاز ۱۸۵۷ء ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

نظامِ تعلیم کی تبدیلی کا ذکر ضمناً آچکا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ نئے نظامِ تعلیم نے انگریزی اور مغربی سائنس پر زور دے کر نئی نسل میں ایک جذباتی تضاد کے دروازے کھول دیے۔ ایک طرف تو وہ انگریزی ادبیات کا مطالعہ اس کے تہذیبی اور روایتی پس منظر کو سمجھے بغیر کر رہے تھے اور اس طرح اس سے بہت سطحی واقفیت رکھتے تھے، دوسری طرف انگریزی ادبیات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ معاشرت اور رہن سہن کا مغربی تصور بھی نئی نسل کی جذباتی تشکیل میں شامل ہوتا جارہا تھا۔ اس طرح مغربی تصور اور مشرقی حقیقت میں وہ کشمکش شروع ہوئی جس کا نشان موجودہ نسل میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ اس جذباتی خلا کی ابتدا تھی جس کے نیم دائرے سے سو سال بعد تک کے ہندوستانی نوجوان باہر نہیں نکل سکے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی کو جو لوگ جنگِ آزادی ماننے سے انکار کرتے ہیں وہ 'دین، دین' کے نعروں کو بھی ثبوت میں پیش کرتے ہیں اور اسے بنیادی طور پر ایک مذہبی لڑائی بتاتے ہیں جو سور اور گائے کی چربی کے کارتوسوں سے شروع ہوئی اور 'دین، دین' کے نعروں کے درمیان لڑی گئی۔ اس اعتراض کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل اور اس کے بعد مذہب کی اہمیت میں انقلابی فرق ہوا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل مذہب محض ایک شخص کی خود اعتقادی کا نام نہ تھا نہ اسے نجی حیثیت حاصل تھی بلکہ مذہب ساری معاشرت، نظامِ تعلیم اور ترتیبِ اقدار کا محور ہوگیا تھا۔

اخلاق کا تصور مذہب کے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ منطق اور فلسفہ، ہیئت اور سیاست غرض ہر ایک شعبے پر مذہبی تصورات حاوی تھے۔ ان مذہبی تصورات کو فرقہ واریت نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ان میں اپنے دین کی حمایت کا حوصلہ تو تھا لیکن دوسرے مذہبوں کی مخالفت اور دوسرے فرقوں کو کچل ڈالنے کا جذبہ نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں یہ مرکزی حیثیت ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے تمام علوم وفنون ایک جداگانہ حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ سائنس اور مغربی تصورات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس کے نتیجے کے طور پر جہاں زیادہ سائنٹفک حقائق نے ہمارے نظامِ تعلیم میں جگہ پائی وہاں وہ قدیم علوم

ماند پڑ گئے جنھوں نے صدیوں تک اردو شعر و ادب کی آبیاری کی تھی۔ اب مذہب سماجی نظام کا مرکزِ ثقل نہ رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے لوگوں کے لیے شاید یہ تعجب کی بات ہو کہ ۱۸۵۷ء کی سیاسی لڑائی میں 'دین، دین' کے نعرے بلند کیے گئے، لیکن ان لوگوں کے لیے یہ حیرت کی بات نہیں ہے جنھوں نے مذہب کو سماجی اقدار کے محور کے روپ میں دیکھا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد اور اس کی ناکامی کی ایک اور دین بھی ہے، اس نے پہلی بار گورے اور کالے کا تصور اس شکل میں پیدا کیا کہ اس سے قومی احساس بیدار ہوا اور ایک ملّی یگانگی کا شعور پیدا ہوا۔ لڑائی کے دوران میں صرف ایک تقسیم روا تھی اور یہ گورے اور کالے کی تقسیم تھی۔ مذہب، نسل، صوبہ اور فرقہ کی ساری تقسیمیں اٹھ گئی تھیں اور قومیت کا دھندلا سا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ اس لڑائی کی ناکامیابی کے بعد بھی انگریزوں کے تشدد اور ظلم کے سلسلے میں یہی تقسیم ملحوظ رکھی گئی۔ آہستہ آہستہ قومیت کا احساس بیدار ہونے لگا۔ اس شکست سے ہندوستانیوں نے بہت کچھ کھویا اور بہت کچھ سیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ شکست دراصل ایک انحطاط پذیر نظام کی شکست ہے اور جب تک یہ نظام بہتر اور زیادہ طاقت ور نہیں ہوتا اس وقت تک برطانوی حکومت کو حکیم احسن اللہ، مرزا الٰہی بخش اور رجب علی جیسے لاتعداد غدار مل سکتے ہیں۔

تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے ۱۸۵۷ء کی لڑائی تبدیلی کی ضرورت کے احساس کا نقطۂ عروج تھی اور یہ احساس شاہ ولی اللہ اور وہابی تحریک کے وقت سے مختلف شکلوں میں رونما ہو رہا تھا۔ اس لڑائی نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو بدل دیا بلکہ اس کی ذہنی تاریخ میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا اور نظامِ تعلیم، معاشرت، اخلاق، غرض زندگی کی ساری قدروں میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

احتشام حسین نے غالبؔ کی ندرتِ فکر کا ماخذ تلاش کرنے کی کوشش میں ان کے سفرِ کلکتہ کو بڑی اہمیت دی ہے کیوں کہ کلکتہ اس وقت برطانوی سیاست اور معاشرت کا مرکز بن چکا تھا اور یہیں آ کر غالبؔ کو ایک نئے طرزِ زندگی کا احساس ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد اور اس کی ناکامی نے سارے ہندوستان میں کلکتے کی سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال کو عام کر دیا۔ جدوجہد کی ناکامی نے قدیم ناگزیر انحطاط اور مغربی اثرات کے ناگزیر استحکام کو قبول کرنے

(باقی صفحہ ۳۰۶ پر)

اسرار احمد آزاد

قومی جدوجہد کے ڈھائی سو سال

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے واقعات نگار اس جنگ یا جدوجہد کو ۱۸۵۷ء کے خونیں واقعات سے شروع کرتے ہیں اور اس طرح ہماری قومی جدوجہد کا زمانہ صرف نو دہائیوں میں محدود ہوکر رہ جاتا ہے لیکن یہ ایک تاریخی غلطی ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان کی قومی جدوجہد کا سلسلہ ڈھائی سو سال تک قائم رہا ہے۔

ہندوستان کی مغل حکومت کا زوال تو اٹھارہویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد شروع ہوا تھا، اس زمانے میں ملک بدنظمی اور طوائف الملوکی کا میدان بن گیا تھا، حکومت وسلطنت کے حصول کے بہت سے خواہش مند پیدا ہوگئے تھے اور انھیں واقعات وحالات کی بدولت بدیسیوں اور خصوصاً انگریزوں کو اس ملک میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے دلوں میں اپنی قومی اور وطنی آزادی کو بحال اور برقرار رکھنے کا جذبہ بھی موجود تھا حتیٰ کہ ہندوستان کی مسخ شدہ تاریخ بھی اس حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کرسکتی کہ نواب سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کی تمام تر جدوجہد اور سرفروشی کا مقصد ہندوستان کو غیر ملکیوں کے تسلط اور اقتدار سے محفوظ رکھنا تھا۔

دوسرے الفاظ میں اس طرح کہنا چاہیے کہ اٹھارہویں صدی کے آغاز سے اگست ۱۹۴۷ء تک ہماری قومی جدوجہد کا جو سلسلہ قائم رہا تھا وہ دو ادوار میں منقسم ہے۔ اس جدوجہد کا پہلا دور ۱۸۵۷ء کی ناکامیاب خونیں کوشش پر ختم ہوگیا تھا اور دوسرا دور ۱۸۵۷ء کے

واقعات کے بعد شروع ہو کر مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ختم ہوا۔ پہلے دور میں چوں کہ برائے نام اور زوال پذیر ہی سہی لیکن ہندوستان کی مرکزی حکومت موجود تھی اس لیے اس تمام تر جدوجہد کا نصب العین اس مرکزی حکومت کا تحفظ رہا تھا اور چوں کہ دوسرے دور میں وہ مرکزی حکومت موجود نہیں رہی تھی اس لیے ہماری قومی جدوجہد کا مقصد انقلابِ حکومت بن گیا تھا، لیکن چوں کہ دونوں ادوار کی وطن پرورانہ تحریکات کا بنیادی مقصد بدیسی اقتدار کی مخالفت تھا۔ اس لیے قومی جدوجہد کا احاطہ کرتے ہوئے پہلے دور کی تحریکات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغلوں کی حکومت کا زوال شروع ہوا اور ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے امکانات نظر آنے لگے تو مسلمان اور خصوصاً مسلمان علما ہی اس صورتِ حال سے نسبتاً زیادہ متاثر بھی ہوئے اور جیسا کہ آئندہ سطور سے معلوم ہوگا، حالات کے تقاضوں کے مطابق انھوں نے قومی جدوجہد کے پہلے دور میں بلا امدادِ غیرے اسے اپنی کوششوں سے برپا رکھا اور دوسرے دور کے نصف ابتدائی حصے میں بھی جب کہ انقلابِ حکومت کی مختلف تحریکات کے مابین کوئی ربط اور تعلق موجود نہیں تھا، وہ اپنے ڈھنگ پر حصولِ مقصد کے لیے سرگرمِ کار رہے مگر ان کی ان سرگرمیوں کا مقصد مسلمانوں کی حکومت کو برقرار رکھنا یا ۱۸۵۷ء کے بعد اُسے ازسرِنو قائم کرنا نہیں تھا بلکہ وہ ہندوستان میں اس پُرانی حکومت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے جسے ایک طرف تو مسلمان علما کا ایک قابلِ ذکر گروہ غیر اسلامی حکومت تعین کرتا تھا اور دوسری طرف جس کے تحت اس ملک کے تمام باشندے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کے بعد وہ جداگانہ طور پر جو کچھ کرتے رہے اس کا مقصد بھی ہندوستان میں ازسرِنو مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا نہیں تھا اور اگرچہ اس زمانے میں جمہوریت کا تصور آج کی طرح واضح نہیں تھا لیکن جیسا کہ آئندہ سطور سے معلوم ہو سکے گا وہ انقلاب حکومت کے بعد ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جس کے ماتحت ہندوستان کے تمام باشندے مساوی حیثیت سے امن اور خوش حالی کی زندگی بسر کر سکتے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا اور یہی بات اس حقیقت کی شاہد ہے کہ پہلے دور میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی اس ملک کی مرکزی حکومت کی بقا کے مقصد پر متفق الرائے تھے۔

قومی جدوجہد کا پہلا دور

سطورِ بالا میں بتایا جاچکا ہے کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کا زوال اٹھارہویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں شروع ہوا تھا۔ اسی زمانے سے مغربی نوآبادیات خواہوں اور خصوصاً انگریزوں نے اس ملک میں اپنے قدم جمانے شروع کیے تھے اور اسی وقت سے آزادیِ وطن کی بقا کی جدوجہد بھی شروع ہوگئی تھی۔

ہندوستان کی مرکزی حکومت کی زوال پذیری اور اس ملک میں بدیسی حکومت کے قیام کے امکانات نے سب سے پہلے جن حضرات کو متاثر کیا تھا وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور اُن کے رفقائے کار تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے ہندوستان کی آزادی کی جو تحریک شروع کی تھی وہ ہماری قومی جدوجہد کے ہر دور اور ہر مرحلے میں اس پر اثر انداز رہی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریکِ آزادی

یہاں حضرت شاہ صاحب کی شخصیت کے تعارف اور ان عوامل و محرکات کی وضاحت کی گنجائش نہیں جنھوں نے موصوف کو بدیسی اثر ونفوذ کی مخالفت اور مرکزی حکومت کی بقا کی جدوجہد پر آمادہ کیا تھا البتہ اس قدر بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عالمگیر کی وفات سے لے کر شاہ عالم ثانی تک دہلی کے دس سلاطین کے زوال پذیر زمانے کو دیکھا تھا اور انھیں حالات نے موصوف کو ہندوستان کی آزادی کی بقا کی منظم تحریک شروع کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

حضرت شاہ صاحب کی تحریکِ آزادی اور اس کے فلسفے کو ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ آزادی کی عالمی تحریکات میں ایک نمایاں اور مستقل حیثیت حاصل ہے مگر چوں کہ یہاں اس تحریک کی وضاحت مدنظر نہیں اس لیے یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تحریک اٹھارہویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں شروع ہوچکی تھی۔ پلاسی اور سرنگاپٹم کی لڑائیاں جن کے انجام نے اس ملک میں انگریزوں کی حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا، اٹھارہویں صدی کے وسط اور اواخر میں برپا ہوئی تھیں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ پلاسی کی لڑائی سے بہت پہلے حضرت شاہ صاحب کی تحریک کے داعی ملک کے گوشے

گوشے میں پھیل چکے تھے اور انھوں نے قریہ قریہ میں پہنچ کر لوگوں کے دلوں میں بدیسی اقتدار کی مخالفت اور ہندوستان کی مرکزی حکومت کی بقا وحفاظت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

مولانا سیّد احمد بریلوی کی فوجی تنظیم

سطورِ بالا میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریکِ آزادی کا تذکرہ کیا جاچکا ہے، لیکن تاریخی واقعات کے سلسلے کو قائم رکھنے کے لیے یہاں یہ بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسی تحریک کے ایک ممتاز علمبردار حضرت مولانا سیّد احمد صاحب نے عظیم آباد (پٹنہ) میں ایک فوجی مستقر بھی قائم کیا تھا اور چوں کہ یہ حضرات اس وقت کے حالات کے پیش نظر ایک طرف تو اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ملک کے اندر بدیسی اثر ونفوذ کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے کے علاوہ انھیں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کی طرف سے بھی اس ملک پر حملہ کرنا چاہیے اور دوسری طرف اس وقت پنجاب پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہوچکی تھی اور ملک کا یہ حصہ مرکزی حکومت سے علاحدہ ہوگیا تھا اس لیے انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں حضرت مولانا سیّد احمد صاحب اور ان کے بہت سے رفقائے کار شمال مغربی سرحد پار کر کے آزاد قبائل کے علاقے میں چلے گئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں جہاد کی اس تحریک کا رخ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی جانب رہا تھا لیکن اس کی تہ میں دہلی کی مرکزی حکومت کے اقتدار کو بحال کرنے ہی کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ چناں چہ پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد مولانا سیّد احمد صاحب کی جماعت براہِ راست انگریزوں کی حکومت کی مخالفت کرنے لگی تھی۔ جس کے نتیجے میں ۱۸۶۴ء میں اس تحریک کے ساتھ تعلق رکھنے والے پنجاب، یوپی اور بہار کے متعدد مسلمانوں کے خلاف انبالہ میں سازش اور بغاوت کا مقدمہ چلا کر انھیں سزائے موت دی گئی تھی اور چوں کہ ان حضرات نے اس حکم پر مسرت کا اظہار کیا تھا اس لیے صرف ان کی اس مسرت کو مجروح کرنے کی نیت سے بعد میں سزائے موت کو کالا پانی کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اسی سال پٹنہ میں بھی اسی قسم کا ایک مقدمہ چلا کر بہت سے ممتاز مسلمانوں کو موت، جلاوطنی اور قید کی سزائیں دی گئی تھیں۔

دوسرا دور

ہماری قومی جدوجہد کا دوسرا دور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد شروع ہوا اور

چوں کہ ایک طرف تو اس دور میں ہماری جدوجہد کو بہت سے موڑوں سے گزرنا پڑا تھا، دوسری طرف بہت سی متفرق تحریکات نے آزادیِ وطن کی تحریک کو مضبوط اور مستحکم بنایا تھا، تیسری جانب اسی دور میں ہماری جدوجہد نے نظری اور عملی طور پر ایک واضح اور مستقل شکل اختیار کی تھی اور کامیابی پر ختم ہوئی تھی اس لیے قومی جدوجہد سے متعلق اس دور کے واقعات کسی قدر تفصیل کے محتاج ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے انجام نے ایک طرف تو ملک کی مرکزی حکومت کو ختم کر کے اس کی جگہ انگریزوں کی حکومت قائم کر دی تھی اور دوسری طرف ان کے شدید ترین مظالم نے بظاہر قومی جدوجہد کو افسردہ کر دیا تھا۔

ہماری قومی جدوجہد کی افسردگی کا یہ زمانہ دو دہائیوں سے زیادہ مدت تک قائم نہیں رہا لیکن اس زمانے میں مستقبل کے لیے قومی جدوجہد شروع کرنے کی غرض سے جو کچھ کیا جاتا رہا وہ بجائے خود اس راہ میں ایک اہم اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد پیش آنے والے واقعات کے فوراً بعد چوں کہ انقلابِ حکومت کے لیے قوت کا منظم استعمال ممکن نہیں ہوسکتا تھا مگر انقلابِ حکومت کے جذبے کو قائم رکھنا بھی ضروری تھا، اس لیے ایک جانب تو ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۶ء میں سہارن پور اور دیوبند میں مظاہر العلوم اور دارالعلوم کے نام سے دو ایسی عربی درس گاہیں قائم کی گئیں جن کا ظاہری مقصد مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو مغربی تعلیم کے اثرات سے محفوظ رکھنا تھا۔ لیکن درحقیقت ان مدارس اور خصوصاً دارالعلوم دیوبند کے بانی اور رفقائے کار جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں عملاً حصہ لے چکے تھے، ان درس گاہوں کو انقلابِ حکومت کی 'مذہبی سیاسی' تحریک کا مرکز بنانا چاہتے تھے اور دوسری طرف ۱۸۸۴ء میں 'انڈین نیشنل یونین' کے نام سے اس جماعت کا قیام عمل میں آیا جو دوسرے ہی سال 'انڈین نیشنل کانگریس' کے نام سے موسوم کی جانے لگی اور جس کے پرچم کے سایے میں قومی آزادی کی وہ جدوجہد جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں شروع ہوئی تھی، اگست ۱۹۴۷ء کے وسط میں کامیابی کی منزل تک پہنچی۔

پھر یہی وہ زمانہ بھی تھا جب کہ اگرچہ ہماری قومی جدوجہد کو ہنگامی صورت سے گزرنا نہیں پڑا تھا، لیکن اس کا مستقل متعین اور واضح ہوتا جا رہا تھا۔ چناں چہ اسی زمانے میں مسلمان علماء نے ایک جانب تو انگریزی تعلیم کو خلافِ مذہب قرار دے کر انگریزوں کی حکومت کی

مخالفت کے جذبے کو برقرار رکھا تھا اور دوسری طرف جب 'انڈین نیشنل کانگریس' کا قیام عمل میں آچکا تو ہندوستان کے ان مسلمان علماء کی تحریک پر جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریکِ آزادی کے ساتھ وابستہ تھے، ۱۸۸۶ء میں ایک ہزار علماء نے 'نصرت الابرار' کے نام سے ایک فتویٰ جاری کر کے مسلمانوں کو کانگریس مین شرکت کی دعوت دی تھی۔

یہ فتویٰ ۱۸۹۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مسٹر ساور کر نے اپنی کتاب 'وار آف انڈی پنڈنس' اور صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب نے اپنی کتاب 'ہندوستان کا مستقبل' میں تفصیل کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس فتوے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تحریکِ آزادی کا بنیادی مقصد اس ملک کی قومی جدوجہد کو اہلِ ملک کے تعاون سے کامیاب بنانا اور ملک میں مشترکہ حکومت قائم کرنا تھا۔

بین اقوامی حالات کا ردِ عمل

کسی ایک ملک پر دوسرے ملکوں میں پیش آنے والے واقعات کا جو ردِ عمل ہوتا ہے آج اسے ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے لیکن پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے تک اجتماعی زندگی کا یہ پہلو واضح نہیں ہوا تھا اس کے باوجود ایک ملک کے حالات دوسرے ملکوں میں رونما ہونے والے واقعات سے متاثر ضرور ہوتے تھے۔

ہندوستان کی قومی جدوجہد بھی بین اقوامی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ چناں چہ موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں ترکی کو، جو اس زمانے میں مسلمانوں کی مادی اور روحانی قوتوں کا محور سمجھا جاتا تھا، بلقانی ریاستوں اور روس کے خلاف جو لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں اور ان میں برطانیہ نے ترکی کی مخالفت میں جو حصہ لیا تھا اس کی بدولت ہندوستان کی انگریزی حکومت کے خلاف یہاں کے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے تھے اور وہ اس نتیجے پر تھے کہ ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت کے خاتمے سے پہلے انھیں عالمِ اسلام کے معاملات میں مداخلت سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسلامی ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کا انحصار ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کی بحالی پر ہے۔

اسی عقیدے کے تحت ۱۹۱۵ء کے آغاز میں لاہور کے متعدد کالجوں کے پندرہ طلبہ شمال مغربی

سرحد کے پار اس علاقے میں چلے گئے تھے جو انیسویں صدی سے مولانا سیّد احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد کا مرکز بنا رہا تھا اور اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے رولٹ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ — لاہور سے پندرہ طلبہ کا چلا جانا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ نصف صدی پیشتر کی طرح آج بھی اس ملک میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو اس بات کی تبلیغ کرتے ہیں کہ نجات کا واحد ذریعہ اس ملک کی کافر حکومت سے جنگ کرنا اور اس مقصد کے لیے سپاہی بھرتی کرنا یا روپیہ فراہم کرنا ہے۔ اسی سال راجہ مہندر پرتاپ، مولانا برکت علی بھوپالی اور مسٹر ساور کر وغیرہ بھی ہندوستان سے چلے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

رولٹ رپورٹ کے اقتباسات

انھیں سطور میں کسی جگہ بتایا جا چکا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں ہماری قومی جدوجہد پر افسردگی کا جو زمانہ گزرا تھا اس کی مدت دو دہائیوں سے زیادہ نہیں تھی اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ مدت بھی مستقبل کے لیے اس جدوجہد کی ازسرِنو تنظیم میں صرف ہوئی تھی اور اس مدت کے خاتمے پر لیکن ۱۹۱۹ء کے پہلے تک اس جدوجہد کی جو نوعیت اور رفتار رہی تھی اس کی تاریخ بہت طویل ہے اور ابھی تک آزاد ہندوستان کا مورخ اسے مرتّب نہیں کر سکا۔ لیکن حکومت ہند کی دستاویزات میں جس طریقے پر اس کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے اس کی ہمہ گیری کا اندازہ لگا لینا کچھ دشوار کام نہیں۔

دسمبر ۱۹۱۷ء میں حکومتِ ہند نے 'ہندوستان میں سیاسی انقلاب کی تحریکوں سے متعلق مجرمانہ سازشوں کی اصلیت اور وسعت' کی تحقیقات کے لیے 'رولٹ کمیشن' کے نام سے ایک تحقیقاتی مجلس مقرر کی تھی۔ اس مجلس نے جنوری ۱۹۱۸ء سے ۱۵/اپریل ۱۹۱۸ء تک چھیالیس نشستوں میں بنگال، مدراس، بمبئی، بہار، اڑیسہ، صوبہ متوسط، یوپی، پنجاب اور برما کی حکومتوں نیز حکومتِ ہند اور بہت سے غیر سرکاری اداروں اور افراد کی تحریری اور زبانی شہادتوں کی بنیاد پر جو رپورٹ مرتّب کی تھی وہ ہندوستان کی تحریکِ انقلاب کی ایک مستند اور مبسوط دستاویز ہے اور یہاں اس کے چند مختصر اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

بمبئی

رولٹ رپورٹ میں سب سے پہلے بمبئی کی انقلابی تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ

—— مغربی ہندوستان میں باغیانہ تحریکات کے آثار ابتدا میں گنپتی دیوتا اور شیواجی کی یاد میں منعقد ہونے والے دو میلوں میں رونما ہوئے تھے۔ شیواجی کی یاد میں منعقد ہونے والے میلے میں جو اشلوک پڑھے جاتے تھے اُن کا مفہوم یہ تھا کہ ''محض شیواجی کی کہانی سنا دینے ہی سے آزادی حاصل نہیں ہوجاتی بلکہ لوگوں کو شیواجی کی طرح جانبازی کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے، لوگوں کو ڈھال اور تلوار سے مسلح ہونا چاہیے کیوں کہ ہم نے دشمن کو برباد کردینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ہم قومی جنگ کے میدان میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیں گے اور زمین کو ان دشمنوں کے خون سے سرخ کردیں گے جو ہمارے مذہب کو ناپاک کررہے ہیں۔''

گنپتی دیوتا کے میلے پر خصوصیت کے ساتھ جو اشلوک پڑھا جاتا تھا اس کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ ''افسوس! تم کو اپنی غلامی پر ذرا بھی رنج نہیں ہوتا... مرجاؤ مگر مرنے سے پہلے انگریزوں کو ٹھکانے لگادو... یہ ہندوستان ہے پھر اس پر انگریزوں کا تسلط کیوں؟''

بنگال

بنگال کے متعلق اس رپورٹ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صوبہ اس زمانے میں انقلابی تحریکات کا مرکز بنا رہا تھا۔ چناں چہ اس کے متعلق رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ ''لوگ بادشاہ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے اسلحہ جمع کرتے تھے اور آتش گیر مادے استعمال کرنے کے لیے بھی تیار تھے۔ کلکتہ اور دوسرے مقامات میں تعلیم یافتہ نوجوانوں نے انقلابی تحریکات کے مرکز قائم کررکھے تھے۔''

اس صوبے کے متعلق مزید لکھا ہے کہ ''انقلابی مرکزوں سے ایسے کتابچے اور اخبارات شائع کیے جاتے تھے جن میں اسلحہ اور بموں کے استعمال کی ہدایتیں درج ہوتی تھیں۔'' اور اسی رپورٹ میں شامل شدہ ایک خط کے پیش نظر رولٹ کمیشن اس نتیجے پر بھی پہنچا تھا کہ ''ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے متوازی آزاد ہندوستان کی حکومت بھی قائم تھی اور اس کے ماتحت صوبائی حکومتیں بھی موجود تھیں۔''

پنجاب اور دہلی

رولٹ رپورٹ میں بنگال کے بعد پنجاب کو انقلابی تحریکات کا مستقر تسلیم کیا گیا تھا اور لکھا

تھا کہ ''امرتسر اور فیروز پور میں حکومت کے خلاف غیر وفاداری کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ راولپنڈی، سیال کوٹ اور لائل پور میں علی الاعلان انگریزوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی ترغیب دی گئی تھی اور لاہور کا بھی یہی حال تھا۔ سیاسی کارکنوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت کو ختم کرنے کا واحد طریقہ ان کے خلاف فوج میں نفرت پیدا کرنا ہے اسی لیے وہ فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو ملازمت چھوڑ دینے کا مشورہ دیتے تھے۔

رولٹ رپورٹ کے مطابق دہلی بھی ان انقلابی تحریکات کے اثر سے محفوظ نہیں تھا۔ چناں چہ دسمبر ۱۹۱۲ء میں چاندنی چوک میں لارڈ ہارڈنگ کے جلوس پر جو بم پھینکا گیا تھا وہ بھی انھیں تحریکات کا نتیجہ تھا۔ اس سلسلے میں ''دہلی کا مقدمہ سازش'' چلایا گیا تھا اور ایک شخص دینا ناتھ نے سرکاری گواہ بن کر اس مقدمے کی سماعت کے دوران میں جن باتوں کا انکشاف کیا تھا ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب حکومت کی یہ سازش بہت زیادہ اہم تھی۔ اس مقدمے میں امیر چند دہلوی، اودھ بہاری لال، بال مکند اور بسنت کمار کو سزائے موت دی گئی تھی لیکن مسٹر راش بہاری بوس کو گرفتار نہیں کیا جا سکا تھا۔

اسی زمانے میں انقلاب پسندوں کی طرف سے ایک اشتہار شائع کیا گیا تھا۔ رولٹ رپورٹ میں اس اشتہار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ ''قرآن، گیتا اور وید سب ہمیں ہدایت کرتے ہیں کہ ہم مادرِ وطن کے تمام دشمنوں کو خواہ وہ کسی ذات، رنگ اور نسل کے کیوں نہ ہوں، مار ڈالیں۔''

دوسرے صوبے

باقی ماندہ صوبوں کے متعلق رولٹ رپورٹ میں مجموعی طور پر جو کچھ لکھا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی صوبہ بھی انقلابی تحریکات کے اثر سے محفوظ نہیں تھا۔ اسی زمانے میں ''بنارس کا مقدمہ سازش'' چلایا گیا تھا۔ اس مقدمے کا حوالہ دیتے ہوئے رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگرچہ اس وقت تک یوپی میں انقلابی تحریکات کا اثر نہیں ہوا تھا لیکن بنارس کا مقدمہ اور بعد کے واقعات مدت تک اس صوبے کے حالات کو خطرناک بنائے رکھیں گے اور صوبۂ متوسط کے بعض واقعات کا ذکر کرنے کے بعد اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ یہ

واقعات اس طریقۂ کار کی نظیر ہیں جس کے تحت دوسرے صوبوں کے لوگ آ کر اس صوبے کے امن پسند عوام کو مشتعل کرتے ہیں۔

مدراس کے متعلق رولٹ کمیشن نے یہ رائے قائم کی تھی کہ اگرچہ وہاں انقلابی تحریکات سے کوئی نقصان نہیں پہنچا، لیکن وہاں کے باشندوں پر پٹن چندر پال، نیز پیرس اور پانڈی چری میں مقیم دوسرے انقلابی پسندوں کا اثر ضرور ہے۔ چناں چہ ۱۷ر جون ۱۹۱۱ء کو ڈانچی آئر نے تناولی کے میجر ہیٹ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کی گرفتاری کے بعد اس کے قبضے سے تامل زبان میں لکھا ہوا جو خط برآمد ہوا تھا اس کے بعض فقرے یہ تھے کہ ''ہر ہندوستانی، انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینے اور سوراجیہ قائم کرنے کی فکر میں ہے...''

برما بھی انقلابی تحریکات کے اثر سے خالی نہیں تھا۔ چناں چہ رولٹ رپورٹ کے مطابق مانڈے میں سازش کے جو مقدمات چلائے گئے تھے ان میں یہ امور پایۂ تصدیق کو پہنچ گئے تھے کہ غدر پارٹی نے برما میں تحریک انقلاب کو تقویت پہنچائی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں وہاں ایک ایسی تحریک شروع کی گئی تھی جس کا مقصد انقلاب برپا کر کے ہندوستان میں ہندوستانیوں کی حکومت قائم کرنا تھا۔ ترکی کی امداد کے لیے سازش کی گئی تھی اور فوجوں کو بغاوت برپا کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

مزید کوششیں

اسی زمانے میں انقلابِ حکومت برپا کرنے کی کچھ اور کوششیں بھی کی جاتی رہی تھیں جن کا بیشتر تعلق ان لوگوں سے تھا جنھیں یا تو ہندوستان سے جلاوطن کر دیا گیا تھا یا جو حکومت کے علم کے بغیر ملک سے باہر چلے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے، مثلاً موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں حکومت نے لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ کو جلاوطن کر دیا تھا اور ۱۹۰۹ء میں سردار اجیت سنگھ نے کابل پہنچ کر ان لوگوں کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا جو پہلے ہی سے وہاں ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔

اسی زمانے میں لالہ ہردیال ایم. اے. نے لاہور میں انقلابِ حکومت کے مقصد کے پیش نظر ایک جماعت قائم کی تھی اور پھر امریکہ جا کر ۱۹۱۱ء میں وہاں 'غدر پارٹی' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی تھی۔ رولٹ رپورٹ میں اس جماعت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ — اس کے اراکین نے ہندوستان کی برطانوی حکومت کو تباہ کردینے کی قسم کھائی تھی۔ 'غدر' کے نام سے پارٹی کا ایک اخبار نکلتا تھا جو امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں کے علاوہ خود ہندوستان میں تقسیم کیا جاتا تھا اور اس کے ذریعے سے ہر ہندوستانی کو انقلاب برپا کرنے کے مقصد کے پیش نظر ہندوستان واپس چلے جانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔

قومی جدوجہد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۹۱۴ء میں امریکہ اور مشرقی ایشیا کے مختلف ملکوں سے 'گوما گاٹا مارو' اور 'ٹوسامارو' نامی جاپانی جہازوں پر جو ہندوستانی، ہندوستان واپس آئے تھے اور جن میں مشہور انقلاب پسند سکھ بزرگ بابا گوردت سنگھ بھی شامل تھے، 'غدر پارٹی' کے زیر اثر تھے اور ان کا مقصد ہندوستان آکر انقلابی جدوجہد کو تقویت پہنچانا تھا لیکن 'گوما گاٹا مارو' سے آنے والے ہندوستانیوں کو بج بج (کلکتہ) میں گولیوں کا نشانہ بنادیا گیا تھا اور 'ٹوسامارو' سے آنے والوں میں سے بیشتر کو نظر بند کردیا تھا۔

ریشمی خطوط

سطورِ بالا میں کسی جگہ بتایا جاچکا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد انقلاب حکومت کی جدوجہد کو باقی رکھنا اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچانا تھا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اس درس گاہ کے صدر مدرس (پرنسپل) حضرت مولانا محمود الحسن صاحب تھے جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوئے، موصوف نے اپنے مقتدر شاگردوں اور دوستوں کے مشورے سے اس ملک کو آزاد کرانے کی ایک تجویز مرتب کی تھی اور اسے پھول بوٹوں کی شکل میں ریشم کے رومالوں پر کشیدہ کرایا تھا، اسی لیے حکومت کی یادداشتوں میں اسے 'ریشمی خطوط کی سازش' کا نام دیا گیا تھا۔

اس تجویز کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلامی ممالک اور خصوصاً ترکی کی امداد سے ہندوستان پر حملہ کیا جائے جس کے ساتھ ہی ہندوستان میں بھی مسلح جدوجہد شروع کردی جائے اور اس طرح انقلاب حکومت برپا کرکے ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت قائم کردی جائے۔ ریشمی رومالوں پر پھول بوٹوں کی شکل میں جو کشیدہ کرایا گیا وہ اس تجویز کا خلاصہ تھا۔ یہ تجویز کامیاب نہیں ہوسکی تھی اور اگرچہ حکومت ان خطوط کو حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن

اسے اس تجویز کی تفصیلات کا علم ہوگیا تھا اور اس نے دسمبر ۱۹۱۶ء میں حضرت شیخ الہند اور ان کے چار رفقائے کار کو جن میں حضرت شیخ الہند ثانی مولانا سیّد حسین احمد صاحب بھی شامل تھے، مالٹا میں نظر بند کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں رولٹ رپورٹ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلابِ حکومت کے بعد ہندوستان میں جو مشترکہ حکومت قائم کرنے کی تجویز تھی اُس کی رو سے راجہ مہندر پرتاپ کو جواب ہند پارلیمنٹ کے رکن ہیں، حکومت کا پہلا صدر نامزد کیا گیا تھا اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اور مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی کے اسما وزرا کی فہرست میں شامل کیے گئے تھے۔

اسی قدر نہیں بلکہ رولٹ رپورٹ کے مطابق راجہ مہندر پرتاپ نے امیر ترکستان اور زار روس کو خطوط لکھ کر انھیں برطانیہ سے تعلقات منقطع کر لینے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں ہندوستانیوں کو مدد دینے کی دعوت بھی دی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تمام تحریکات اپنی جگہ کامیاب نہیں ہوسکی تھیں لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان سب سے ہماری قومی جدوجہد کو تقویت ضرور حاصل ہوتی رہی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد

ہندوستان کی قومی جدوجہد مذکورہ بالا مرحلے سے گزر رہی تھی کہ پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آچکا تھا اور اس وقت تک اس کی قیادت کی باگ ڈور اعتدال پسندوں کے ہاتھوں میں رہی تھی لیکن اب اس پر قبضہ کرنے کے لیے اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے مابین کشمکش شروع ہوگئی تھی۔

پہلی عالم گیر جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کا ایک گروہ جدوجہد جاری رکھنے کا حامی تھا اور دوسرا مخالف۔ گاندھی جی بھی جو اس زمانے میں سیاسی کاموں میں دل چسپی لینے لگے تھے، اسی دوسرے گروہ کے ہم نوا تھے اور اس زمانے میں یہی رائے فائق رہی تھی۔

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ جنگ کے زمانے میں حکومتِ ہند نے رولٹ کمیشن مقرر کیا تھا اور اس نے جنگ کے فوراً ہی بعد اپنی رپورٹ شائع کی تھی اور اس کے بعد رولٹ بل کی اشاعت عمل میں آئی تھی جو بعد میں قانون بن گیا تھا اور جس کی رو سے حکومت کو بغاوت

کے نام پر قومی جدوجہد کو کچلنے کے وسیع ترین اختیارات حاصل ہوگئے تھے۔ پھر چوں کہ جنگ کے بعد ترکی کے ساتھ ذلت آمیز شرائط پر صلح کی گئی تھی اس لیے ہندوستان کے مسلمان بھی انگریزوں کی حکومت سے متنفر ہوئے تھے اور ان سب باتوں نے مل کر کانگریس کو اعتدال پسندوں کے ہاتھوں سے نکال کر انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔

ان حالات میں گاندھی جی نے ۱۹۱۹ء کے شروع میں 'ستیہ گرہ' کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے افتتاح کے طور پر ملک بھر میں ہڑتال کی گئی اور رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے جلسے منعقد کیے گئے۔ اسی روز دہلی میں عوام پر گولیاں چلائی گئیں۔ امرتسر میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا اور جب لوگ جلیاں والا باغ میں اجتماعی جلسہ منعقد کرنے کے لیے جمع ہوئے تو ان پر مشین گنوں سے گولیاں برسائی گئیں اور اس طرح پنجاب کے بیشتر شہروں میں بغاوت جیسی صورتِ حالات رونما ہوگئی اور حکومت کا جبر و تشدد بڑھ گیا۔ گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک کو ملتوی کر دیا۔ اس وقت انگریزوں کی حکومت کے خلاف عوام میں جو جذبہ پیدا ہو چکا تھا وہ ختم نہیں ہوا۔

۱۹۱۹ء ہی میں ترکوں سے کی جانے والی ناانصافیوں کی تلافی کرانے کی غرض سے خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور مسلمانوں میں قومی جدوجہد کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے جمعیۃ علمائے ہند قائم کی گئی۔ ان دونوں جماعتوں کا نظریہ یہ تھا کہ جب تک ہندوستان انگریزوں کی گرفت سے آزاد نہیں ہو جائے گا عالمِ اسلام پر سے بھی برطانیہ کی گرفت ڈھیلی نہیں ہو سکے گی۔ اسی سال کے آخر میں امرتسر میں انڈین نیشنل کانگریس کا وہ اجلاس منعقد ہوا جو کلیۃً گاندھی جی کے زیر اثر تھا۔ اس کے ساتھ ہی 'مسلم لیگ'، 'خلافت کمیٹی' اور 'جمعیۃ علمائے ہند' کے اجلاس بھی منعقد ہوئے اور ان سب کی کارروائیوں اور قراردادوں سے قومی جدوجہد کو فروغ حاصل ہوا۔

دوسرے سال کلکتہ میں کانگریس کا جو خاص اجلاس منعقد ہوا اس میں غیر ملکی اشیا کے مقاطعے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی سال کے وسط میں کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بنارس میں ترکِ موالات کی تجویز منظور کی گئی اور دسمبر میں ناگ پور کے اجلاس کانگریس میں 'سوراجیہ' کے حصول کو قومی جدوجہد کا نصب العین قرار دیا گیا۔

اسی سال میں علمائے ہند نے فوج اور پولیس کی ملازمت کو خلافِ مذہب قرار دے کر ایک فتویٰ شائع کیا۔ یہ فتویٰ ہندوستان کے علاوہ غیر ملکوں میں مقیم ہندوستانی فوجوں میں بھی تقسیم کیا گیا تھا۔ اور اسی فتوے کی تقسیم کی بنا پر وہ تاریخی مقدمہ چلایا گیا تھا جو 'کراچی کیس' کے نام سے مشہور ہے اور جس میں جگت گرو شری شنکر اچاریہ، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا محمد علی، مفتی نثار احمد کانپوری اور پندرہ دیگر حضرات ماخوذ ہوئے تھے اور انھیں حالات میں ۱۹۲۱ء کے آخر میں گاندھی جی کی زیر قیادت ملک میں عام اور پُرامن قانون شکنی کی تحریک شروع ہوئی۔ اسی سال کے وسط میں مالابار کے موپلا حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کر چکے تھے۔ لیکن چوں کہ گاندھی جی اپنی تحریک کو تشدد سے پاک رکھنا چاہتے تھے اس لیے کانگریس نے اس بغاوت کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو ہندوستانیوں نے اس کا مقاطعہ کیا تھا اور اس سلسلے میں لاہور میں جو زبردست مظاہرہ کیا گیا تھا اسے ناکام بنانے کے لیے پولیس نے لاٹھی چارج کیا تھا جس سے لالہ لاجپت رائے سخت مجروح ہوئے تھے اور چند ہفتوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا تھا، جس کا انتقام لینے کے لیے انقلاب پسندوں نے نومبر میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سانڈرس کو جس نے لاٹھی چارج کی رہنمائی کی تھی، گولی کا نشانہ بنادیا۔ اس طرح ایک جانب تو گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس کی وہ جدوجہد جاری رہی جو عدمِ تشدد پر مبنی تھی اور دوسری طرف ہندوستان کے انقلاب پسند اپنے طریقے پر انقلاب برپا کرانے کی کوششوں میں مصروف رہے۔

مزدور کسان تحریکات

ہندوستان کی قومی جدوجہد کی کامیابی کے سلسلے میں اس ملک کے مزدوروں اور کسانوں کی تحریک کو بھی ایک ممتاز جگہ حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے مزدور اور کسان پہلی جنگِ عظیم سے پیشتر بھی قومی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے تھے۔ لیکن اس زمانے میں نہ تو ان کی جداگانہ تنظیمات موجود تھیں اور نہ انھیں اس جدوجہد میں جماعتی حیثیت سے شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔

روس کے معاشرتی انقلاب ۱۹۱۷ء کی بدولت ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور جمہوریت پسند طبقے میں بھی اشتراکیت سے دل چسپی کا اظہار کیا جانے لگا تھا اور اسی طبقے کی کوششوں سے ہندوستان میں مزدور سبھائیں اور کسان سبھائیں قائم ہونے لگی تھیں۔ چناں چہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک ملک میں صنعتی مزدوروں کی ہڑتال کی ایک ایسی زبردست لہر دوڑ رہی تھی جس کے پیش نظر کانگریس نے ۱۹۲۱ء میں حکومت کے ساتھ ترکِ موالات کا فیصلہ کیا تھا اور کامل آزادی کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔

جہاں تک کسانوں کی تحریک کا تعلق ہے اگرچہ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اقتصادی تعطل کی بدولت یہ تحریک بھی اسی زمانے میں شروع ہوگئی تھی لیکن اس کی تنظیم ۱۹۳۶ء سے پہلے نہیں ہوسکی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں 'آل انڈیا کسان سبھا' کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ذریعے سے کسانوں کے مسائل کو قومی جدوجہد کے ساتھ وابستہ کردیا گیا۔ چناں چہ مزدوروں اور کسانوں کی انھیں تحریکات کی بدولت ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں کانگریس کو وہ غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی تھی جس نے اسے برطانوی ہند کے سات صوبوں کی حکمران جماعت بنادیا تھا۔

ریاستی عوام کی تحریک

برطانوی استعمار پسندوں نے ہندوستان کو دو حصوں یعنی برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں پر منقسم کررکھا تھا اور چوں کہ ہندوستانی ریاستوں کے حکمران اپنی جگہ عضو معطل اور برطانوی استعمال کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اس لیے ان ریاستوں کی موجودگی بھی ہندوستان کی آزادی کی راہ میں ایک رکاوٹ بن کر رہ گئی تھی۔

اس وقت تک برطانوی ہند میں جو قومی جدوجہد ہوتی رہی تھی اس نے ریاستی عوام کو بھی متاثر کیا تھا اور انھوں نے آل انڈیا اسٹیٹز پیپلز کانفرنس' کے نام سے ایک جماعت قائم کرکے ہندوستانی ریاستوں کے عوام کی آزادی کی جدوجہد شروع کردی تھی اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کی راہ سے ایک بڑی رکاوٹ دور ہوگئی تھی۔

دوسری عالم گیر جنگ کا زمانہ

۱۹۳۷ء تک ہندوستان کی قومی جدوجہد اس مرحلے پر پہنچ گئی تھی جہاں اس کا نصب العین

بھی واضح ہو چکا تھا۔ نیز اس تک پہنچنے کے لیے ملک کی تمام تر قوتیں بھی منظم ہو چکی تھیں اور اگرچہ مزدوروں، کسانوں اور ریاستی عوام کی تحریکات میں خود ان کے طبقاتی مفاد بھی شامل تھے لیکن چوں کہ ان سب کا سیاسی مقصد ہندوستان کو آزاد کرانا تھا اس لیے ان سے 'انڈین نیشنل کانگریس' کو تقویت پہنچ رہی تھی۔

۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالم گیر جنگ شروع ہوئی اور برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو حکومتِ ہند نے عوام کے نمائندوں سے مشورہ کیے بغیر جنگ میں ہندوستان کی شرکت کا اعلان بھی کر دیا اور اگرچہ ہندوستان آغازِ جنگ سے بہت پہلے فاشی طاقتوں کی مذمت اور جمہوری طاقتوں کی حمایت کا اعلان کر چکا تھا، لیکن ہندوستانی رہنماؤں نے وائسرائے کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی ایک قرارداد میں ''ایک ایسی جنگ میں ایک فریق بننے سے انکار کر دیا جسے سامراجی طریقے پر لڑا جا رہا تھا اور جس سے ہندوستان کے اندر اور باہر سامراج کو تقویت حاصل ہوتی تھی۔'' اس کے ساتھ ہی قرارداد میں یہ بات بھی کہی گئی تھی کہ ''ہندوستان کے باشندوں کو بیرونی مداخلت کے بغیر اپنے لیے دستور مرتب کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔'' برطانوی حکومت سے براہِ راست یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ''اسے جمہوریت اور سامراج کے بارے میں اس جنگ کے مقاصد کا غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرنا چاہیے اور یہ بتانا چاہیے کہ ہندوستان پر یہ مقصد کس طرح منطبق اور اثر انداز ہوں گے۔'' اور آخر میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ ''کیا جنگ کے بعد ہندوستانیوں کو آزاد قوم سمجھا جائے گا اور کیا انھیں ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے گا؟'' اور چوں کہ برطانوی حکومت کی طرف سے ان باتوں میں سے کسی ایک کا جواب بھی اطمینان بخش نہیں دیا گیا تھا اس لیے اکتوبر میں کانگریس کی تمام صوبائی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔

۱۹۴۲ء کی تحریک

اس وقت سے ۱۹۴۲ء کے وسط تک ہندوستانی وطن پروروں اور برطانوی حکومت کے درمیان سمجھوتے کی متعدد کوششیں کی جاتی رہیں لیکن چوں کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی اس لیے یہ تمام کوششیں بھی ناکام ہو کر

رہ گئیں اور اگست ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے وہ قرار داد منظور کی جس میں برطانوی حکومت سے ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور جس کی بنا پر ہندوستان میں وہ انقلابی تحریک شروع ہوئی تھی جسے ''اگست ۱۹۴۲ء کی جدوجہد'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

کانگریس کی مذکورہ بالا قرار داد اور اگست کی جدوجہد کی بدولت چوں کہ حکومت نے تمام رہنماؤں اور سیاسی کارکنوں کو گرفتار کرلیا تھا اس لیے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں بھی تعطل قائم رہا۔ حتیٰ کہ مئی ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کی رہائی عمل میں آئی اور جون ۱۹۴۵ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین کو رہا کیا گیا۔

آزادی کی منزل

۱۹۳۷ء کے عام انتخابات کے بعد سے ہندو مسلمان میں نہیں بلکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوگئے تھے وہ روز بروز بڑھتے ہی جارہے تھے اور اس وقت تک مسلم لیگ کی طرف سے ملک کی تقسیم کا مطالبہ بھی کیا جاچکا تھا۔ اور چوں کہ ان اختلافات کو پیدا کرنے اور ترقی دینے میں بدیسی حکومت کی حکمتِ عملی کو بہت زیادہ دخل حاصل تھا اور جنگ کے بعد کے قومی اور بین الاقوامی حالات نے برطانوی حکومت پر یہ حقیقت واضح کردی تھی کہ اب اس کے لیے زیادہ مدت تک ہندوستان پر قبضہ رکھنا ممکن نہیں ہوسکتا اس لیے جنگ کے بعد ہندو مسلمانوں کے نام پر کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات بھی حدِ انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ چناں چہ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے جون ۱۹۴۵ء میں شملہ میں ایک کانفرنس منعقد کرکے جو آخری کوشش کی گئی تھی وہ بھی ناکامیاب ثابت ہوئی تھی اس لیے ان دونوں جماعتوں نے حصولِ آزادی کے لیے متحدہ محاذ بنانے کی بجائے جداگانہ طور پر برطانوی حکومت کے ساتھ گفت وشنید کا سلسلہ شروع کردیا اور اس طرح مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان میں وہ کیبنٹ مشن آیا جس کی تجویز کے مطابق اگست ۱۹۴۷ء کے وسط میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور اس کی آزادی کا اعلان کیا گیا۔

یہاں یہ بتادینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۴۶-۱۹۴۵ء کے درمیان ایک جانب تو کانگریس اور مسلم لیگ نیز ان دونوں جماعتوں اور برطانوی حکومت کے درمیان گفت وشنید

کا سلسلہ جاری تھا اور دوسری طرف ان جماعتوں کی رہنمائی سے بے نیاز ہوکر عوام حصولِ آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے چناں چہ فروری ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی بحریہ کے ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت برپا کردی تھی اور اگرچہ کانگریس اور مسلم لیگ نے اس بغاوت کی حمایت نہیں کی تھی لیکن جہازیوں نے جہازوں پر سے برطانوی پرچم اُتار کر اُن کی جگہ کانگریس اور مسلم لیگ کے پرچم نصب کردیے تھے۔

پھر یہاں اس بات کو بھی فراموش نہیں کردینا چاہیے کہ ایک طرف مزدور اور کسان سبھاؤں، ریاستی عوام کی تنظیم اور جمعیۃ علمائے ہند ایسی کل ہند جماعتوں کی وطن پرورانہ سرگرمیوں سے حصولِ آزادی کی جدوجہد میں 'انڈین نیشنل کانگریس' کو ہندوستان کے ہر گوشے میں تقویت حاصل ہوتی رہی تھی اور دوسری طرف پنجاب میں مجلس احرار، صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کی تحریک، بنگال میں پرجا کرشک پارٹی اور بلوچستان میں انجمن وطن نیز شیعہ کانفرنس، مومن کانفرنس اور کشمیر نیشنل کانفرنس ایسی جماعتیں اور تحریکات بھی کانگریس کی تقویت کا باعث بنی رہی تھیں اور جنگ کے زمانے میں آزاد ہند فوج کی تنظیم نے بھی ہماری قومی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں مدد دی تھی۔

مختصر یہ کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہماری جو قومی جدوجہد شروع ہوئی تھی وہ اگست ۱۹۴۷ء کے وسط میں کامیابی کی منزل تک پہنچی۔ اس جدوجہد کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں ملک کے ہر طبقے اور ہر فرقے کے افراد نے مساوی حصہ لیا تھا۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، جنگِ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء کے شکریے کے ساتھ)

کتابیات

اردو

آ

نام کتاب	مصنف/مرتب/مترجم	ناشر	سنِ اشاعت
آثارِ رحمت (سوانح مولانا رحمت اللہ کیرانوی)	امداد صابر	'مصنف' چوڑی والان، دہلی	
آزادی کی نظمیں	سبط حسن	قومی کونسل برائے فروغِ اردو	۲۰۰۷ء
آزادی کے نمائندہ مجاہدین	مختار احمد مکی		
آئینہ اودھ	سیّد ابوالحسن قطبی		۱۸۸۵ء
آئینہ تاریخ نما	شیو پرشاد		
آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی	غلام حیدر		۱۹۷۰ء
آزادی ہند	افضل حق (احرار)		
آزمائش (ڈراما)	محمد مجیب	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۵۷

ا

۱۸۵۷ء	غلام رسول مہر	لاہور	۱۹۵۷ء
۱۸۵۷ء	محمد شفیع	لاہور	۱۸۵۷ء
۱۸۵۷ء (منظوم)	راہی معصوم رضا	الہ آباد	۱۹۶۰ء
۱۸۵۷ء اخبارات اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۵۷ء
۱۸۵۷ء اور آج	ترتیب و انتخاب: احمد سلیم	نگارشات، لاہور	۱۹۸۹ء
۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی (واقعات و حقائق)	میاں محمد شفیع	اریب پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۰۵ء
۱۸۵۷ء جنگ آزادی کا درخشاں باب	مرتبہ ڈاکٹر ابرار رحمانی	پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی	۲۰۰۷ء
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ (عبداللطیف)	ترجمہ: خلیق احمد نظامی	مکتبہ برہان، دہلی	۱۹۵۰ء
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (سریندر ناتھ سین)	ترجمہ خورشید پروین	پبلی کیشنز ڈویژن نئی دہلی	
۱۸۵۷ء کی دلّی (ڈراما)	لالہ مہیشور دیال	مصنف	۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء کی کہانی مرزا غالب کی زبانی	مخمور سعیدی	نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نئی دہلی	۲۰۰۷ء
۱۸۵۷ء کے بھولے بسرے شہید	وشوامترا پادھیائے	پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی	
۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا	امداد صابری	مکتبہ شاہراہ، دہلی	۱۹۵۹ء
۱۸۵۷ء کے غدار شعرا	امداد صابری	مکتبہ شاہراہ، دہلی	۱۹۶۰ء
۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط	سلیم قریشی/ عاشور کاظمی	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	۲۰۰۱ء
احسن التواریخ	رام سہائے تمنا		۱۸۶۹ء
اردو ادب اور ۱۸۵۷ء	ڈاکٹر محمد سبطین		
اردو صحافت کی تاریخ	نادر علی خاں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۷ء
اردو میں قومی شاعری کے سو سال	مرتبہ علی جواد زیدی		
اردو کے اخبار نویس (۱۸۵۲ تا ۱۸۵۷ء)	امداد صابری	صابری اکیڈمی، دہلی	۱۹۷۷ء
اردوے معلی (طبع اول)	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۶۹ء
اسباب بغاوت ہند	سر سیّد احمد خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۹۰۳ء
افسانۂ لکھنؤ	سیادت حسین سیّد جلال الدین		۱۸۷۳ء
اکمل التواریخ (دو حصے)	یعقوب حسین ضیاء القادری		۱۹۱۵ء
الدر المنثور	مولانا عبد الرحیم		
الشورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان)	علامہ فضل حق خیر آبادی، ترجمہ محمد عبد الشاہد خاں شروانی، بجنور		۱۹۴۷ء
المشاہیر	مولانا محمد فیض احمد زبیری	نامی پریس، میرٹھ	۱۹۰۰ء
امام بخش صہبائی	این. ڈی. آہوجہ		۱۹۸۴ء
امام بخش صہبائی	(ڈاکٹر) خواجہ محمد حامد	بزمِ غالب، کامٹی (مہاراشٹر)	۱۹۸۲ء
امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات	(ڈاکٹر) محمد ذاکر حسین	پٹنہ	
امیر الروایات (غدر سے متعلق مولانا محمد امیر خاں کی باتیں) بحوالہ 'بہادر شاہ ظفر' رئیس احمد جعفری			
انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ	ایڈورتھامپسن، ترجمہ حسام الدین		۱۹۳۱ء
انقلاب شاون	پی. سی. جوشی	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۷۲ء
انقلاب ۱۸۵۷ء کی خونیں تاریخ	مفتی شوکت علی فہمی	دین دنیا پبلشنگ کمپنی، دہلی	۱۹۵۰ء
انقلاب کی خبریں	مفتی شوکت علی فہمی	دین دنیا پبلشنگ کمپنی، دہلی	۱۹۵۷ء
انگریزوں کا شرمناک دورِ حکومت	مفتی شوکت علی فہمی	دین دنیا پبلشنگ کمپنی، دہلی	
انگریزوں کی بپتا	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	حلقہ مشائخ چشت	۱۹۱۹ء
انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ / علامہ عبد اللہ یوسف علی			۱۹۳۶ء
اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ	اطہر علی برلاس		۱۹۸۴ء
اودھ کا آخری تاجدار	مرزا کوکب قدر		
ایامِ غدر (ہورنسٹ انگلیسی کی سرگزشت)	مترجم: ظفر حسن عاصی امروہوی		۱۹۲۳ء

ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما	انتظام اللہ شہابی	دینی بک ڈپو، دہلی	
ایک مجاہد معمار (سوانح مولانا رحمت اللہ کیرانوی)	محمد سلیم		۱۹۵۲ء
ایک نادر روزنامچہ (مظہر علی سندیلوی)	مرتبہ نورالحسن ہاشمی	لکھنؤ	۱۹۵۴ء

ب

باغی میرٹھ	مرتبہ روحانی اتحاد کمیٹی میرٹھ		۱۹۵۷ء
بدایوں ۱۸۵۷ء میں	سلیمان بدایونی	کراچی	۱۹۶۰ء
برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علما کا کردار	ایچ. بی. خاں	قومی ادارہ برائے تحقیق و ثقافت اسلام آباد	
برطانوی حکومت ہند	انڈرسن		
برطانوی ہند کا نظام سیاسی	ای. اے. ہارون		
بزمِ آخر	منشی فیض الدین	دانش محل، لکھنؤ	۱۹۴۵ء
بساطِ غدر	حکیم کنیشی لال		۱۸۶۰ء
بوستانِ اودھ	درگا پرشاد		
بہادر شاہ ظفر	ڈاکٹر اسلم پرویز	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	۱۹۸۵ء
بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۳۵ء
بہادر شاہ ظفر: فن و شخصیت	خواجہ تہور حسین	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۶۵ء
بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	رئیس احمد جعفری	کتاب منزل، لاہور	۱۹۵۷ء
بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	حلقہ مشائخ بک ڈپو، دہلی	۱۹۳۵ء
بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	حلقہ مشائخ بک ڈپو، دہلی	۱۹۴۷ء
بہارستانِ اودھ	درگا پرشاد		
بھارت میں انگریزی راج	سندر لال	پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی	
بیگمات کے آنسو	خواجہ حسن نظامی	حلقۂ مشائخ بک ڈپو، دہلی	

پ

پاکستان اور ہندوستان	عبدالقدوس ہاشمی		

ت

تاریخ آفتاب اودھ	محمد تقی		۱۸۷۴ء
تاریخ الہ آباد	مقبول احمد صمدانی		۱۳۵۷ھ
تاریخ امروہہ	محمود احمد عباسی		۱۹۳۰ء
تاریخ اودھ	نجم الغنی		
تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ	امجد علی خاں		۱۹۷۰ء
تاریخ بغاوت ہند	پنڈت کنھیا لال	مطبع نول کشور، لکھنؤ	

تاریخ بغاوت ہند	مکند لال		
تاریخ بغاوت ہند	مولوی ذکاء اللہ	شمس المطابع، دہلی	۱۸۹۷ء
تاریخ تحریک آزادی ہند (جلد اول)	تاراچند ترجمہ: محمد عدیل عباسی	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۰ء
تاریخ تحریک آزادی ہند (جلد دوم)	تاراچند ترجمہ: غلام ربانی تاباں	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	۱۹۹۸ء
تاریخ ٹونک	اصغر علی آبرو	ستارۂ ہند پریس، آگرہ	۱۹۰۱ء
تاریخ جنگ آزادی ہند اٹھارہ سو ستاون	سید خورشید مصطفیٰ رضوی	رام پور رضا لائبریری	۲۰۰۰ء
تاریخ جون پور	اقبال احمد		۱۹۶۳ء
تاریخ جھجر	غلام نبی		
تاریخ حصار	امین چند		
تاریخ رشید خانی	غلام امام خاں		
تاریخ روہیل کھنڈ	عبدالعزیز عاصی		۱۹۶۳ء
تاریخ ریاست ٹونک (اردو)	ہنومان شکھل		
تاریخ سرکشی بجنور	سر سید احمد خاں		
تاریخ سلاطین اودھ	سید کمال الدین حسنی		
تاریخ سندھیا	وگھوناتھ داس		۱۹۰۷ء
تاریخ شاہجہانپور	صبیح الدین		
تاریخ صحافت اردو (جلد اول)	امداد صابری	مصنف، چوڑی والان، دہلی	۱۹۵۳ء
تاریخ ضلع حصار	مہاراج کرشن		۱۸۸۶ء
تاریخ ضلع گوڑگاؤں	الطاف حسین		
تاریخ عجیب (کالا پانی)	جعفر تھانیسری		۱۸۸۵ء
تاریخ عروج عہد انگلیشیہ	مولوی ذکاء اللہ	شمس المطابع، دہلی	۱۹۰۴ء
تاریخ قنوج	صدیق حسن خاں		
تاریخ مالوہ	کریم علی خاں		
تاریخ مسلمانانِ پاک و بھارت	مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی	انجمن ترقی اردو، کراچی (پاکستان)	
تاریخ ہند	آرنلڈ		۱۸۵۷ء
تاریخ ہند	مولوی ذکاء اللہ	مطبع مرتضوی، دہلی	۱۸۷۹ء
تاریخ ہند	مولوی سید ہاشمی فرید آبادی	جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)	۱۹۳۷ء
تاریخ ہند (جدید)	یوسف حسین خاں	دارالمطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد	۱۹۴۰ء
تاریخ ہندوستان (جلد پنجم)	مولوی ذکاء اللہ	مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کالج	
تحریکِ آزادی اور مسلمان	امیر اوردی	دارالمصنفین، دیوبند	
تحریکِ آزادی اور ہندوستانی مسلمان	ڈاکٹر مختار احمد مکی	دہلی	۲۰۰۳ء

تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر معین الدین عقیل	انجمن ترقی اردو کراچی (پاکستان)	۱۹۷۱ء
تحریک دعوت و جہاد	مولانا عبیداللہ فلاحی	ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۶۶ء
تذکرہ الرشید	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی		
تذکرہ حافظ ضامن شہید	امداد صابری		
تذکرۂ شعرائے میرٹھ☆	مولفہ نور احمد میرٹھی	مطبوعہ کراچی	۲۰۰۳ء
تذکرہ مشاہیر کاکوروی	علی حیدر		۱۹۲۷ء
تریاق شورش	عبدالغفار		۱۹۰۷ء
تلاش ہند	پنڈت جواہر لال نہرو		
تواریخ بلند شہر	منگل سین		۱۸۶۳ء
تواریخ سندیلہ	درگا پرشاد		۱۹۱۵ء
تلخیص تاریخ اودھ	ڈاکٹر محمد ذکی احمد (ذکی کاکوروی)		

ج

جان عالم واجد علی شاہ	مسعود حسن رضوی	لکھنؤ	۱۹۷۷ء
جماعت مجاہدین	غلام رسول مہر	لاہور	۱۹۵۷ء
جہاد شاملی و تھانہ بھون	ثناء الحق صدیقی		۱۹۸۶ء
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	خورشید مصطفیٰ رضوی	مکتبہ برہان، دہلی	۱۹۵۹ء
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	ایوب قادری	معارف	۱۹۷۶ء
جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ	عابدہ سمیع الدین	خدا بخش لائبریری، پٹنہ	۱۹۹۰ء

چ

چراغِ دہلی	مرزا حیرت دہلوی	کرزن پریس دہلی	۱۹۰۳ء

ح

حالات محمد علی جیمی گرین	شفیع الدین مرادآبادی		۱۸۹۶ء
حیات جاوید	الطاف حسین حالی		۱۹۰۳ء
حیات حافظ رحمت علی خاں	مولوی سید الطاف بریلوی		

خ

خانم انگلس در بلوائے ہندوستانی (اردو ترجمہ)		دارالاشاعت پنجاب، لاہور	

☆ 'تذکرۂ شعرائے میرٹھ' میں ان شاعروں کا بھی ذکر ہے جنھوں نے بالخصوص ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے حالات پر نظمیں لکھی ہیں۔

خان بہادر خاں شہید	سیّد مصطفیٰ علی بریلوی	ایجوکیشنل پریس	۱۹۶۰ء
خدنگ غدر (معین الدین خاں)	مرتبہ خواجہ احمد فاروقی	شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی	۱۸۷۸ء
خطبات گارساں دتاسی		انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)	۱۹۳۵ء
خواتین ہند کے تاریخی کارنامے			
خیر خواہ مسلمانانِ ہند (دو حصے)	سر سیّد احمد خاں		۱۸۶۰ء

د

داستانِ غدر	ظہیر دہلوی	مطبع کریمی پریس، لاہور	۲۰۰۷ء
داستان ۱۸۵۷ء	مرتبہ فاروق ارگلی	فرید بک ڈپو، دہلی	۲۰۰۷ء
☆ دستاویزاتِ غدر	مرتبہ پروفیسر سیّد محمد عزیز الدین حسین ہمدانی / کنشکا پبلشرز		۲۰۰۷ء
دستنبو (فارسی) مرزا اسداللہ خاں غالب	اردو ترجمہ: خواجہ احمد فاروقی	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۲۰۰۰ء
دلّی اٹھارہ سو ستاون کی	مرزا محمود بیگ	نیو اسکول پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۷۶ء
دلّی کا آخری دیدار	سیّد وزیر حسن دہلوی	ساقی بک ڈپو، دہلی	۱۹۳۴ء
دلّی کا سنبھالا	خواجہ محمد شفیع		
دہلی کی آخری بہار	راشد الخیری		
دہلی کی جان کنی	خواجہ حسن نظامی		۱۹۲۵ء
دہلی اردو اخبار	مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی		۱۹۷۲ء

ذ

ذکاء اللہ دہلوی (سی. ایف. اینڈریوس)	ترجمہ ضیاء الدین برنی	تعلیمی کرمز، کراچی	۱۹۵۲ء

اس کتاب میں کتابیات کے تحت درج ذیل کتابیں شامل کی گئی ہیں:

☆ اخبار الصنادید	نجم الغنی رامپوری		
ناصر الاخبار	نصرت علی دہلوی		
بہارستانِ اودھ	عبداللہ عاشق		
تاریخ نادر العصر	کرنل سانڈرس الکسس اینٹ		
تاریخ روہیل کھنڈ	نیاز احمد خاں		
بہادر شاہ بادشاہ	منشی قربان علی		
باغی ہندوستان	محمد عبدالشاہد خاں شیروانی		
غدر کے حالات وفتوحات انگریزی	خواجہ محمد بشیر		
۱۸۵۷ء کے ہیرو	انیس فاطمہ بریلوی	کراچی	۱۹۹۳ء
غدار	چندر کرشنا	دہلی	۱۹۶۷ء
غدار	صادق حسین سردھنوی	دہلی	
غدار لیڈر	ناصر لاہور	لاہور	۱۹۳۷ء

ر

روحِ روشن مستقبل	طفیل احمد منگلوری		۱۹۴۵ء
روح صحافت	امداد صابری	مصنف، چوڑی والان، دہلی	
رودِ کوثر	شیخ محمد اکرام	تاج آفس بمبئی	
ریاض مختاریہ	مدد علی دانش		

س

سرسیّد تاریخی اور سیاسی آئینے میں	ڈاکٹر شان محمد		
سرطامس مٹکاف کی ڈائری	ترجمہ ضیاء الدین برنی/مرتبہ حسن نظامی	حلقہ مشائخ دہلی	۱۹۲۶ء
سرگذشت ایامِ غدر	عنایت حسین خاں		
سرگذشت دہلی (جیون لال)	مرتبہ ڈاکٹر درخشاں تاجور	رامپور رضا لائبریری، رامپور	۲۰۰۰ء
سرگذشت مجاہدین	غلام رسول مہر	لاہور	۱۹۵۷ء
سفرنامہ اسیر مالٹا	سیّد حسین احمد مدنی	دینی بک ڈپو، دہلی	
سن ستاون	پنڈت سندر لال	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۵۷ء
سن ستاون	رام بلاس شرما		
سن ستاون میری نظر میں	ناصر کاظمی/ انتظار حسین		
سوانح دہلی	میرزا احمد اختر گورگانی	مطبع افتخار، دہلی	
سوانح مولانا محمد قاسم		مطبع مجتبائی	۱۸۹۴ء
سوانح قاسمی	مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی	دارالعلوم، دیوبند	
سیر المتاخرین	غلام حسین طباطبائی	نول کشور پریس، لکھنؤ	۱۹۰۲ء
سیرت سیّد احمد شہید	غلام رسول مہر		۱۹۵۷ء
سیرت سیّد محمد شہید	مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی	مطبوعہ لکھنؤ	۱۹۲۶ء
سوانح عمری لارڈ لارنس	مرتبہ مسٹر بارسورتھ	مطبع نول کشور، لکھنؤ	
سوانح عمر ملکہ معظمہ وکٹوریہ	منشی ذکاء اللہ	شمس المطابع، دہلی	۱۹۰۴ء

ش

شاہ حسن عسکری اور جنگ آزادی کے عوامل	اظہر اشتیاق	کراچی	۱۹۸۵ء
شہیدانِ آزادی کے مسلم مجاہدین	ضامن علی خاں		
شہر آشوب	ڈاکٹر نعیم احمد	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۶۸ء

ص

صحافت اور تحریک آزادی	عزیز ملک		۱۹۸۴ء

ع

علمائے حق	مولانا محمد میاں		۱۹۵۷ء
علمائے حق اوران کی مظلومیت کی داستانیں	مفتی انتظام اللہ شہابی		
علماء میدانِ سیاست میں	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	کراچی	۱۹۹۴ء
علماء ہند کا شاندار ماضی	مولانا محمد میاں		۱۹۸۵ء
عودِ ہندی (طبع اول)	مرزا اسداللہ خاں غالب	مطبع مجتبائی، میرٹھ	۱۸۶۰ء

غ

غالب اور ابوالکلام	محمد عتیق صدیقی	دہلی	۱۹۶۴ء
غالب اور انقلاب ستاون	(ڈاکٹر) سیّد معین الرحمٰن	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	۱۹۰۰ء
غالب اور شاہانِ تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۷۴ء
غالب اور ہماری تحریکِ آزادی	شمیم طارق	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی	۲۰۰۲ء
غالب کا روزنامچہ	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	حلقہ مشائخ چشت، دہلی	۱۹۲۵ء
غدر کا نتیجہ	خواجہ حسن نظامی	حلقہ مشائخ، دہلی	۱۹؟۰ء
غدر دہلی کے افسانے	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	حلقۂ مشائخِ چشت، دہلی	۱۹۱۸ء
غدر کی ماری شہزادیاں	راشد الخیری	دہلی	
غدر کے اخبارات	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	مشائخ بک ڈپو، دہلی	۱۹۴۰ء
غدر کے چند علما	مفتی انتظام اللہ شہابی	دینی بک ڈپو، دہلی	
غدر کے مناظر (ترجمہ سرگذشت انگلیشیہ)	ظفر تاباں		۱۹۳۷ء

ف

فرید دہلی (منظوم اضافہ شدہ فغانِ دہلی)	مرتبہ نظامی بدایونی	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۱ء
فرنگیوں کا جال اور علمائے کرام	مولانا امداد صابری		
فضلائے ہند	مرتبہ انتظام اللہ شہابی		
فغانِ دہلی (منظوم) پہلا اڈیشن	مرتبہ تفضل حسین کوکب دہلوی	اکمل المطابع	۱۸۶۳ء
فغانِ دہلی (چوتھا اڈیشن)	مرتبہ تفضل حسین کوکب دہلوی	اکادمی پنجاب، لاہور	۱۹۵۴ء

ق

قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں	عرش تیموری	مکتبہ جہاں نما	۱۹۳۷ء
قیصر التواریخ	کمال الدین حیدر	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۷۹ء

ک

کارنامہ سروری	آغا مرزا سرور جنگ		۱۹۳۳ء
کارل مارکس اور ہندوستان			
کمپنی کی حکومت	باری علیگ	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۴۴ء
کنز التواریخ (بدایوں)	رضی الدین بسمل		۱۹۰۷ء
کوائف وصحائف ۱۸۵۷ء		ادارہ مطبوعات پاکستان	۱۹۵۷ء
کیفیت بلند شہر	لچھمن سنگھ		۱۸۷۰ء

گ

گلدستہ اودھ	بلاقی داس		
گذشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر		
گرفتار شدہ خطوط	خواجہ حسن نظامی	حلقہ مشائخ، دہلی	
گلستان ہند ــ سندیلہ	درگا پرشاد		۱۸۹۷ء

ل

لال قلعے کی ایک جھلک	ناصر نذیر فراق	ساقی بک ڈپو	
لکھنؤ اور جنگ آزادی	مرتبہ ادبی اکیڈمی، لکھنؤ		۱۹۵۷ء

م

ماثر لاوری (تذکرہ احمد اللہ شاہ)	ابرار حسین فاروقی		۱۹۶۶ء
ماسٹر رام چندر (پارہ دوم)	صدیق الرحمن قدوائی	شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی	
مجاہدین ۱۸۵۷ء	غلام رسول مہر		
محاربۂ عظیم	کنہیالال		۱۸۸۴ء
محاصرۂ دہلی کے خطوط	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	حلقۂ مشائخ چشت، دہلی	۱۹۱۹ء
محمد حسین آزاد	ڈاکٹر اسلم فرخی	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۶۲ء
مرحوم دلی کالج (دوسرا اڈیشن)	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی	۱۹۴۵ء
مرقع عبرت	سید حسن بیگرامی		۱۳۰۰ھ
مسلم دیش بھگت	رتن لال ہنسل		۱۹۴۹ء
مسلم مجاہدین آزادی (۱۹۴۷-۱۷۵۷ء)	میوارام گپت	ممبئی	
مشاہیر جنگ آزادی	مفتی انتظام اللہ شہابی	سعد اینڈ سنس کراچی	
مصائب غدر	ترجمہ: مولوی نذیر احمد	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۶۴ء

مولانا فضل حق خیرآبادی	عبدالحق خیرآبادی	مطبوعہ مجلس مصنفین، علی گڑھ	
مولانا فیض احمد بدایونی	ایوب قادری		۱۹۵۱ء
میوات ایک کھوج	صدیق احمد میو		

ن

نصرت نامۂ گورنمنٹ (دہلی کی سزا)	نواب غلام حسین	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	
		مشائخ بک ڈپو، دہلی	۱۹۳۰ء
نقشِ حیات	مولانا سید حسین احمد مدنی	مکتبۂ دینیات، دیوبند	
نواب خاں بہادر شہید	مصطفیٰ علی بریلوی		۱۹۶۶ء

و

واجد علی شاہ	ڈاکٹر محمد ذکی احمد (ذکی کاکوروی)		۱۹۷۳ء
واجد علی شاہ اور ان کا عہد	رئیس احمد جعفری		۱۹۵۹ء
وارفتگانِ فرخ آباد	رادھا رمن سکسینہ		
وداع ظفر معروف بہ نوبت پنج روزہ	راشد الخیری	جہاں گیر بک ڈپو	۱۹۲۴ء
واقعات دارالحکومت ہند	بشیر الدین احمد	شمس مشین پریس، آگرہ	۱۹۱۹ء
واقعات ہند	مولوہ مولوی کریم الدین	مطبع نول کشور، میرٹھ	

ہ

ہمارے ہندوستانی مسلمان (ولیم ولس ہنٹر)	اردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق حسین	اقبال اکیڈمی، لاہور	۱۹۴۴ء
ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۵۷ء
ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری	پروفیسر گوپی چند نارنگ		۲۰۰۳ء
ہندوستان کی جدوجہد میں اردو شاعری کا حصہ	درخشاں تاجور		
ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ	عابدہ سمیع الدین	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۱ء
ہندوستان ہمارا (منظوم)	جاں نثار اختر	ہندوستان بک ٹرسٹ، ممبئی	

ی

یادگار دہلی	سید احمد ولی اللہ	مطبع احمدی، دہلی	۱۹۰۵ء
یادگار غالب	الطاف حسین حالی		

ENGLISH

1. Adams, W. H. Davenport — Makers of British India. Contains helpful Treatment of the Mutiny / Rebellion Station by Station, London C 1990

---

2. Adye.Lt. col. John — The Defence of Cawnpore. Indian Historical Records Commission Proceedings 33-9-15-1958. Describes the activities of unusual Rebet.

---

3. Ahmed, S. Qayamuddin — Maulavi Ali Kareem. a scholar soldier of Bihar during 1857-58. In Indian Historical Records Commission Proceedings 33. 9-15. 1958. describes the unusual Rebet.

---

4. Ahsanulla Khan, Hakim — Memories of Hakim Ahsanulla Khan Moinulhaq (ed) Karachi: 1958.

---

5. Alavi, Seema. — Sepoys and the company: Tradition and Transition in North India. 1770-1830 New Delhi: Oxford University Press. 1995.

---

6. Allen, Charles. — Soldier Sahib
The men who made the North-West Frontier
London: 2000.

---

7. Allen, Charles. — God's Terrorists
The Wahabi Cult and the Hidden Roots of Modern Jihad

London: 2006.

8. Anderson, Captain and Robert Patrick — A Personal Journal of the Siege of Lucknow
Thomas Carnegie Anderson (ed.)
London: Thacker, 1858.

9. Anderson, George and — Manilal B. Subadar.Last days of the Company. A Source book of Indian History 1818-1858. 2 vols.
London: G. Bell, 1918.

10. Anson. Major O.H.S.G. — With H.M 9th Lancers during the Indian Mutiny
London: 1896.

11. Anonymous — The thoughts of a Native of Nothern India on the Rebellion: Causes and Remedies
London: Macmillan, 1858.

12. An officer who served there — History of the Siege of Delhi Edinburg, 1861.

13. Archer, Mildred — Company Drawings in the India office Library
London: 1972.

14. Ashraf, K.M. — Muslim Revivalists and the Revolt of 1857
Delhi: 1957.

15. Atkinson, G.F. — The campaign in India 1857-58
From Drawings made during the Eventful Period of the Great Mutiny
London: Day, 1859.

16. A Wounded Officer — My Escape from the Mutinies in Oudh.

London: Richard Bentlay 1858.

17. Baird, J.G.A. (ed) — Private Letters of the Marquess of Dalhousie
London: 1910.

18. Ball, Charles — History of the Indian Mutiny 2vols. (A detailed account of the Sepoy insurrection in India and a Concise History of the Great Military Events which have tended to consolidate British Empire in India)
London: Printing and Publishing Co. Ltd., July 1858-59

19. Barnett, Richard B. — North India Between Empires: Awadh, the Mughals and British
University of California: 1980.

20. Barthorp, Michael — The British Troop in the Indian Mutiny 1857-59
Oxford: 1994.

21. Bartrum, Katherine Mary — A widow's Reminiscences of the Siege of Lucknow
London: James Nisbet, 1858.

22. Beamer, John — Memoires of a Bengal Civilian
London: 1961.

23. Bearee, George D. — British Attitude Towards India 1784-1858
Oxford: Oxford University Press, 1961.

24. Becher, Augusta — Personal Reminiscences of India and Europe, 1830-1888
H.G. Rawlinson (ed)
London: Constable, 1890.

25. Bennett, Amelia — Ten Months Captivity after the Massacre at Cawnpore, Nineteenth Century 436, (June 1913) 1212-34 and 437, (July 1913) 78-91.

---

26. Benson, A.C. and Viseount Esher (eds) — The Letters of Queen Victoria, 1837-61. 3 vols. London: John Murray, 1907.

---

27. Beveridge, Henry — A Comprehensive History of India, Civil, Military and Social. From the First Landing of the British to the Sepoy Revolt. 3 vols. London: Blackie, 1858.

---

28. Bhadra, Gautam — Four Rebels of 1857 New Delhi: 1985.

---

29. Bloomfield, David (ed) — Lahore to Lucknow: The Indian Mutiny Journal of Arthur Moffat Laing London: 1992.

---

30. Blunt Wilfred, Scrawen — The Shame of the Nineteenth Century: Letter Addressed to the Times London: n.p., 1900.

---

31. Bonham, Coloned John. — Oudh in 1857 (Some Memories of the Indian Mutiny) London: 1928.

---

32. Bourchier, Colonel. George CB — Eight Months Campaign against the Bengal Sepoy Army during the Mutiny of 1857 London: 1858

---

33. Burke, S.M. and Salimal Din Quraishi — Bahadur Shah Last Mughal Emperor of India

Lahore: 1995.

---

34. Burton, David — The Raj at Table. A culinary History of the British in India
London: 1993.

---

35. Buckler, F.W. — The Political Theory of the Indian Mutiny
Ann Arbor: Michigan University Press, 1985.

---

36. Campbell, Sir George — Memoirs of My Indian Career
London: 1893.

---

37. Cardew, A. — The white Mutiny
London: 1929.

---

38. Carey, W.H. — The Mahomedan Rebellion
Rurki: 1857.

---

39. Case, Adelaide — Day by Day at Lucknow.
A Journal of the Siege of Lucknow
London: Richard Bentley, 1858.

---

40. Cave - Brown, John — The Punjab and Delhi in 1857
Being a Narrative of how the Punjab was saved and Delhi recovered during the Indian Mutiny 2 vols.
London: Blackwood, 1861.

---

41. Chakravarty Gautam — The Indian Mutiny and the British Imagination
Cambridge: 2005

---

42. Chambers, John — Letters from the Indian Mutiny 1857-59:
R.Richard Terell (ed).
Norweech: Michael Russell, 1992.

---

43. Chambers — Chambers History of Indian Revolt and the Expeditions to Persia, China and Japan, 1856-57-58 (with Map, Plans and wood engravings) London: Chambers, 1859.

44. Chattopadhayay. N — The Sepoy Mutiny 1857 Brooklands, Calcutta: 1957.

45. Chaudhuri, S.B. — Civil Disturbances during British Rule in India 1765-1857 Calcutta: World Press, 1955.

46. Chaudhuri, S.B. — Civil Rebellion in the Indian Mutinies 1857-1859 Calcutta: World Press, 1957.

47. Chaudhuri, S.B. — English Historical Writings on the Indian Mutinys 1857-59 Calcutta: World Press, 1979.

48. Chaudhuri, S.B. — Theories of the Indian Mutiny 1857-1859 Calcutta: World Press, 1965

49. Chesney, Sir George — Indian Polity: A view of the system of Administration in India London:1868.

50. Chiek, Noah — Annals of the Indian Rebellion, 1857-58 (containing Narratives of the outbreaks and Eventful occurrences and Stories of Personal Adventure) Calcutta: Sanders, 1859.

51. Chick, N.A. — Life in the Fort of Agra during the Mutinies of 1857

Calcutta: 1859.

52. Chander, Bholanath — The Travel of a Hindoo to various parts of Bengal and Upper India, 2 vols. London: Treebner, 1869.

53. Compton, Herbert (ed) — The European Military Adventures of Hindustan. London: 1943.

54. Cooper, Frederick Henry — Crisis in the Punjab from 10th May until the Fall of Delhi London: Smith Elder, 1859.

55. Coopland, Ruth. — A Lady's Escape from Gwalior and Life in the Fort during the Mutinies of 1857 London: Smith Elder, 1859.

56. Dalrymple, William — The Last Mughal: The fall of a dynasty Delhi 1857 Penguin: India, 2006

57. Datta, K.K. — Anti British Plots and Movements before 1857 Meenakshi: Prakasham, 1970.

58. David, Saul — The Indian Mutiny 1857 London: 2002

59. David, Saul — Victorias Wars: the rise of Empire London: 2006

60. Dewar, Douglas Garrett, H.L.O — Reply to Mr. F.W. Buckler's Political Theory of the Indian Mutiny Royal Historical Society, Transactions, 7 (1924), 131-65.

61. Dobrulyubov, Nicolai — The Indian National Uprising of 1857: A Contemporary Russian Acrount. (Tr.) Harish C. Gupta
Calcutta: Nalanda, 1988

62. Domin, Dolores — India in 1857-59: A study of the Sikhs in the People's Uprising.
Berlin: Velag, 1977

63. Duberly, Fanny — Campaigning Experience in Rajpootana and Central India.
London: Smith Elder, 1859.

64. Duff, Alexander — The Indian Rebellion: Its causes and Results.
London: Nisbet, 1858

65. Dunlop, Robert Henry Wallace — The Khakee Ressalah, Meerut Volunteer Horse during Mutinies of 1857-58
London: Richard Bentley, 1858.

66. Eden, Emily — Up the Country: Letters written to her Sister from the upper provinces of India (1866)
London:Virago, 1963.

67. Edward, Leeky — Fiction connected with the Indian outbreak of 1857 Exposed
Bombay: 1859.

68. Edwardes, Michael — The Red year: The Indian Rebellion of 1857
London: Cardinal, 1975

69. Edward, J. Thompson — The other side of the Medal
London: 1925

70. Edwardes, William — Personal Adventures during the Indian Rebellion in Rohilcund, Futtehghur and Oude
London: Smith, Elder, 1858.

---

71. Edwards, William — Reminiscences of a Bengal Civilian
London: Smith, Elder, 1866.

---

72. Embree, Ainslee J. — 1857 in India: Mutiny or War of Independence
Boston: D.C. Heath, 1963.

---

73. Fitchett, W.H. — Tale of the great Mutiny
London: Smith, Elder, 1901.

---

74. Forbes, Mitchell William — Reminiscences of the great Mutiny 1857-59: Including Relief Siege of Lucknow and Campnig in Rohilkhand and Oudh 1897
Macmillan, New York.

---

75. Forbes, Mitchell William — The Relief of Lucknow
London: 1962.

---

76. Forrest, G.W. — The Indian Mutiny: Selections from the letters, Despatches and other state Papers Preserved in the Military Department of the Government of India, 1857-1858, 4 vols.
Calcutta, n.p., 1893-1912.

---

77. Forrest, G.W. — A History of the Indian Mutiny Reviewed and Illustrated from Original Documents. 3 vols.
Edinburgh: Blackwood, 1904-12.

---

78. Franjee, Dorabhoy — The British Raj eontrasted with its Predecessors.

London: Smith, Elder, 1858.

---

79. Fred, Roberts — Letters written during the Indian Mutiny
London: 1924.

---

80. Frost. Thomas (ed) — A Complete Narrative of the Mutiny in India from its Commencement to the present time.
London: Reed, 1857.

---

81. George. Mac Mann, Sir — The Indian Mutiny in Perspective
London: G. Bell and Sons Ltd., 1931.

---

82. Germon, Maria — Journal of the Siege of Lucknow
An Episode of the Indian Mutiny
London:1958.

---

83. Ghalib, Mirza Asadullah Khan — Dastanbuy A Diary of the Indian Revolt of 1857.
(Tr.) Khaja Ahmed Farooqui
Delhi: University of Delhi, 1970.

---

84. Gilhat, Edward — During Deeds of the Indian Mutiny
London: Sceley Secru and Co. Ltd., 1928.

---

85. Gimlette, G.H.D. — Post script of the Records of the Indian Mutiny
London: 1913 .

---

86. Gopal, S. — British Policy in India. 1858-1905
Cambridge: Cambridge University Press, 1965.

---

87. Greathed, H.H. — Letters written during the Seige of Delhi

London: Longmans Brown, 1910.

---

88. Greffiths, Charles John — The Siege of Delhi
London: 1910.

---

89. Gubbins, Martin Richard — An Account of the Mutinies in Oudh and the Siege of the Lucknow Residency
London: Richard Bentley, 1858.

---

90. Gubbins, Martin Richard — Mutinies of Oudh
London: Richard Bentley, 1859

---

91. Gupta, Maya — Lord William Bentinck and the Vellore Mutiny
New Delhi: Capital, 1986.

---

92. Gupta, Narayani — Delhi Between two Empires 1803-1931:
Delhi: Oxford University Press, 1981.

---

93. Gupta, Pratul Chandra — Nana Sahib and the Rising at Cawnpore
Oxford: Clarendon, 1963.

---

94. Haldane, Julia — The Story of our Escape from Delhi in 1857
Agra: Brown, 1888.

---

95. Halls, John James — Two Months in Arrah in 1857
London: Longman, 1860.

---

96. Hardy, Peter — The Muslims of British India
Cambridge: Cambridge University Press, 1972.

---

97. Hardikar, Srinivas Balaji — 1857 ki Chingariyan.
Kanpur Sahitya Niketan, 1957.

---

98. Hardikar, Srinivas Balaji — Rani Lakshmibai
Delhi: National, 1968.

99. Harris, Katherine G. — A Lady's Diary of The Siege of Lucknow Written for the Perusal of Friends at home
London: John Murray, 1858.

100. Harrison, A.T. (ed) — The Graham Indian Mutiny Papers
Belfast: Republic Records office, 1980.

101. Havelock, — Havelock's March on Cawnpore A Civilian Notes.
London: 1910.

102. Henry, Mead — The Sepoy Revolt
London: John, Murray. 1857.

103. Hervey, Captain Albert. — A Soldier of the company.
Life of an Indian Ensign 1833-1843
London: 1988.

104. Hewitt, James (ed) — Eye witnesses to the Indian Mutiny
Reading n.p. 1972.

105. Hibbert, Christopher — The great Mutiny of India 1857
London: Allen Lane, 1978, 1980

106. Hill, Se. — Yousuf Khan- The Rebel Commandent
London: Longman's Green, 1914.

107. Hodson, Major W.S.R. — Twelve years of a Soldier's Life in India
London: 1859.

108. Holmes, T.R.E. — History of the Indian Mutiny
W.H. Allen & co. Ltd. 13 Waterloo Palvo

London: 1891.

---

109. Holmes, T.R.E. — A History of the Indian Mutiny of the Disturbances which accompanied it among the Civilians Population. London: 1891.

---

110. Hope, Grant, Sir, General — Succeders in Seproy War Edenburgh: William Black, 1873.

---

111. Hughes, Derrick — The Mutiny Chaplains Salisbury, 1991.

---

112. Humbly, W.W.W. — Journal of a Cavalry Officer London: 1854.

---

113. Hunter, William Willson — The Indian Mussalmans: Are They Bound in conscience to Rebel Against The Queen 1871 (3rd Edn.) London: n.p., 1876.

---

114. Hussain, Mahdi — Bahadur Shah and The War of 1857 in Delhi with its Inforgetable scenes. New Delhi: 1958.

---

115. Hutchinson, Major General George — Narrative ob The Mutinies in Oudh London: 1859.

---

116. Imperial Records Department — Press List of Mutiny papers 1857, being a collection of correspondence of the Mutineers at Delhi: Reports of spies to English Officials and other Miscellaneous papers. Calcutta: 1921.

---

117. Inglis, Julia Selina — The Siege of Lucknow London: Òsgood, 1892.

---

118. Innes, Me Lord Lt General — Lucknow and Oudh in the Mutiny Narrative Study London: Innes Co. Bellford street, 1896.

119. Ireland, William Witherspoon — History of the Siege of Delhi By an Officer who served there: with a sketch of the leading events in the Punjaub connected with the great Rebellion of 1857. London: Adam and Charles Black, 1861.

120. Jacob, E.A. — A Memoir of a Professor Yesudas Ramchandra of Delhi Cawnpore: 1902.

121. Jivanlal, Rai Bahadur — Short Account of the life and Family of Rai Jivanlal Bahadur, with extracts from his diary relating to the Mutiny Delhi: I. M. H. Press, 1902.

122. Jones, Oliver John — Recollection of a Winter Campaign in India in 1857-58 Sounders: n.p., 1959.

123. Joshi, Puranchand (ed) — Rebellion 1857: A symposium N. Delhi: 1957 Peoples Publishing House.

124. Joyce, Michael — Ordeal at Lucknow London: John Murray, 1938.

125. Jocelyn, Col. Julian R.J. — The History of the Royal and Indian Artillery in the Mutiny of 1857 London: 1915.

126. Kavanagh, Thomas Henry — How I won the Victoria Cross. London: Wards, 1860.

127. Kaye, John W. — The Administration of the East India Company
London: Richard Bentley, 1853.

---

128. Kaye, John W. — History of the Sepoy in War 1857-58 3vols.
London: W.H. Allen, 1864-76

---

129. Kaye, John W. — Lives of Indian Officers: Illustrative of the Civil and Military Services of India (1867) 2 vols.
London: W.H. Allen, 1889.

---

130. Kaye and Malleson — History of the Indian Mutiny of 1857-58 6 vols.
(ed) G.B. Malleson
London: W.H. Allen, 1889.

---

131. Keene, Henry George — Fifty- Seven
(Some accounts of the Administration of Indian Districts during the Revolt of the Bengal Army
London: W.H. Allen, 1883.

---

132. Khan, Syed Ahmed, Sir — The Essays on the causes of the Indian Revolt
Calcutta: 1860.

---

133. Khan, Syed Ahmed, Sir — History of the Bijnor Rebellion
(Tr.) Hafeez Malik and Morris Dembo, East
Lansing: Idarah-i-Adabiyat, 1982.

---

134. Kolff, D.H.A — Naukar, Rajput and Sepoy
Cambridge: Cambridge University Press, 1990.

---

135. Lowe, Thomas — Central India during the Rebellion of

1857 and 1858.
(A Narrative of the operations of the British Forces from the Suppression of the Mutiny in Aurangabad to the Capture of Gwalior)
London: Longman, 1860.

---

136. Lewin, Malcom (ed) — Causes of the Indian Revolt, by a Hindu of Bengal
London: Edward Stanford, 1857.

---

137. Llewellyn-Jone,s Rosie — A Fatal Friendship: The Nawabs the British and the City of Lucknow
New Delhi: Oxford University Press, 1985.

---

138. Lord Roberts of Kandahar — Forty one years in India
London: 1897 n.p.

---

139. Lord Roberts of Kandahar — Letters written during the Indian of Mutiny
London: 1924 n.p.

---

140. Lowe, Thomas — Central India: During the Rebellion of 1857
London: n.p., 1860 .

---

141. Lucas, Samuel — Dacoitee in Excelsis or, The Spoilation of Oude by the East India Company (1857)
Lucknow: Pustak Kendra, 1971.

---

142. Ladam, H.L — The Indian Criminal
(Contains fascinating chapter on Maulvi Leaquat Ali of Allahabad. The captain calls him Maulvi Allauddin but that

was evidently an honorific title)
London: 1909 n.p.

---

143. Lang, John — Wanderings in India and other Sketches of life in the Hindostan
London: Routledge, 1859 .

---

144. Lawrance, H. — Essay on the Indian Army and Oudh
London: 1859.

---

145. Lawson, Phillip — The East India Company
(A History)
London: Longman, 1993.

---

146. Lea Joseph — The Indian Mutiny
(Narrative of events of Cawnpore June\July 1857)
Cawnpore: Victoria Press, 1893.

---

147. Leckey, Edward — Fictions connected with the Indian outbreak of 1857 Exposed
Bombay: Chesson of Woodhall, 1859.

---

148. Leeman, Major General Sir William — Rambles and Recollections of an Indian Officer
London: n/p., 1843.

---

149. Ludlow, John Malcolm — The War in Oude.
Cambridge: Macmillan, 1858.

---

150. Ludlow, John Malcolm — British India.
Its races and its History Considered with Reference to the Mutiny 1857 (2vols)
Cambridge: Macmillan, 1858.

---

151. Mackenzie, A.R. D. Col — Mutiny Memoirs
Allahabad: Pioneer Press, 1891.

---

152. Mackenzie J. (ed) — Popular Imperialism and the Military 1850-1950
Manchester: Manchester University Press, 1992.

153. Maclagan, Michael — 'Clemency' Canning: Charles John, 1st Earl canning, Governor General and Viceroy of India 1856-1862
London: Macmillan, 1962.

154. Majumdar, R.C. — The Sepoy Mutiny
Calcutta: 1957.

155. Majumdar, R.C. — The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857
Calcutta: K.L. Muhkopadhyay, 1963.

156. Malleson, G.B. Col. — History of the Indian Mutiny 1857-58
6 vols.
London: Green, 1953.

157. Malleson, G.B. Col. — The Decisive Battles of India from 1746-1849
London.

158. Malcolm, Henry Frederick — History of the War in India
Philadelphia: Potter, 1859.

159. Mariam J.F.F — Story of Indian Mutiny of 1857
Banaras: Chandraprabha Press 1896

160. Martin, Robert Montgomery — The Indian Empire with a Full Account of the Mutiny of the Bengal Army (3vols).
London: London Printing Press and Publishing Company, 1858-61.

161. Mehta, Uday Singh — Liberalism and Empire.
A study in Nineteenth century British Liberal Thoughts
Chicago: University of Chicago Press, 1999.

---

162. Metcalfe, Charles T. — Two Native Narratives of the Mutiny in Delhi (1898)
(Tr.) Charles T. Metcalfe
Delhi: Seema, 1974.

---

163. Metcalfe, Henry — The Chronicale of Private Henry Metcalfe
HM 32nd Regiment of Foot Lef.
General Sir Francis Tuker (ed)
London: 1953.

---

164. Metcalfe, Thomas R. — The Aftermath of the Revolt 1857-1870
Princeton: Princeton University Press, 1965.

---

165. Miles, Alfred H.
Arthur John Pattle — Fifty two stories of the Indian Mutiny
London: Hutchinson and Co., 1895.

---

166. Mookherjee,
Sambhu Chandra — The Mutinies and the People, or Statements of Native Fidelity Exhibited during the cutbreak of 1857-58
Calcutta: Sanskrit Pustak Bhandar, 1968

---

167. Moon, Penderel — The British Conquest and Domain of India
London: n.p., 1989.

---

168. Morris, Henry — Heroes of our Indian Empire (2 vols).
London: Christian Literature Society for India, 1908.

---

169. Mukherjee, Rudrangshu — Awadh in Revolt. 1857-58 A

Study of Popular Resistance.
Delhi. Oxford University Press, 1984.

---

170. Mukherjee, Rudrangshu — Spector of Violence: The 1857 Kanpur Massacre
New Delhi: Viking, 1998.

---

171. Muir, Sir William — Records of the Intelligence Dept. of the North-West Provinces of India during the Mutiny of 1857. Including Correspondence with the Supreme Govt.. Delhi, Cawnpore and other places, (2 vols). (ed) William Coldstream
Edinburg: Clark, 1902.

---

172. Muter, Mrs. — My Recollections of the Sepoy Revolt
London: John Long Ltd., 1911.

---

173. Mutiny Records — Report in Two parts (2 vols).
Lahore: Punjab Govt. Press, 1911.

---

174. Narrative of Events — Narrative of Events Attending the out break of Disturbances and the Restorations of Authority in all the Districts of the North-West Provinces in 1857-58
Calcutta: n.p., n.d. .

---

175. North, Major — Journal of an English Officer in India
London: Hurst, 1858.

---

176. Norton, Captain L.E. — Cavalry: Its History and tactics
London: 1853.

---

177. Norton, John Bruce — The Rebellion in India. How to prevent another
London: Richardson, 1857.

---

178. O, Callaghan, Daniel — Scattered Chapters of the Indian Mutiny London: 1897.

---

179. Orme, Robert — A History of Military Transaction of the British Nation in Hindustan London: 1861.

---

180. Paget, Mrs. Leopold — Camp and Contomment. A Journal of life in India in 1857-59 London: Longman: 1865.

---

181. Palmer, J.A.B. — Proceedings on the Trial of Muhammad Bahadur Shah, Titular King of Delhi, before a Military Commission, upon a charge of Rebellion, Treason and murder... 1858 etc. Calcutta: n.p., 1895.

---

182. Palmer, J.A.B. — The Mutiny outbreak at Meerut in 1857 Cambridge. Cambridge University Press, 1960.

---

183. Panday, Sitaram — From Sepoy to Subedar Trans: Lt. col. J.T. Norgate London: 1873.

---

184. Peile, Fanny — History of the Delhi Massacre, its supposed origin, and the means being adopted to avenge the murder of the British Subjects ... By a lady-the wife of an Officer in the Bengal Army, and a sufferer in the late Tragedy Liverpool: Tiniling, 1858.

---

185. Pemble, J. — The Indian Mutiny and Kingdom of Oudh 1810-1859 New Jersy: Harvester, 1977.

---

186. Powell, Avril. Ann — Muslims and Missionaries in Pre-Mutiny of India London 1993

---

187. Pritchard, Iltudus Thomas — The Mutinys in the Raj Pootana being a personal narrative of the Mutiny at Nusseerabad
London: J.W. Parker, 1860.

---

188. Quraishi, Salimal din — Cry for Freedom: Proclamation of Muslim Revolutionaries of 1857
Lahore: 1997.

---

189. Raikes, Charles — Notes on the Revolt of the North Western Provinces of India
London: Longman, 1858.

---

190. Rees, Ruutz. L.E. — Personal narrative of the Siege of Lucknow
London: Longman's Brown and Green, 1858.

---

191. Retired Officer — Mutiny in the Bengal Army
London: 1857.

---

192. Rice, Holmes T. — History of the Indian Mutiny
London: 1898.

---

193. Rizvi, S.A.A. and Bharava M.L (ed) — Freedom Struggle in Uttar Pradesh. (6 vols).
Lucknow: Publication Bureau, 1957-61.

---

194. Roberts, Field Marshal Lord — Forty one years in India from Subaltern to Commander in Chief
London: 1898.

---

195. Roberts, P.E — History of British India under the Company and the Crown:
Oxford. 1939.

---

196. Robertson, Henry Dunndas — District duties during the Revolt in the North-West Provinces of India in 1857 London: Smith, Elder, 1859.

197. Robinson, Jane, Angels of Albion — Women of Indian Mutiny London: 1996.

198. Rolton, J.W.W — Chaplain's Narrative of the Siege of Delhi: from the outbreak at Meerut to the Capture of Delhi London: Smith, Elder, 1858.

199. Roy, Tapati — 'Visions of the Rebels': A study of 1857 in Bundelkhand Modern Asian studies, 27- (1993), 205-28.

200. Russell, W.H. — My diary in India 1858-59 (2 vols). London: 1860.

201. Russell, William H. — My Indian Mutiny Diary (1860-61) Michael Edwardes (ed) London: Cassell, 1957.

202. Savarkar, Vinayak Damodar — The Indian War of Independence in 1857 (1909) Bombay: Phoenix, 1957.

203. Shephered J.W. — Outbreak of massacre at Cawnpore Lucknow: Methodist Publishing House, 1886

204. Shephered, William J. — A Personal Narrative of the outbreak and massacre at Cawnpore during the Sepoy Revolt of 1857 Lucknow: Methodist Publishing House, 1886.

205. Sherer, J.W. Daily Life during the Indian Mutiny Personal experiences of 1857 London: 1898.

---

206. Sherring, A.M. Indian Church during the Greal Rebellion. London: James Nislet and Co., 1859.

---

207. Scholberg, Henry The Indian Literature of the Great Rebellion New Delhi: Promilla, 1993.

---

208. Sedghick, F.R. Capt. Indian Mutiny of 1857 London: Forester Groom and Co., 1920.

---

209. Semour, Charles Crossley How I won the Indian Mutiny Medal Banaras: Medical Hall Press, 1888.

---

210. Sen, Snigdha The Historiography of the Indian Revolt of 1857 Calcutta: Punthi Pustak, 1992.

---

211. Sen, S.N. A New Account of the Siege of Delhi. n.p., n.d, 1957.

---

212. Sen, Surendra Nath Eighteen fifty-seven Delhi: Govt. of India, 1958.

---

213. Seton, Rosemary The Indian Mutiny 1857-58 A Guide to Source Material in the India Office Library and Records. London: British Library, 1982.

---

214. Sieve King, Gilierine Turning Point in the Indian Mutiny. London: Davidnath, 1910.

---

215. Sinha, S.N The Revolt of 1857 in Bundelkhand Lucknow: Anuj, 1982.

---

216. Sitaram, Subahdar — From Sepoy to Subedar: Being the life and Adventures of a Native Officer of the Bengal Army
James Thomas Norgate (Tr).
Calcutta: Baptist Mission Press, 1911.

217. Skene .W.F. — Memorials of the Family of Skene.
Aberdeen: 1887.

218. Sleeman, W.H. — A Journey through the Kingdom of Oude 2 vols.(vol. 1, 1849 vol. 2, 1850).
London: Richard Bentley, 1858.

219. Smyth, Sir John — The Rebellious Rani.
London: 1966.

220. Spear, Pereival — The Oxford History of Modern India 1740-1947
Oxford: 1965.

221. Spear, Percival — A History of Delhi under the Later Mughals
New Delhi: D.K. Publishers, 1995.

222. Staff Officer — The Defence of Lucknow
London: Smith Elder and Co., 1858.

223. Stanley, Peter — White Mutiny: British Military Culture in India 1825-1875
London: 1998.

224. Stokes, Eric — The Peasant and the Raj: Studies in Agrarian Society and Peasant Rebellion in Colonial India
Cambridge: Cambridge University Press, 1978.

225. Stokes, Eric — The Peasant Armed

C.A Boyly (ed).
Oxford: Clarendon, 1986.

---

226. Tahmanker, D.V. — The Ranee of Jhansi
London: 1958.

---

227. Taylor, P.J.O — A Companion to the Indian Mutiny.
New Delhi: Oxford University Press, 1996.

---

228. Taylor, P.J.O — What really happened during the Mutiny 1857-59
Oxford: India Paperback

---

229. Thackery, Col. Sir Edward — Reminiacences of the Indian Mutiny and Afghanistan
London: Smith Elder Co. Waterloo Palace, 1916.

---

230. Thomson, Captain Howbray — The Story of Cawnpore
London: Richard Bentley,1859.

---

231. Thompson, Edward J. — The other side of the Medal
London: Hogarth Press, 1925.

---

232. Thompson, Edward J. — The Life of Charles Lord Metcalfe
London: 1937.

---

233. Thomas, William — Narrative of the Indian Mutinies of 1857
Madras: Asylum, 1858.

---

234. Thornhill, Mark — The Personal Adventures and Experiences of a Magistrate during the Rise, Progress and Suppression of the Indian Mutiny.
London: 1884.

---

235. Thoughts of A Native — Thoughts of a Native of Northern India on the Rebellion. its causes and Remedies
London: Dalton, 1858.

236. Tidrick, Katherine — Empire and the English Character
London: Tauris, 1990.

237. Trevelyan, George Otto — Cawnpore
London: Macmillan, 1865.

238. Trotter, Lionel James — The Life of John Nicholson: Soldier and Administrator
London: John Murray, 1897.

239. Tucker, Francis (ed.) — The Memoirs of Private Henry Metcalfe
London: Cassell, 1953.

240. Turnbull, Lt. Col. John — Letters written during the Siege of Delhi.
London: 1886.

241. Tytler, Harriet — An English Man in India
The Memoirs of Harriet Tytler 1828-1858 Anthony Sattin (ed).
Oxford: 1986 .

242. Vibart, Edward, Col. — The Sepoy Mutiny as seen by a Subaltern from Delhi to Lucknow
London: 1858.

243. Vibart, Edward, Col. — The Sepoy Mutiny.
London: 1898.

244. Vivian, Joseph — A History of the East India Company (1615-1858)
Tallis Press.

245. Wagentrilber, Florence — The Story of our Escape from Delhi in May 1857.
Delhi: 1894.

---

246. Ward, Andrew — Our Bones are scattered: The Cawnpore Massacres and the Indian Mutiny of 1857
London: 1996.

---

247. White, S. Dewe, Col. — Indian Reminiscences.
London: 1880.

---

248. Wilberforce, Reginald G. — An Unrecorded Chapter of the Indian Mutiny.
London: John Murray, 1894.

---

249. Wilkinson, John and Osbasn — The Memoirs of the Gemini Generals
London: 1896.

---

250. Wilson, T.F., Major — The Defence of Lucknow
London: 1858.

---

251. Wise, James — The Diary of a Medical Officer during the Great Indian Mutiny of 1857.
Cork: 1894.

---

252. Yalland, Zoe — Boxwallahs: The British in Cawnpore 1857-1901
Wilby: M. Russell, 1994.

---

253. Young, Mrs. Keith and Sir Henry Norman — Delhi 1857.
London: 1902.

---

254. Zahir Dehlavi — Dastan-e- Ghadr ya Taraze Zaheeri
Lahore: 1955.

NOVELS, ETC.

1. [Anon.]. *In the Company's Service: a Reminiscence*. London: W.H. Allen. 1883.
2. [Anon.]. *Scenes from the Late Indian Mutinies by* 'D.M'. London: n.p.. 1858.
3. Brereton. F.S. *A Hero of Lucknow: A Tale of the Indian Mutiny*. London: Blackie. 1905.
4. Chesney. Sir George. *The Dilemma*. 3 vols. London: Blackwood. 1876.
5. Dickens. Charles and Wilkie Collins. *'The Perils of Certain English Prisoners'* (1857). *Christmas Stories*. Ruth Glancy (ed.). London: Dent. 1996. pp. 171-256.
6. Doyle. Arthur Conan. *The Sign of Four* (1890). Harmondsworth: Penguin. 1982.
7. Dutt. Shoshee Chunder. *Shunker*. In The Works of S.C. Dutt. vol. III. London: Lovell. Reeve. 1885. 1-101.
8. Fanthome. J.F. *Mariam*. Benares: Chandraprabha Press. 1896.
9. Farrell. J.G. *The Siege of Krishnapur, a Novel* (1973). Harmondsworth: Penguin. 1975.
10. Fenn. George Manville. *Begumbagh: A Tale of the Indian Mutiny and Other Stories*. London: Chambers. n.d.
11. *For the Old Flag: A Tale of the Mutiny*. London: Sampson. Low. 1899.
12. Forrest. R.E. *Eight Days*. 3 vols. London: Smith. Elder. 1891.
13. Gibbon. Frederik P. *The Disputed VC: A Story of the Indian Mutiny*. London: Blackie. 1909.
14. Grant. James. *Fairer than a Fairy: a Novel*. 3 vols. London: n.p.. 1874.
14. Gray. Maxwell [Mary Gleed Tuttiett]. In the Heart of the Storm: *A Tale of Modern Chivalry*. 3 vol. London: Kegan Paul. 1891.
15. Greenhow. H.M. *Brenda's Experiment*. London: Jarrold. 1896.
16. Harcourt. A.F.P. *Jenetha's Venture: A Tale of the Siege of Delhi*. London: Cassell. 1899.
17. Hayman. John. *The Sword of Azrael: a Chronicle of the Great Mutiny*. London: Methuen. 1903.
18. Irwin. H.C. *A Man of Honour* London: Charles Black. 1896.
19. Kaye. M.M. *Shadow of the Moon*. London: Longman. 1957.
20. Kingsley. Henry. *Stretton A Novel*. 3 vols. London: Tinsley. 1869.
21. Lynn. E. *A Hero of the Mutiny*. London: Chambers. c. 1914.
22. Malet. H.P. *Lost Links in the Indian Mutiny*. London: Newby. 1867.
23. Masters. John. *Nightrunners of Bengal*. London: M. Joseph. 1955.
24. Merriman. H.S. *FFlotsam. The Study of a Life*. London: Longmans. 1896.

25. Minchin. James Innes. *Ex Oriente: Sonnets on the Indian Rebellion.* London: n.p., 1858.
26. Money. Edward. *The Wife and the Ward: or, a Life's Error.* London: Routledge. 1859.
27. Muddock. J.E.P. *The Great White Hand: or, the Tiger of Cawnpore.* London: Hutchinson. 1896.
28. Mundy. Talbon. [Sylvia Anne Matheson]. *Rung Ho! A Novel of India.* London: Cassell. 1914.
29. Nisbet. Hume. *The Queen's Desire: a Romance of the Indian Mutiny.* London: F.W. White. 1893.
30. Partington. Norman. *Ana Red Flows the Ganges.* London: Collins. 1972.
31. Pearce. C.E. *Love Besieged: a Romance of the Residency of Lucknow.* London: Stanley Paul. 1909.
32. Phipps. Katherine C.M. *Douglas Achdale: a Tale of Lucknow.* London: Literary Society. 1885.
33. Raines. G.P. *Terrible Times: a Tale of the Indian Mutinty.* London: Routledge. 1899.
34. Stables. Gordon. *On to the Rescue: a Tale of the Indian Mutiny.* London: Shaw. 1895.
35. Steel. Flora Annie. *On the Face of the Waters.* London: Heinemann. 1896.
36. Sterndale. Robert A. *The Afghan Knife.* 3 vols. London: Sampson. Low. 1879.
37. Stuart. Alex [Violet Vivian Mann]. *The Star of Oudh.* London: Mills and Boon. 1960.
38. Taylor. Lucy. *Sahib and Sepoy: or. Saving an Empire.* London: Shaw. 1897.
39. Thomas. D.H. *The Touchstone of Peril: a Tale of the Indian Mutiny.* 2 vols. London: Fisher Unwin. 1887.
40. Tracy. Louis. *The Red Year: a Story of the Indian Mutiny.* London: F.W. White. 1907.
41. Verne. Jules. *The Steam-House: or the End of the Nana Sahib.* Tr. A.D. Kingston. London: Sampson. Low. c. 1881.
42. Wentworth. P. *The Devil's Wind.* London: Andrew Melrose. 1912.
43. White. Michael. *Lachmi Bai. Rani of Jhansi. The Jeanne d'Are of India.* New York: Taylor. 1901.
44. Williamson. John Vaughan. *Fallen Heroes of the Indian War: A Poem. In Memory of Havelock and other Britons Gloriously Fallen in Defence of England's Supremacy in Asia during the Sepoy Rebellion of 1857-8.* London: Lindsey. 1858.

सन् 1857 पर हिन्दी में उपलब्ध अध्ययन सामग्री

पुस्तकें

1. प. सुन्दरलाल, **भारत में अंग्रेजी राज**, प्रकाशन विभाग, भारत सरकार, नई दिल्ली, 2001
2. सुरेन्द्रनाथ सेन, **अठारह सौ सत्तावन**, प्रकाशन विभाग, दिल्ली
3. रामविलास शर्मा, **1857 का स्वाधीनता संग्राम और मार्क्सवाद**, लोकभारती, इलाहाबाद
4. ईश्वरी प्रसाद शर्मा, **सिपाही विद्रोह**, राष्ट्रीय ग्रंथ रत्नाकर, कोलकाता
5. दूधनाथ सिंह, **1857 की गाली**, लखनऊ
6. वीर भारत तलवार, **राष्ट्रीय नवजागरण और साहित्यः कुछ प्रसंग कुछ प्रवृत्तियां**, हिमाचल पुस्तक भंडार, दिल्ली, 1993
7. शिरोमणि महेश, **1857 का बाल साहित्य**, राजकमल प्रकाशन, नई दिल्ली
8. अखिलेश मिश्रा, **1857 का मुक्ति संग्राम**, हिन्दी बुक सेंटर, नई दिल्ली
9. राही मासूम रज़ा, **क्रांति कथा : 1857**, वाणी प्रकाशन, नई दिल्ली
10. मुरली मनोहर प्रसाद सिंह, वंदना चौहान, **1857: इतिहास, कला, साहित्य**, राजकमल प्रकाशन, नई दिल्ली, 2007
11. अमृतलाल नागर, **गदर के फूल**, राजपाल प्रकाशन, नई दिल्ली
12. अमृतलाल नागर, **आंखों देखा गदर**, राजपाल प्रकाशन, नई दिल्ली
13. अजय कुमार गुप्ता, हरेंद्र प्रताप, **गदर के 150 साल**, पेंगुइन बुक्स इंडिया, पंचशील पार्क, नई दिल्ली, 2007
14. मधुकर उपाध्याय, **विष्णु भट्ट की आत्मकथा – 1857**, वाणी प्रकाशन, नई दिल्ली, 2007
15. देव नारायण द्विवेदी, **देश की बात**, आदर्श हिन्दी पुस्तकालय, चित्तरंजन ऐवेन्यु, कलकत्ता, 1929
16. अयोध्या सिंह, **भारत का मुक्ति संग्राम**, प्रकाशन संस्थान, दिल्ली, 2001
17. माहेश्वर प्रसाद, (सं.) **तिरंगा (कविता)**, रचयिता प्रकाशन, शाहाबाद, 1950
18. रामलखन शुक्ल (सं.), **आधुनिक भारत का इतिहास**, हि.मा.का.नि., दिल्ली विश्वविद्यालय, दिल्ली, 1992
19. रुस्तम राय (सं.) , **प्रतिबंधित हिन्दी साहित्य**, राधकृष्ण, नई दिल्ली, 1999
20. हेमंत शर्मा (सं.) , **भारतेंदु ग्रंथावली**, नागरी प्रचारिणी सभा, काशी
21. विपिन चन्द्र, **भारत का स्वतंत्रता संघर्ष**, हि.मा.का.नि., दिल्ली विश्वविद्यालय,

दिल्ली,1999

22. डा. पदमाकर पाण्डेय, **हिन्दी पत्रकारिता और राष्ट्रीय आंदोलन**, नागरी प्रचारिणी सभा, काशी
23. नंद किशोर नवल, **स्वतंत्रता पुकारती (हिन्दी की राष्ट्रीय कविताएँ)**, साहित्य अकादमी, रवीन्द्र भवन, नई दिल्ली
24. बद्रीनारायण, **लोक संस्कृति में राष्ट्रवाद**, राधाकृष्ण प्रकाशन, दरियागंज, नई दिल्ली, 1996
25. भगवान दास माहौर (डा.), **1857 के स्वाधीनता संग्राम का हिन्दी साहित्य पर प्रभाव**, कृष्ण ब्रदर्स, अजमेर, 1976
26. डा. विश्वामित्र उपाध्याय, **सन् सत्तावन के भूले बिसरे शहीद** (भाग–1, 2), प्रकाशन विभाग, भारत सरकार, 1990
27. डा. विश्वामित्रा उपाध्याय, **लोकगीतों में क्रांतिकारी चेतना**, प्रकाशन विभाग, भारत सरकार, 1997
28. देवेन्द्र चौबे, बद्रीनारायण, हितेन्द्र पटेल, (सं.), **1857 : भारत का पहला मुक्ति संघर्ष**, प्रकाशन संस्थान, नई दिल्ली, 2007
29. रश्मि चौधरी, **वीर कुँवर सिंह**, प्रकाशन विभाग, भारत सरकार, 2007
30. काली किंकर दत्त, **बिहार में स्वातंत्रय आंदोलन का इतिहास**, बिहार ग्रंथ अकादमी, 1994
31. काली किंकर दत्त, **बिहार में अंग्रेजी राज्य के विरुद्ध अशांति**, राज्य केन्द्रीय अभिलेख कार्यालय, राजनीति विभाग, बिहार, 1975
32. शिवकुमार मिश्र, **आज़ादी की अग्नि शिखाएं**, इफ्रको, नेहरू पलेस, दिल्ली, 1998
33. शशि भूषण (प्रस्तुति), **आज़ादी के क्रांति गीत**, समाजवादी शिक्षा संस्थान, नई दिल्ली, 1994, 95
34. के. पी. सिंह देव (संकलन), **देशभक्ति के गीत**, राष्ट्रीय अभिलेखागार, नई दिल्ली, 1985
35. रामजनम शर्मा, **जब्तशुदा गीत**, प्रकाशन विभाग, भारत सरकार, नई दिल्ली, 1987
36. बालमुकुन्द अग्रवाल, **आजादी के मुकदमे**, नेशनल बुक ट्रस्ट, नई दिल्ली, 1995
37. ब्रजकुमार पाण्डेय और दीपक कुमार राय, **शाहाबाद का तुर्क, अपफगान काल और उज्जैनिया**, अभिधा प्रकाशन, मुज़फ्फरपुर, बिहार, 2006
38. विश्वामित्र उपाध्याय, **भारत का मुक्ति संग्राम और रूसी क्रांति**, नवयुग पब्लिशर्स, दिल्ली, 1982
39. बिपिन चंद्र, **भारत में उपनिवेशवाद और राष्ट्रवाद**, अनामिका पब्लिशर्स, दिल्ली, 2001
40. ए. आर. देसाई, **भारतीय राष्ट्रवाद की सामाजिक पृष्ठभूमि**, मैकमिलन, दिल्ली, 1991
41. शाहिद अमीन और ज्ञानेन्द्र पाण्डेय (सं.), **निम्नवर्गीय प्रसंग**, (भाग–1 और 2), राजकमल प्रकाशन, दिल्ली, 1995, 2002

42. अर्नेस्ट जोंस, **मुक्त हुआ हिंदोस्तां आख़िर** (कविता), (अनु. व टिप्पणी– राजेन्द्र यादव), हंस, मई 2007

लेख

1. **1857 के घोषणा पत्र और एलान,** सामाजिक क्रांति के दस्तावेज, भाग–1, (सं.) शम्भूनाथ, वाणी प्रकाशन, नई दिल्ली, 2006
2. **बहादुरशाह जफ़र की ओर से एलान,** सामाजिक क्रांति के दस्तावेज़, भाग–1,(सं.) शम्भूनाथ, वाणी प्रकाशन, नई दिल्ली, 2006
3. **मुक्ति संग्राम के नायक कौन ?** रामशरण जोशी, हस्तक्षेप, सामयिक प्रकाशन, दरियागंज, नई दिल्ली
4. **1857 को क्यों याद करें ?** रामशरण जोशी, मीडिया, पत्रिका, मई 2007
5. **1857 और हिन्दी नवजागरण,** पुरुषोतम अग्रवाल, विचार का अनंत, राजकमल प्रकाशन, 2000
6. **एक रासो लक्ष्मी बाई का,** पुरुषोतम अग्रवाल, समकालीन भारतीय साहित्य, संख्या 132, जुलाई –अगस्त, 2007
7. **स्थानीय इतिहास, जन इतिहास या राष्ट्र इतिहास,** (सं.) रामचन्द्र गुहा और शेखर पाठक, पहाड़, नैनीताल, 1989
8. **भारत के राष्ट्रवाद की कहानी : अतीत, वर्तमान और भविष्य,** रणधीर सिंह, 'हंस' नवम्बर 1909
9. **1857 : राष्ट्र विद्रोह की कहानी,** (सं.) हरकिशन सिंह सुरजीत, लोकलहर, 22–28 जनवरी, 2007
10. **कुँवर सिंह और भोजपुरी काव्य,** रश्मि चौधरी, आजकल, अगस्त, 2005
11. **भारत केवल अहिंसा का प्रतिनिधि नहीं है,** (रंजीत गुहा से बद्रीनारायण की बातचीत), परख, अप्रैल सितम्बर, 2003
12. **सन् सत्तावन की राज्य क्रांति,** कर्णेन्दु शिशिर, पहल द्वारा जारी पुस्तिका.
13. **वे लड़े, क्योंकि लड़ाई की ज़रूरत थी,** शशि शेखर, अमर उजाला, 30 अप्रैल 2007
14. **अंग्रेजों के खिलाफ असंतोष बनी चिंगारी,** बेनी प्रसाद बाजपेयी, अमर उजाला, 1 मई 2007
15. **सन् सत्तावन में गद्दारों ने हरवाया इंकलाबियों को,** शम्सुल इस्लाम, अमर उजाला, 2 मई 2007
16. **फ्रांसिसी क्रांति से कम नहीं था यह विप्लव,** विपिन चंद्र, अमर उजाला, 3 मई 2007
17. **अपने ही बुने जाल में फंस गये थे अंग्रेज,** अमरेश मिश्रा, अमर उजाला, 4 मई 2007

18. **सत्तावन के गमर में आगे जवान, पीछे किसान,** शम्भूनाथ शुक्ल, अमर उजाला, 5 मई 2007
19. **अपने हितों के लिए लड़ा गया, धार्मिक संग्राम यह,** बटरोही, अमर उजाला, 7 मई 2007
20. **बगावत के समय कहाँ थे बुद्धिजीवी,** मुशीरुल हसन, (अनुवाद, दुर्गा प्रसाद गुप्त) अमर उजाला, 8 मई 2007
21. **जन की नहीं, यह सामंतों की क्रांति थी,** प्रियंवद, अमर उजाला, 9 मई 2007
22. **आज ज़्यादा ज़रूरी है 1857 की भावना,** उदितराज, अमर उजाला, 10 मई 2007
23. **1857 के डेढ़ सौ साल बाद,** प्रताप जोशी, जनसत्ता, 6 मई 2007
24. **सत्तावन और सावरकर का सच,** शम्सुल इस्लाम, जनसत्ता, 19 मई 2007
25. **बहाना सन् सत्तावन,** कैलाशनाथ तिवारी, जनसत्ता, 25 मई 2007
26. **नई सामाजिक क्रांति का आगाज़,** अरूण कुमार पानीबाबा, जनसत्ता, 30 मई 2007
27. **मैं हिन्दुस्तान की आज़ादी का पहला गवाह हूँ,** पारस अमरोही, हिन्दुस्तान, 7 मई 2007
28. **जब जॉन मेटकाफ ने थानेदार से मांग कर पहने कपड़े,** थानेदार मोईनुद्दीन हसन, हिन्दुस्तान, 7 मई 2007
29. **कारतूसों के पीछे लगी थी विद्रोह की राजनीति,** अमरेश मिश्र, हिन्दुस्तान, 7 मई 2007
30. **सत्तावन, सत्याग्रह और गांधी,** अरूण कुमार त्रिपाठी, हिन्दुस्तान, 8 मई 2007
31. **150 साल पहले, आज ही के दिन,** अमरेश मिश्र, हिन्दुस्तान, 11 मई 2007
32. **बलिदान के पर्व पर न जाति थी, न धर्म,** अमरेश मिश्र, हिन्दुस्तान 11 मई 2007
33. **कोशिश थी मिट जाए यादगार–ए–ज़फर,** डा. अमर फारूकी, हिन्दुस्तान, 21 मई 2007
34. **दिल्ली की लूट का आंखों देखा हाल,** शम्सुल इस्लाम, हिन्दुस्तान 21 मई 2007
35. **उर्दू अखबार की क्रांतिकारी पत्रकारिता,** शिरीन मोसाबी, हिन्दुस्तान, 21 मई 2007
36. **1857 की महाक्रांति और उसका दमन,** मन्मथनाथ गुप्त, राष्ट्रीय आंदोलन का इतिहास, शिवलाल अग्रवाल एंड कम्पनी लिमिटेड, आगरा, प्रथम संस्करण – 1948
37. **भारतीय प्रश्न** – कार्ल मार्क्स भारत का प्रथम स्वतंत्रता संग्राम, विदेशी भाषा प्रकाशन गृह, मास्को,
38. **1857 और प्रेमचंद** /ई. एम. एस. नंबूदिरिपाद/कला साहित्य और संस्कृति, नेशनल बुक सेंटर, प्रथम संस्करण, 1987
39. **1857 और हिन्दी साहित्य,** पी. सी. गुप्ता, रिबेलिअन,(सं. पी. सी. जोशी) पी. पी. एच., प्रथम संस्करण, 1957
31. **सन् 1857: राष्ट्रीय एकजुटता की पहली किताब** – अरूण कुमार, परिकथा, वर्ष-2, अंक –7, मार्च–अप्रैल, 2007

32. **शेर–ए–मालवा राणा बख्तावरसिंह राठौर,** सत्यनारायण पुरोहित, इंडिया न्यूज, 27 जुलाई 2007
33. **भूरागढ़, जर्जर होती विरासत,** अरूण निगम, इंडिया न्यूज, 27 जुलाई 2007
34. **आरा, इतिहास के आइने में,** शहाब तनवीर शब्बू/ अनुप कुमार सिंह, इंडिया न्यूज, 27 जुलाई 2007

1857 पर हिन्दी पत्रिकाओं के विशेषांक

1. **आजकल,** मई 2007, संपादक–योगेन्द्र दत्त शर्मा, प्रकाशन विभाग, दिल्ली
2. **उद्‌भावना,** अप्रैल–जून, 2007, अतिथि संपादक–प्रदीप सक्सेना, गाजियाबाद, उ.प्र.
3. **मीडिया,** अप्रैल–जून, 2007, अतिथि संपादक– रवीन्द्र त्रिपाठी, केन्द्रीय हिंदी संस्थान, दिल्ली
4. **नया पथ,** मई 2007, संपादक– मुरली मनोहरप्रसाद सिंह, चंचल चौहान, विट्ठलभाई पटेल हाउस, दिल्ली
5. **समयान्तर,** फरवरी 2007, संपादक–पंकज बिष्ट, दिल्ली
6. **समकालीन जनमत,** वर्ष 26, अंक 2, प्रधान संपादक–रामजी राय, पटना
7. **तीसरा स्वाधीनता स्वर,** संपादक – श्याम सिंह रावत, वर्ष – 1, अंक – 1, 2007, मनोकामना अपार्टमेंट, दिल्ली
8. **वर्तमान साहित्य,** नवम्बर– दिसम्बर 2006, संपादक – कुँवरपाल सिंह, नमिता सिंह, रामघाट रोड, अलीगढ़
9. **सम्यक दृष्टि,** अंक 4, वर्ष – 7, जुलाई – 2006, संपादक – श्याम बिहारी मिश्र,
10. **अक्षर पर्व,** अंक –1, वर्ष – 12, जून – 2007, संपादक – सर्वमित्रा सुरजन, देशबंधु परिसर, रायपुर, छत्तीसगढ़
11. **इंडिया न्यूज,** 12–18 मई 2007, सुधीर सक्सेना, कैप्टन गौड़ मार्ग, श्रीनिवासपुरी, नई दिल्ली
12. **द संडे इंडियन,** 14 से 20 मई 2007, संपादक– ए. संदीप, सी. 10 कुतुब इंसटीटयूशनल एरिया, नई दिल्ली–60

डा. दुर्गा प्रसाद गुप्त
प्रोफेसर, हिन्दी विभाग
जामिया मिल्लिया इस्लामिया
नई दिल्ली, 25
फोन न. 29535970, मो. 9868255696

ISBN 81-7160-142-1